نظریہ بیگانگی اور اردو ادب: منتخب اردو ناولوں میں مارکسی نظریہ بیگانگی کا مطالعہ

Theory of Alienation and Urdu literature: Study of Marxist Ideology of Alienation in Selected Urdu Novels

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار:

تیمور سلیم

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء

نظریہ بیگانگی اور اردو ادب: منتخب اردو ناولوں میں مارکسی نظریہ بیگانگی کا مطالعہ

مقالہ نگار:

تیمور سلیم

یہ مقالہ

ایم۔فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اُردو زبان وادب)

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: نظریہ بیگانگی اور اردو ادب: منتخب اردو ناولوں میں مارکسی نظریہ بیگانگی کا مطالعہ

پیش کار: تیمور سلیم رجسٹریشن نمبر:27-MPhil/Urdu/F20

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ اردو زبان و ادب

ڈاکٹر محمود الحسن رانا

_____

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی

_____

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

بریگیڈئر سید نادر علی

_____

ڈائیریکٹر جنرل

تاریخ: _____

اقرار نامہ

میں تیمور سلیم حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد سے ایم فل اردو کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن رانا کی زیر نگرانی مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی یونی ورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

تیمور سلیم

مقالہ نگار

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

اگست ۲۰۲۲ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	ii
اقرار نامہ	iii
فہرست ابواب	iv
Abstract	vii
اظہار تشکر	ix
باب اول: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	۱
الف: تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۲
ii۔ بیان مسئلہ	۳
iii۔ مقاصد تحقیق	۳
iv۔ تحقیقی سوالات	۴
v۔ نظری دائرہ کار	۴
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۵
vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۵
viii۔ تحدید	۶
ix۔ پس منظری مطالعہ	۶
x۔ تحقیق کی اہمیت	۷
(ب): نظریہ بیگانگی اور بنیادی مباحث	۸

۱۔ وجودی بیگانگی اور مارکسی بیگانگی ۹
۲۔ مارکسی بیگانگی اور طبقاتی کشمکش ۳۳
۳۔ مارکسی بیگانگی کے پیداواری رشتوں پر اثرات ۴۰
۴۔ مارکسی بیگانگی کے سماجی پہلو ۴۶
۵۔ ادیب اور سماجی بیگانگی ۵۰
۶۔ مارکسزم اور نظریہ ادب ۵۴
۷۔ اردو ناول اور مارکسی بیگانگی ۶۰
حوالہ جات ۷۱

باب دوم: منتخب ناولوں میں محنت کار کی محنت اور محنت کی پیداوار سے بیگانگی کا تجزیاتی مطالعہ ۷۴

فائر ایریا ۷۵
۱۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی ۷۷
۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی ۸۱
جہنمی لوگ ۸۶
۱۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی ۸۷
۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی ۹۱
خس و خاشاک زمانے ۹۷
۱۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی ۱۰۱
۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی ۱۰۵
نیلی بار ۱۰۸
۱۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی ۱۱۰
۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی ۱۱۴
حوالہ جات ۱۲۳

باب سوم: منتخب ناولوں میں افراد کی سماجی اور نوعی زندگی سے بیگانگی کا تجزیاتی مطالعہ

فائر ایریا	۱۲۷
۱۔ افراد کی سماج سے بیگانگی	۱۲۷
۲۔ افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی	۱۳۵
جہنمی لوگ	۱۳۹
۱۔ افراد کی سماج سے بیگانگی	۱۳۹
۲۔ افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی	۱۴۷
خس و خاشاک زمانے	۱۵۱
۱۔ افراد کی سماج سے بیگانگی	۱۵۲
۲۔ افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی	۱۶۱
نیلی بار	۱۶۷
۱۔ افراد کی سماج سے بیگانگی	۱۶۷
۲۔ افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی	۱۷۴
حوالہ جات	۱۸۱
ماحصل	۱۸۴
(الف) مجموعی جائزہ	۱۸۴
(ب) نتائج	۱۹۱
(ج) سفارشات	۱۹۲
کتابیات	۱۹۴

Abstract

Title: The Theory of Alienation and Urdu Literature: A Study of Marxist Theory of Alienation in Selected Urdu Novels.

The theme of my MPhil thesis is to study the notion of Marxist alienation in literature, its elements and impacts as well.

Karl Marx's theory of alienation was first introduced in 1844. In his view, inadequate wages of labor are the sole cause of laborer's alienation, which alienates him in four ways; alienation from labor, yield, society and from human needs. The nature of this is analytical. Alienation is a social problem and has been widely discussed in literature as well. It is an inquiry into the causes and consequences of alienation in Urdu novels. The study also illustrates the forms of alienation in Urdu novel tradition as exists in English novels. This study investigates the various forms of alienation in Urdu novels. It is a genre of literature that portrays the conditions of our society, their constructive factors and their effectiveness. It analyzes the implications of Marxist forms of alienation and how selected authors describe laborer, the product of laborer, and social and cultural alienation. It is a narrative against capitalism, describing education, illness, unemployment, politics, ignorance and selfishness.

Fire Area (1994) depicts the exploitation of coal workers and their social alienation. Describing the unemployment, politics, ignorance and selfishness, this evil is a narrative against the capitalism. Jahanumi Log (2001) is a story of the poor condition of day laborers, social degradation, lack of service and helplessness. Khas o Khashaak Zamane (2010) is a representation of various aspects of alienation and dehumanization under historical, political, social, economic, religious and gender narratives and meta-narratives. Neli Bar (2017) shows the exploitation and

selfishness of society as a result of the nexus of feudalism, capitalism and religiosity in Pakistani society.

This research defines the causes of Marxist alienation, its effects and the myth of helplessness in the novels, which unravels the chaos in society, human values and the degraded lifestyle of humans through Marxist analysis. The decline of humanity due to ignorance, health issues, employment, sex, theft, corruption, murder, civil strife, homelessness, politics, religion, imperialism, capitalism and semi-feudalism has been described by these novelists widely. These novelists have retold the tale of declining humanity in the selected novels. This research is an attempt to open new gateways to future research and discussion. My viewpoint is that researchers and can do MPhil level research work based on the nature and shades of alienation in other Urdu fictional genres.

اظہارِ تشکر

خالق کائنات کی حمد وثنا کہ جس نے اس ارضی و سماوی دنیا میں بطور انسان تخلیق کیا اور شعور سے نوازا۔اللہ کا لاکھ شکر کہ اس نے مجھے اس قابل بنایا کہ میں آج اپنا ایم فل کا مقالہ مکمل کرنے کے قابل ہو سکا۔تحقیق ایک دقیق کام ہے اور پختہ ارادے و ہمت کی ضرورت کا ہونا بھی لازم ٹھہرتا ہے۔تحقیق کا ماحول اور مناسب وسائل کا ہونا تحقیق کے لیے انتہائی ضروری ہے تبھی یہ کسی منزل تک پہنچ سکتی ہے۔

نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز شعبہ اردو کے قابل قدر اساتذہ کا بھی بے حد شکریہ کہ انھوں نے تحقیق کے پیچ و خم سے وقتاً فوقتاً آگاہ کیا۔شعبے کے تمام اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر عابد سیال،ڈاکٹر شفیق انجم، صدر شعبہ ڈاکٹر فوزیہ اسلم اورڈاکٹر صائمہ نذیر،ڈاکٹر نعیم مظہر،ڈاکٹر بشری پروین،ڈاکٹر نازیہ یونس،ڈاکٹر ارشاد بیگم،ڈاکٹر صنوبر کا شکریہ کہ جن کی رہنمائی سے یہ مرحلہ بھی آسان ہوا۔

نگران مقالہ ڈاکٹر محمود الحسن صاحب کی قدم قدم پر رہنمائی اور حوصلہ نہ صرف باعث تکمیل مقالہ ہے بلکہ ان کی ذاتی لائبریری سے استفادہ اور کتب کی فراہمی بھی قابل تحسین ہے۔دوران تحقیق جس لگن اور محنت سے انھوں نے ساتھ دیا اس کے لیے میں تہہ دل سے ان کا شکر گزار ہوں۔

دوستوں میں رضا علی عابدی کا بالخصوص اور دیگر کا بھی شکریہ جنھوں نے مارکسزم سے متعلق قدم قدم پہ رہنمائی کی۔میرے بہن بھائیوں کا بھی خصوصی شکریہ کہ جنھوں مجھے یہاں تک پہنچنے کے قابل بنایا۔والد اور والدہ کا خصوصی شکریہ اور دعائیں کہ آج انھی کی بدولت میں اپنے ایم فل کے مقالے کو مکمل کر پایا۔جنھوں نے مجھے ایک مکمل انسان بننے کے لیے ہر وقت رہنمائی کی۔ ساتھی سکالرز کا بھی شکریہ۔اللہ رب العزت سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔آمین

تیمور سلیم

ایم۔فل(اردو)اسکالر

باب اول:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف: تمہید

انسان نے جب سے اس کائنات میں قدم رکھا اور ہوش سنبھالا تو اسے یہاں آغاز سے ہی مختلف نوعیت کے مسائل کا سامنا رہا۔ دور قدیم کا انسان ہو یا آج کا تہذیب یافتہ گوناگوں مصائب و آلام سے نپٹتا چلا آ رہا ہے۔ ان مصائب میں کچھ کا تعلق فطرت سے ہے اور کچھ انسان کی اپنی کمزوریوں کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ قدیم دور کے انسان نے فطرت سے لڑنا سیکھ کر ایک محاذ سر کر لیا۔ ابتدائی دور میں انسان کو اپنی فطری مادی ضرورت پوری کرنے کے لیے شکار وغیرہ سے گزارا کرنا پڑتا۔ وہ یہ سب کام اکیلے نہیں کر سکتا تھا بل کہ اسے دوسرے انسانوں کی ضرورت تھی۔ اس طرح اس دور کے انسان مل جل کر آپس کی مشکلات کو حل کرتے اور زندہ رہنے کے ہنر سے واقف ہوتے رہے۔ یہ دور طویل عرصے پہ محیط ہے جس میں انسان نے کچھ ہتھیار بنانے بھی سیکھ لئے۔ ارتقائی مرحلے میں اس نے ہتھیار کو قبضے میں رکھ کر پہلی مرتبہ دوسروں پہ اپنی فوقیت ظاہر کی۔ یہاں سے طاقت کے زور پر دوسرے قبیلوں کو غلام بنانے کا رواج شروع ہوا جسے ابتدائی غلام داری سماج سے منسوب کیا جاتا ہے۔

جب انسانی شعور میں مزید ترقی ہوئی اور وہ غاروں سے نکل کر تہذیب کی طرف گامزن ہوا تو پہلی مرتبہ ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔ تقریباً بارہ ہزار سال پہلے انسان نے زرعی انقلاب کی طرف قدم بڑھایا تو وہ انسان جو ہمیشہ سے مل جل کر اپنی ضروریات پوری کرتے تھے اب آپس میں بٹنے لگے جس نے جو زمین کاشت کی اس پر اپنا حق جتایا اور اس طرح ملکیت کا تصور پیدا ہوا۔ ابتدا میں غلام داری سماج کے ان انسانوں سے بھی کام لیا جانے لگا جو پچھلے دور میں غلام تھے۔ پچھلے دور کے آقا زمین دار اور مالک ٹھہرے اور غلام زمین پر کام کرنے والا مزراع یا مزدور۔ جب انسانی شعور میں مزید ترقی ہوئی اور انسان ایک دور سے نکل کر دوسرے دور میں داخل ہوا تو اس کے سامنے نئی مشکلات بھی تھیں۔ وجود کی مشکلات، فطرت کی نیرنگیوں کی مشکلات۔ اس نے

چونکہ ابتدا ہی سے غور و فکر کرنا شروع کر دیا تھا۔لہذا کبھی اپنی ذات پر اور کبھی ارد گرد فطرت سے نمٹنے کے طریقوں پر غور کرتا رہااور زندگی کو آگے بڑھاتا رہا۔ تاہم اس دور کا انسان کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ پایا۔

مختلف ادوار میں لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیغمبر و رہنما آتے رہے جو کائنات اور اس میں موجود مختلف عناصر کی توجیہات بیان کرتے رہے۔ یہ سلسلہ ایک طویل عرصے تک چلتا رہا۔ پھر انبیاء کے ساتھ ساتھ فلسفی اور صالحین نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ انسانی معاشرہ تہذیب یافتہ ہونے کی طرف جست لگا چکا تھا اور انسانی شعور میں اعلیٰ و ادنیٰ اور آقا و غلام کے تصورات پیدا ہو چکے تھے، انسانوں میں تفریق کی بنیادیں بھی پڑ رہی تھیں جس سے مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ ہر دور میں انبیاء نے ان مسائل اور تفریق کو ختم کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کیا اور یوں انسانیت آگے بڑھتی رہی۔ تمام مذہبی و تاریخی حوالے معاشرے میں پیدا ہونے والے مسائل کو تفریق سے جوڑتے رہے اور ان کا حل تلاش کرتے رہے۔ آخری نبی زماں و مکاں نے بھی تفریق کے اسی تصور کو سماج کی بگاڑ کی وجہ بتایا جسے بعد میں آنے والے فلسفیوں اور رہنماوں نے اپنے فکر کی بنیاد بنایا۔ آج کے سماج کا ایک مسلہ بیگانگی بھی ہے۔ کارل مارکس جو انیسویں صدی کا فلسفی ہے سماج میں بیگانگی کو معاشی بنیادوں سے جوڑتا ہے۔ جس کے نظریے کو بنیاد بنا کر منتخب ناولوں کا مطالعہ کیا جائے گا۔

ا۔ موضوع کا تعارف:

سماج میں طبقاتی کشمکش ہمیشہ سے انسانی زندگی کا موضوع رہی ہے۔ ہر دور کے لحاظ سے اس کی مختلف توجیہات پیش کی جاتی رہی ہیں۔ صنعتی دور میں سرمایہ دارانہ نظام نے طبقاتیت کو مزید فروغ دیا جس کے مدمقابل انیسویں صدی میں مارکس نے نیا معاشی تصور پیش کیا جسے سوشلزم یا مارکسزم کہا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تصور پہلے بھی موجود تھا لیکن جن سائنسی اصولوں پر مارکس نے اسے بنیادیں فراہم کیں ان اصولوں پر مارکسزم سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے مدمقابل ایک جاندار نظام کے طور پہ وجود میں آیا۔ معاشرے کی تحریکات و نظریات ہر لحاظ سے ادب کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ مارکس کے سماجی و معاشی نظریے سے دنیائے ادب بھی متاثر ہوئی۔ اردو ادب میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں اس فکر نے پروان چڑھنا شروع کیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو ادب میں جن نظریات کو مقبولیت حاصل ہوئی ان میں سے ایک مارکسزم بھی ہے۔

مارکسزم ایک ایسی فکر ہے جو ہمیں انسان اور انسانی سماج کی تاریخ، واقعات اور حالات سے آگاہی اور سماج کو بہتر بنانے کے اصولوں سے واقفیت مہیا کرتی ہے۔ مارکسزم اصل میں انسانی سماج کے ارتقا کا علم ہے اور مارکسی سائنسی

اصول سماج کو اہمیت دیتے ہیں۔مارکس نے سماج میں طبقاتی تقسیم کی وجوہات کو سائنسی بنیادوں پر پیش کر کے تاریخ اور مستقبل کے حوالے سے نہایت جامع توضیحات پیش کی ہیں۔مارکس کی یہی فکر اردو ادب میں ترقی پسند فکر کے زیر اثر پروان چڑھی۔

ناول اردو ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں ادیبوں نے زندگی کے تقریباہر ہر پہلو کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی ہے۔ موضوعات کی ہمہ جہتی نے ناول کو ایک مقبول ترین صنف ادب بنا دیا ہے۔دور حاضر میں جب سرمایہ دارانہ نظام پوری آب و تاب کے ساتھ سماج کو طبقات میں دھکیل چکا ہے،معاشرے کا ہر فرد اس سے متاثر ہے وہیں تخلیق کار بھی اس سماجی کشمکش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔یہی وجہ ہے کہ سماج کا بڑا واضح عکس ہمیں ادب میں بھی دکھائی دیتا ہے۔حساس طبیعت کے ناول نگاروں نے شدت سے اس مسئلے کو محسوس کیا اور اپنے ہاں ناولوں میں جگہ دی۔ مجوزہ موضوع مارکسی نظریۂ بیگانگی اور جدید اردو ناول کی مارکسی تعبیر کے حوالے سے ہے۔مارکس کے خیال میں معاشرے کے افراد محنت کا برابر صلہ نہ ملنے کی وجہ سے اپنی ذات اور معاشرے سے بیگانے ہو جاتے ہیں اس کو وہ "Alienation" کا نام دیتا ہے۔ مجوزہ موضوع میں مارکس کے نظریۂ بیگانگی کو بنیاد بنا کر اس مارکسی فکر کے حوالے سے منظر عام پر آنے والے منتخب ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا اور یہ دیکھا جائے گا کہ لکھنے والوں نے اپنے ہاں اس فکر کو کس انداز میں برتا ہے۔

۲۔بیانِ مسئلہ:

مقصد حیات سے واقفیت حاصل کرنا بنی نوع انسان کا ہمیشہ سے شیوہ رہی ہے جس کا نتیجہ مختلف فلسفیانہ نظریات کی صورت میں نظر آتا ہے انہی نظریات میں سے ایک مارکسی بیگانگی بھی ہے جس کا اظہار ہمیں اردو ناولوں میں نظر آتا ہے۔مارکسی نظریہ بیگانگی کی بنیاد طبقاتی سماج ہے،لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ منتخب کردہ ناولوں میں طبقاتیت کی وجہ سے پیدا ہونے والے بیگانگی کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل کی جائے۔انتخاب کیے گئے ناولوں میں بیگانگی کی پیشکش اور نوعیت،کارفرما عناصر اور سماجی اثرات کو واضح کیا جائے۔اردو ناولوں میں مارکسی بیگانگی کے حوالے سے ابھی تک کوئی سندی تحقیقی کام نہیں ہوا۔اس لحاظ سے میرے پیش نظر یہ ہے کہ مارکسی نظریہ بیگانگی کو بنیاد بنا کر منتخب ناولوں کو پرکھا جائے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد و ممتاز ہو گا۔

۳۔مقاصد تحقیق:

مجوزہ موضوع میں مندرجہ ذیل مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے گا۔

- مارکسی بیگانگی کے مفاہیم کا تعین اور جائزہ لینا۔

- منتخب ناولوں میں محنت کش کی محنت اور محنت کی پیداوار سے پیدا ہونے والی بیگانگی کا مطالعہ کرنا۔
- سماج اور نوعی زندگی سے پیدا ہونے والی بیگانگی کا منتخب ناولوں کے تناظر میں تجزیہ کرنا۔

۴۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ مارکسی بیگانگی کیا ہے، مارکسی بیگانگی وجودی بیگانگی سے کیوں کر منفرد و ممتاز ہے؟

۲۔ محنت کار کی محنت اور محنت کی پیداوار سے پیدا ہونے والی بیگانگی کی منتخب ناولوں میں پیشکش کی نوعیت کیا ہے؟

۳۔ منتخب ناولوں میں سماج اور نوعی زندگی سے پیدا ہونے والی بیگانگی کو کیسے برتا گیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار:

مارکس کا فلسفہ جدید معیشت کا ایک ایسا تصور ہے جس نے نہ صرف سرمایہ داری نظام کے بر خلاف مجموعی انسانی ترقی کی فکر پیش کی بل کہ سرمایہ داری نظام کے استحصال کے ہتھکنڈوں کو بھی بے نقاب کیا۔ اس فلسفۂ معیشت نے انسانی سماج کے ارتقا کی بھی وضاحت کی۔ سماج میں معیشت بنیادی تصور ہونے کی وجہ سے انسانی سماج کے دیگر شعبہ ہائے زندگی بھی اس سے متاثر ہوئے جن میں ادب بھی شامل ہے۔

اردو ادب اور بالخصوص ناول کی صنف میں مارکسی فکر کی پیشکش خاص اہمیت کی حامل ہے۔ ترقی پسند تحریک سے لے کر جدید ناولوں میں بھی مارکسی عناصر مختلف زاویوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ جدید ترین گلوبل ویلج کی اس دنیا میں سرمایہ داریت نے انسانی سماج کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ صنعتی ترقی اور گلوبل ویلج ہونے کے باوجود انسانیت کا ایک بہت بڑا گروہ اس سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ مارکس نے اس سرمایہ دارانہ نظام کے مد مقابل سوشلزم کا تصور جدید سائنسی اصولوں کے تناظر میں پیش کیا۔ جو پچھلے سو سال سے سرمایہ درانہ نظام کے متبادل کے طور پہ دنیا میں اپنی حیثیت منوا رہا ہے۔ اس سوچ سے ادیب نہ صرف متاثر ہوئے ہیں بل کہ اپنی تخلیقات میں اس کا پرچار کیا اور سرمایہ داریت کی نفی کی۔ اردو ناول بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ناول نگاروں نے پوری جانفشانی سے اس فکر کو اپنی تخلیقات حصہ بنایا۔

مجوزہ موضوع مارکس کے نظریہ بیگانگی "Alienation" کے حوالے سے منتخب ناولوں کی تعبیر پر مشتمل ہے۔ زیر نظر موضوع میں مارکسی نظریہ بیگانگی کے حوالے سے سبط حسن کی کتاب "موسیٰ سے مارکس تک" کو مد نظر رکھا جائے گا۔ اس کے علاوہ "Economic and Philosophic Manuscripts of

"1844 ضرورت پڑنے پر مختلف آرٹیکلز اور "سرمایہ" سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔مارکس نے بیگانگی کے مختلف پہلوؤں کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح سے فرد بیگانگی کا شکار ہو کر معاشرے سے کٹ جاتا ہے۔سبط حسن نے اپنی تصنیف "موسی سے مارکس تک" میں مارکس کی بیگانگی کے حوالے وضاحت کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

> محنت کی پیداوار سے بیگانگی کا حیاتی عمل اور نوعی زندگی سے بیگانگی کا براہ راست نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔انسان جب اپنا حریف ہوتا ہے تو وہ لامحالا طور پر دوسرے انسانوں کا بھی حریف ہوتا ہے۔

سرمایہ دارانہ معاشرے میں فرد اپنی محنت، محنت کی پیداوار اور سماج سے بیگانہ ہونے کے ساتھ ساتھ انسان کے نوعی تقاضوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔یوں انسان انسانوں کی سطح سے اتر کر جانوروں کی سطح پہ آ جاتا ہے۔مارکس اس کی وجہ نظام سرمایہ داریت اور ذرائع پیداوار پر قبضے کو قرار دیتا ہے۔مارکس کے اسی نقطۂ نظر کو نظری دائرہ کار بناتے ہوئے منتخب ناولوں کی مارکسی تعبیر کی جائے گی۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ تحقیقی مقالے کا موضوع مارکس کے نظریہ بیگانگی کے تناظر میں منتخب ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔جس کے تحت سب سے پہلے مارکسی نظریۂ بیگانگی کے بنیادی مباحث کا تجزیہ کیا جائے گا اور اردو ناول میں مارکسی فکر کے حوالے سے ایک طائرانہ جائزہ لیا جائے گا۔اس کے بعد منتخب ناولوں میں بیگانگیت کی نوعیت کو تلاش کیا جائے گا۔ لہذا اس اعتبار سے یہ کام تجزیاتی نوعیت کا حامل ہو گا۔چناں چہ تحقیق کے دوران میں معلومات، تصورات و نظریات کو پرکھ اور شواہد کو جمع کر کے نتائج اخذ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس تحقیق کے دوران میں ناول نگاروں کے متعلق ادبی جریدوں میں شائع ہونے والے تحقیقی و تنقیدی مضامین اور منتخب ناول نگاروں کے حوالے سے ماہ قبل تحقیقی مقالہ جات وغیرہ تک رسائی حاصل کی جائے گی۔ مختلف کتب خانوں جن میں "ادارہ فروغ قومی زبان، نذیر لائبریری نمل، ریختہ اور دیگر ڈیجیٹل لائبریریوں اور اہم ویب سائٹس سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

یوں تو اردو ادب میں طبقاتی حوالے سے کافی کام ہوا ہے۔ناول کی صنف میں بھی انفرادی سطح پر تحقیقی کام مل جاتا ہے۔ لیکن ناول نگاروں کے یہاں مارکسی فکر کے حوالے سے ترقی پسند تحریک کے سوا کوئی خاص مطالعہ نظر

نہیں آتا۔ بالخصوص جس زاویے سے منتخب ناولوں پہ کام کیا جارہا اس نوعیت کا جامعات کی سطح پر کوئی سندی کام نہیں ہوا۔ منتخب ناول نگاروں کے یہاں مارکسی نظریے کے خاص پہلو کو پرکھنا اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے۔ مارکسی نظریات تراجم اور مختلف مضامین و کتب کی صورت میں میسر ہیں۔ مارکس کی اس فکر کو ناولوں میں بھی برتا گیا ہے جن پہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس لحاظ سے تحقیقی سطح پہ ایک نیا اضافہ ہو گا۔ موضوع کے قریب قریب جو کام ہوئے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے۔

ا۔ محمد پرویز خان، ترقی پسند اردو ناول کا فکری و فنی مطالعہ، مقالہ برائے ڈی۔فل، (غیر مطبوعہ) مملوکہ الہ آباد یونیورسٹی، الہ آباد، س ن

۲۔ مشتاق احمد امتیاز، پاکستانی اردو ناول میں پسماندہ طبقے کے مسائل: تجزیاتی مطالعہ، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، (غیر مطبوعہ) مملوکہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد، س ن

۳۔ سارا طارق، اردو ناول میں جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظاہر، مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، س ن

۸۔ تحدید:

یوں تو اردو ناول طبقاتی حوالے سے ایک بڑی فکر سموئے ہوئے ہے۔ اردو ادب میں ناول نگاروں نے اس فکر کو اپنے ناولوں میں سمونے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ جن پر انفرادی سطح پر کام کیا جاسکتا ہے اور کچھ ناولوں پر انفرادی سطح پر اس حوالے سے کام ہوا بھی ہے۔ تاہم مجوزہ تحقیقی موضوع میں منتخب ناول نگاروں کے ناولوں کا مارکسی نظریۂ بیگانگی کے تناظر میں تجزیاتی مطالعہ کیا جائے گا۔ موضوع کے لحاظ سے ایسے ناول نگاروں کا انتخاب کیا گیا ہے جنہوں نے بالخصوص سماجی مسائل و طبقات کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ہے۔ منتخب ناول نگاروں کے تمام ناول اس موضوع کا حصہ نہیں ہیں بلکہ ایسے ناولوں کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں خاص طور پر مارکسی پہلو نمایاں ہیں اور مارکسی بیگانگی کے عناصر ان میں موجود ہیں۔ ان میں الیاس احمد گدی کا "فائر ایریا"، شیراز زیدی کا "جہنمی لوگ"، مستنصر حسین تارڑ کا "خس و خاشاک زمانے" اور طاہرہ اقبال کا "نیلی بار" شامل ہیں۔

۹۔ پس منظری مطالعہ:

مجوزہ موضوع پر کام کرنے کے لیے جن کتب کا مطالعہ کیا گیا ہے ان میں بنیادی ماخذ کا مطالعہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ اردو ناول سے متعلق تحقیقی اور تنقیدی کتب جن میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی کتاب "آزادی

کے بعد اردو ناول: ہیئت، اسالیب اور رجحانات "ڈاکٹر اسلم آزاد کی" اردو ناول آزادی کے بعد "ڈاکٹر احمد صغیر کی" اردو ناول کا تنقیدی جائزہ "(1980 کے بعد) وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ چند ایسے مقالات کا بھی مطالعہ شامل ہے جن میں انفرادی یا اجتماعی سطح پر ناولوں میں مختلف زاویوں سے تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔ صنف ادب سے آگاہی کے لیے مختلف مضامین، اور کچھ تنقیدی کتب کے خاص خاص پہلوؤں اور اہم ناولوں کا مطالعہ بھی شامل ہے۔

موضوع کے پیش نظر سبط حسن کی "موسی سے مارکس تک" اور پروفیسر وہاب اشرفی کی "مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور ادب" کا مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔ "مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس" اور "سرمایہ" کا بھی طائرانہ مطالعہ شامل ہے۔ موضوع سے متعلق ویب سائٹس سے کچھ مضامین بھی زیر مطالعہ رہے ہیں۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت:

مجوزہ موضوع مارکسی بیگانگی کے حوالے سے منتخب ناولوں کے مطالعے پر مبنی ہے، منتخب ناول نگاروں کے ہاں گہرے سماجی شعور سے آگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مارکسزم اردو ادب کا اہم موضوع ہے جس کو معاشرتی لحاظ سے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مارکسزم معاشرتی ارتقاء میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے جس میں نچلے طبقے کو ان کے حقوق کے بارے میں آگاہی دینا اور غلامی کی زندگی سے نجات دلانا مقصود ہے۔ یہ عناصر ہمیں منتخب ناول نگاروں کے یہاں بھرپور انداز میں نظر آتے ہیں، ان ناول نگاروں کے حوالے سے ابھی تک مارکسی نقطہ نظر کے تحت کوئی سندی کام نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے کہ معاصر اردو ناول کے منتخب ناول نگار ادبی حوالے سے اہم اور ناول نگاری کے چمکتے ستارے ہیں۔ ان کے حوالے سے اس خاص نوعیت کا کام اردو تحقیق میں بیش قیمت اضافے کے مترادف ہے اور یہ تحقیق اس حوالے سے یقینی طور پر سود مند ہو گی۔

جامعاتی سطح پر مارکسی حوالے سے جدید ناولوں پر کوئی خاص کام نہیں ہوا، اگرچہ اردو ناول میں انفرادی یا روایتی سطح کا کچھ کام ہوا ہے مگر مخصوص زاویے کے پیش نظر ان منتخب ناولوں پر یہ تحقیقی مقالہ اپنی نوعیت میں منفرد ہو گا۔ محنت کے استحصال اور طبقاتیت کی وجہ سے افراد کا معاشرتی سطح پر بیگانگی اختیار کرنا اور سماج میں تقسیم ہو کر انتہائی ذلت بھری زندگی گزارنا جدید دنیا کا اہم مسئلہ ہے جو آج کے جدید سرمایہ داری نظام کی دین ہے۔ اس کے خلاف لکھنے والے بے شک کم ہی لوگوں نے قلم اٹھایا ہے مگر جو ان مسائل کا ادراک

رکھتے ہیں ان کے یہاں یہ فکر بڑی واضح اور صاف دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ناولوں کا مطالعہ مارکسیت کے تحت کیا جائے گا اس لحاظ سے تحقیق کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک منفرد موضوع ہے اس لیے یہ جواز بھی بنتا ہے اور یہ تحقیق اس زاویے کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ یہ تحقیقی کام اپنے آپ میں ایک نیا پہلو اور ناول نگاروں کی اہمیت کو بھی اجاگر کرے گا اور مستقبل میں نئے محققین کے لیے ان ناول نگاروں کے حوالے سے معلومات ایک جگہ جمع ہو جائیں گی۔

ب: نظریہ بیگانگی اور بنیادی مباحث:

بیگانگی بنیادی طور پر انگریزی لفظ (Alienation) کا ترجمہ ہے۔اس کے مترادفات میں(Estrangement) مغائرت، محرومی، برگشتگی وغیرہ سمیت کئی اور الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کے مترادف اور پیدا ہونے والی مختلف کیفیات کا اظہار یعنی احساس ہے۔ اذیت، ملامت، تنہائی ،خود فریبی،لایعنیت اور کرب وغیرہ۔

بیگانگی آج کے سماج کا ایک بہت بڑا المیہ ہے جس نے پورے سماج کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔اس سے مراد تشخص ذات کا زیاں تصور کیا جاتا ہے۔ ایک فرد کا اپنے گروہ یا سماج سے لاتعلق ہونا بھی انہی معنوں میں آتا ہے۔ یعنی وہ انسانی ذہنی کیفیت جس کی وجہ سے کوئی انسان سماج اور اپنی ذات تک سے بھی کٹ جاتا ہے۔ وہ ہجوم میں خود کو بے یارو مددگار اور تنہا محسوس کرتا ہے۔ ہم روز مرہ زندگی میں اس طرح کا جملہ اکثر سنتے ہیں کہ آج کل تو ہر شخص دوسرے سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ اس کا اظہار ہمیں ادبی سطح پر بھی دکھائی دیتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے اور سماج میں موجود ہر طبقے میں۔

سماج کا جب تجزیہ کیا جائے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج کا انسان اپنے گردوپیش کی ہر چیز سے، اپنے سماج سے، انسانوں سے اور یہاں تک کہ وہ اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو چکا ہے۔ کچھ لوگ اسے فطری خود غرضی سے منسوب کرتے ہیں جو کہ ایک غیر عقلی اور غیر سائنسی دلیل ہے۔ کرہ ارض پر انسان جب سے محیط ہے تب سے انسان نے بقائے حیات کی جدوجہد میں زندگی گزاری ہے ۔ فطرت کی اندھی قوتوں، وحشی درندوں کی بھوک، بیماریوں اور موسم کی سختیوں کو بنی نوع انسان نے برداشت کیا اور باہمی امداد و تعاون کے ذریعے ترقی کی منازل طے کیں۔ اگر وہ خود غرضی یا ذاتی بقا میں مبتلا ہوتا تو آج انسان انسانیت کے اس مقام پر نہ ہوتا بلکہ یوں کہیے کہ وہ ذاتی بقا کے تصور سے ہی ناآشنا تھا۔ فرد کی بقا ہی گروہ یا قبیلے کی بقا میں تھی، سب ایک دوسرے

کے لیے تھے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم انسان فطری طور پہ بیگانگی کا حامل نہیں ہے بلکہ سماج میں رہتے ہوئے وہ اس کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ بیگانگی کے حوالے سے سبط حسن لکھتے ہیں:

> بیگانگی یا لاتعلقی (Alienation) نفسیات کی پرانی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد تشخص ذات کا زیاں ہے۔ یعنی وہ ذہنی کیفیت جس کے باعث انسان اپنے معاشرے، اپنی تہذیب حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی کٹ جاتا ہے۔ وہ ہزاروں لاکھوں کی بستی میں بھی اپنے آپ کو تنہا اور بے یار و مددگار محسوس کرتا ہے۔ اس کو اپنے گرد و پیش کی ہر شے اجنبی اور غیر نظر آتی ہے اور وہ معاشرے کی تمام قدروں تمام سرگرمیوں کو بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ اس ذہنی بیماری کی دوسری علامت لاچاری اور بے بسی کا شدید احساس ہے انسان کو یقین ہو جاتا ہے کہ مجھ کو اپنی زندگی پر بالکل قدرت حاصل نہیں۔۔۔۔ بے مقصدیت کا احساس اس کو سماجی قدروں سے اور بے بسی کا احساس اس کو اپنے کردار و عمل سے بیگانہ بنا دیتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کھو دیتا ہے۔ (۱)

بیگانگی کے اس تصور سے یہ سوال ابھرتا ہے کہ آج کا یہ انسان اتنا بیگانہ کیوں ہے؟ اس بیگانگی کی کون سی وجوہات ہیں؟ کیا یہ بیگانگی ہمیشہ سے تھی؟ کیا بیگانگی کا تعلق سماج میں موجود قائم نظام سے ہے یا نہیں؟ اور یہ بیگانگی افراد کو کیسے متاثر کرتی ہے؟ جب ان پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے تو کم از کم یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انسان کی بیگانگی نہ تو ہمیشہ سے تھی اور نہ ہی یہ فطری ہے بلکہ ادوار کی تبدیلی اور سماج میں انسان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں یہ کیفیت پیدا ہوئی۔ بیگانگی کو وجودیوں نے اسی مفہوم اور مطالب سے نوازا جنہیں دوسری جنگ عظیم کے بعد کے زمانے میں رواج دیا گیا۔ یہاں بیگانگی کے حوالے سے دو بنیادی مکتبہ فکر کا جائزہ لے کر ان دونوں کے درمیان فرق کا تعین کیا جائے گا۔

وجودی بیگانگی اور مارکسی بیگانگی:

وجودی بیگانگی:

کائنات کی ابتدا سے ہی وجود انسانی بحث کا مرکز رہا ہے۔ ابتدائی دور سے لے کر عصر حاضر تک کی تمام معلومات، تاریخ اور مختلف فکری تحریکوں کا اگر مطالعہ کیا جائے تو ان میں وجود پر اسرار لازمی ملتا ہے۔ انسانی وجود ایک ایسا پر اسرار معمہ ہے جسے فہم و ادراک کے دریچوں میں لانا ایک مشکل عمل ہے۔ سائنس نے بھی اسے اعصابی جال کا ایک مخزن قرار دیا لیکن وجود کی اصلیت اِس سے پرے ہی رہی۔ بیسویں صدی میں وجود

کے اس پیچیدہ مسئلے کو سلجھانے کی نئ پیش رفت ہوئی لیکن اسے بھی وجود کی خصوصیت ہی سے متعلق فکر مہیا کی جسے وجودیت(Existentialism) کہا جاتا ہے۔ "وجودیت" عربی زبان کے لفظ "وجود" سے نکلا ہے فرانسیسی زبان میں(Existence)جرمنی میں(Existenz)،لاطینی(Existentia) اور فارسی میں "ہست" وجود کے مترادف ہیں۔ وجود کے لغوی معنی حصول مقصد یا مطلوب کا پانا، مجاز بدن، عدم ہستی ،ذات زندگی جس طرح لفظ ظہور، نمائش اور قیام وغیرہ ہیں تاہم موجودہ مفکروں کے یہاں یہ لفظ معنی کے ایک باریک نقطے کو بیان کرتا ہے۔

وجودیت دراصل اس نقطے سے بحث کرتی ہے کہ اس دنیا میں انسان زندگی کیسے بسر کریں؟اس سلسلے میں دو صورتوں کی طرف رہنمائی ملتی ہے۔ایک "To Exist" کی ہے جس کے تحت وجودی مفکرین کہتے ہیں کہ ہمیں پیدائش کے بعد سے یہ حق حاصل ہے کہ ہم اپنے تمام تر شعور کے ساتھ آزادانہ زندگی گزاریں جس پر کوئی قدغن نہ ہو اس صورت کو وہ ٹو ایگزسٹ کہتے ہیں۔ دوسری صورت کے مطابق ہم حالات ماحول اور اقتدار کے پابند ہو کر زندگی گزار دیں یہ صورتTo live کی ہے۔

وجودیت متعین فکر کے روپ میں ابھی تک واضح نہیں ہو سکی جس کی بنیادی وجہ مختلف وجودی فلاسفرز کے مختلف تصورات ہیں لیکن جس تصور پر تمام اتفاق کرتے نظر آتے ہیں ان میںTo exist کا پہلو سب کے یہاں موجود ہے۔"Collins Concise Encyclopedia" میں وجودیت کے حوالے سے یوں تحریر ہے:

> Existentialism A philosophical Movement Which held that there is no fixed human nature, that man is free to act as he Will and that this is the source of his anguish. (۲)

وجودیت ایک فلسفیانہ تحریک ہے جس کا خیال تھا کہ انسانی فطرت کوئی طے نہیں ہے،انسان اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد ہے اور یہی اس کی پریشانی کا باعث ہے۔سارتر وجودیت کے بارے میں "وجودیت اور انسان دوستی" میں لکھتا ہے:

> ہمارے نزدیک وجودیت ایک نظریہ ہے جو انسانی زندگی کو ممکن بنا دیتا ہے۔یہ ایک ایسا نظریہ بھی ہے جو اس بات کی توثیق کرتا ہے کہ ہر سچائی اور ہر عمل ایک ماحول اور ایک انسانی داخلیت دونوں پر دلالت کرتے ہیں۔ (۳)

وجودیت پسندوں کا یہ ماننا ہے کہ انسان اس دنیا میں آزاد پیدا ہوا ہے اس لیے وہ آزاد ہے۔ وہ ماحول سے نہیں بنتا بلکہ وہ ماحول کو بناتا ہے۔ وہ اپنی داخلیت کی بنیاد پر ہی مختلف طرح کے اعمال سر انجام دیتا ہے یوں اپنے ہر عمل کا ذمہ دار بھی خود ہے۔ وہ جو انتخاب کرتا ہے وہی سب کچھ اصل اور حقیقی ہے۔ وجود جوہر پر مقدم ہے۔ انسانی فطرت یا جوہر پہلے سے کچھ بھی نہیں۔ وجود پہلے ہے اور جوہر کا تعین انسان خود کرتا ہے کہ وہ کیا بننا چاہتا ہے۔ اس حوالے سے اس کی دو کتابیں "Being and nothingness"(عدم اور وجود) اور "Existentialism and Humanism"(وجودیت اور انسان دوستی) شامل ہیں۔ سارتر مزید لکھتا ہے:

> انسانی فطرت نام کی کسی شے کا وجود نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ خدا خود ہی موجود نہیں جو پہلے سے اس کا تصور کر سکے۔ انسان تو بس ہے۔ وہ محض وہی کچھ نہیں جو خود کو سمجھتا ہے بلکہ وہ کچھ بھی ہے جو ارادہ کرتا ہے۔ وجود میں آنے کے بعد وہ اپنے متعلق تصور قائم کرتا ہے اور وجود میں پھلانگنے کے بعد ہی ارادہ کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ انسان صرف وہی کچھ ہے جو کچھ وہ اپنے آپ کو بناتا ہے۔ (۴)

وجودیوں کے نزدیک وجود سے مراد ایسا انسان ہے جو آزاد ہو، خود مختار ہو، اپنی زندگی خود بنا رہا ہو اور ہر آن ماضی کی جگہ مستقبل کی بہتری میں کوشاں رہے۔ وجودی فکر کے حوالے سے جب اس کی جڑوں کی تلاش کی جاتی ہے اور فلاسفرز کے ہاں اس کے نمونوں سے یہ آشکار ہوتا ہے کہ کسی نے کہا میں سوچتا ہوں اس لیے میں ہوں، کسی نے کہا میں ہوں اس لیے میں سوچتا ہوں، کسی نے کہا ہم کچھ نہیں بلاوجہ یہاں پھینک دیے گئے ہیں اس لیے سب کچھ لایعنی ہے انسان یہاں سزا بھگت رہا ہے۔ کسی نے کہا ہم آزاد ہیں اپنے عمل میں اس لیے اس کے نتائج کے ذمہ دار بھی خود ہیں اور سارتر نے کہا کہ وجود جوہر پہ مقدم ہے۔ الغرض مختلف فلسفیوں کی فکر کے نتیجے میں بھانت بھانت کے تصور پیدا ہوئے اور ان سب کے اس ملغوبے کو وجودیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ وجود کی جوہر پہ برتری سب کے یہاں مشترک ہے۔

وجودیت کو سمجھنے کے لیے اس کی تاریخی جہت کو سمجھنا ضروری ہے۔ بنیادی طور پر وجودیت میں دو بڑے گروہ سامنے آئے ہیں۔ ایک مذہبی اور دوسرا دہریت پسند گروہ۔ وجودیت کا تصور سب سے پہلے کرکیگارڈ نے دیا جو کہ ایک مذہبی شخص تھا۔ اس کے ماننے والوں میں مارٹن اور جبرئیل مارشل کا نام لیا جاتا ہے جبکہ دوسرے گروہ میں سارتر، پاسکل اور ہیڈگر کے نام شامل ہیں۔ اس گروہ کو دہریت پسند کہا جاتا ہے۔ ان

کے علاوہ کارل جیسپر، کافکا، مارلو پونٹی، دستوفسکی اور بعض اوقات نطشے کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ وجودیت کا آغاز تو کرکیگارڈ سے ہوتا ہے تاہم یہ جنگ عظیم اول اور دوم کے بعد زور و شور سے ابھری۔

ایسے تو وجود انسان کی بحث کا موضوع ہمیشہ سے رہا ہے لیکن اس کو نئی روح انقلاب فرانس سے حاصل ہوئی۔ فرانس میں جس طرح جاگیر داریت، بادشاہت اور مذہبی رہنماؤں نے عوام کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اس سے وہاں مایوسی و ناامیدی، بیگانگی، خوف، اجنبیت اور دہشت کی فضا نے اپنا ہالہ بنایا ہوا تھا۔ جس کو توڑنے میں والٹیئر، روسو اور منٹیسکو جیسے عالی دماغوں نے کردار ادا کیا۔ انھوں نے عوام کو سوچنے پر مجبور کیا اور یوں پہلی مرتبہ عوام نے اپنی ذات کی طرف توجہ مبذول کی جس کا نتیجہ انقلاب فرانس کی صورت میں نکلا۔ اسی طرح صنعتی انقلاب سے قبل یورپ کی ٹرائیکا نے عوام کو جس سماجی بدحالی میں دھکیلا ہوا تھا اور پھر تحریک احیائے علوم کی تحریک کے ذریعے جس طرح اس دائرے کو توڑا گیا وہ بھی وجودیت کو بنیادیں فراہم کرتا ہے۔

جنگ عظیم اول اور دوم میں جس طرح کروڑوں انسانی جانوں کے ساتھ موت کا کھلواڑ ہوا جہاں انسانی اقدار، روایات، تہذیب یہاں تک کہ ہر چیز فنا کر دی گئی۔ ایسی صورت میں ہر شخص دکھ، مصیبت، پریشانی، اجنبیت بیگانگی، خوف و ہراس، دہشت، کرب اور مایوسی و ناامیدی میں مبتلا اپنی ذات میں جھانکنا چاہتا تھا۔ یہی وہ صورتحال تھی جس نے انیسویں صدی کے کرکیگارڈ کے خیالات کو بیسویں صدی میں کھنگالنے پر مجبور کر دیا۔ یوں ۱۹۴۲۔۴۳ میں باقاعدہ طور پر اس تحریک کا آغاز ہوا اور ان لوگوں کو اپنی طرف کھینچا جو اس پستی کی حامل صورت حال سے نبرد آزما ہو رہے تھے۔

ژاں پال سارتر اس فکر کا نمائندہ ہے۔ یوں تو کرکیگارڈ نے انیسویں صدی میں ان خیالات کا اظہار کر دیا تھا تاہم اس طرف کسی کی نظر نہیں گئی اور وہ بنیاد فراہم کرنے والا فلسفی دنیا سے اوجھل رہا۔ لیکن جلد ہی اس کی تحریروں پہ غور و فکر ہونے لگا یوں اس تحریک کا آغاز ہوا۔ سائنسی ترقی اور مشینوں کی انسان پر حکومت، جنگوں میں ہونے والی انسانی جانوں کا ضیاع اور اقدار کے زوال سمیت جب ہر چیز اپنی اہمیت کھوتی چلی گئی اور انسان دکھ، کرب اور مایوسی و ناامیدی میں مبتلا ہوتا گیا تو اس نے اپنی ذات میں جھانکنے کی سعی کی۔ جنگ اور افراتفری کے عالم نے انسان کے باطن کو سخت ٹھیس پہنچائی اور اس کو یہ سوچنے پہ مجبور کیا کہ آخر یہ سب اس کی مرضی کے مطابق تو نہیں ہو رہا بل کہ یہ خارجی حالات جبراً اس پہ مسلط کیے جا رہے ہیں۔ اسی باطن اور

داخلیت کی طرف رجحان کو وجودیت سے تعبیر کیا گیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی تصنیف "مغرب میں نفسیاتی تنقید" میں لکھا ہے:

> وجودیت کی اساس اس امر پر استوار ہے کہ انسان اس دنیا میں آزاد اور منفرد پیدا ہوا لیکن معاشرے میں رہنے کی بنا پر وہ اپنے لئے الگ خاص نوع کا طرز عمل منتخب کرنے پر مجبور ہے۔ بحیثیت ایک فرد انتخاب اس کا حق ہے جب کہ معاشرے کا ایک رکن ہونے کی بنا پر یہی انتخاب ایک مجبوری بن جاتا ہے اور اسی کرب کا احساس جنم لیتا ہے جو جدید انسان کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ (۵)

وجودیت خالصتاً عقلیت اور خارجیت کا ردِ عمل ہے۔ یہ معروضی طریقہ کی نسبت موضوعی اور داخلیت کو بنیاد بناتی ہے۔ ان کے خیال میں پہلے انسان کا وجود اور پھر جوہر یعنی انسان پہلے اور خوبی دوسرے درجے میں ہے۔ انسان اپنے جوہر کا تعین بھی خود کرتا ہے یعنی وہ جو خود کو بناتا ہے وہی بنتا ہے۔ فطرت ماحول اور حالات اس پر اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ فرد ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہ تصور کہ انسانی ماحول اور حالات انسان کو متاثر کرتے ہیں اور مختلف اقدار کو قبول کرنے پہ مجبور کرتے ہیں جس سے اس کی شخصیت بنتی ہے۔ وجودی اس کا یکسر انکار کرتے ہیں کہ کوئی بیرونی چیز انسان پہ اثر انداز ہوتی ہے اور اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ کس کو اختیار کرے اور کس کو چھوڑے۔ انسان کا وجود ہی یہ تعین کرتا ہے کہ وہ کس کو اختیار کرے جس کا انتخاب وہ کرتا ہے اس سے ماحول پہ اثر پڑتا ہے۔ اس لیے وہ خارجیت کی بجائے داخلیت پر یقین رکھتے ہیں۔ انسان کی شخصیت میں جو مختلف قسم کی کیفیات جنم لیتی ہیں انہیں داخلی وارداتیں کہا جاتا ہے۔ ان میں تنہائی، بیگانگی، کرب، ناامیدی، خوشی، غمی، بے چارگی، دہشت، خوف، اجنبیت جیسی کیفیات شامل ہیں۔

وجودی فلسفیوں کے نزدیک جہاں جوہر پر وجود کو فوقیت حاصل ہے وہیں آزادی انسانی وجود کے لیے ناگزیر ہے۔ انسان کیونکہ آزاد پیدا ہوا ہے اس لئے وہ آزاد رہنا چاہتا ہے۔ آزادی کے بغیر اس وجود کی کوئی وقعت نہیں اور یہ نامکمل رہ جاتا ہے۔ آزادی اور انتخاب ہی انسان کو مستقبل کے ساتھ لڑنے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔ سارتر کے خیال میں مصدقہ وجود وہی ہے جو آزادی کا استعمال اور انتخاب کرتا ہے اور اس کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ یہی مصدقہ وجود دراصل انسان ہے۔ اس کے خیال میں آزادی کا انتخاب نہ کرنا بداعتقادی ہے۔ آزادی انسان کی مجبوری ہے اور اس مجبوری سے پہلو تہی نہیں کی جا سکتی۔ یہ انسانوں پر تھوپ دی گئی ہے جو اس کا فطری حق ہے۔ جب معروض انسان کو گھیر لیتے ہیں اور آزادی و انتخاب میں رکاوٹ بنتے ہیں تو

انسان کراہت اور کرب جیسی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے۔ انسان کی آزادی کامل ہے اور یہ کامل آزادی سارتر کی اخلاقیات کی اساس بھی ہے۔

سارتر انفرادی آزادی کے بجائے اجتماعی آزادی کا علمبردار ہے۔ اس کے خیال میں آزادی کے اس کامل تصور سے انسان کے اندر دہشت اور خوف جنم لیتے ہیں۔ دہشت کا جنم لاشئیت سے ہوتا ہے جو انسان کے جوہر اور اس کے انتخاب کے درمیان حائل ہے۔ یعنی جب انسان کسی چیز کے انتخاب پہ مجبور ہوتا ہے اس کے داخل میں دہشت کا دخل ہوتا ہے جو کہ موضوعی ہے اور خوف کسی خارجی معروض کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے یعنی کسی انتخاب کے رد عمل اور نتیجے کے ڈر سے۔ یوں انسان اپنی کامل آزادی کے استعمال سے فرار حاصل کرتا رہتا ہے۔ اسی طرح ان فلسفیوں کے نزدیک سچائی اور نیکی بھی معروضی حقائق نہیں ہیں بلکہ یہ موضوعی ہیں اور فرد کے اندر کی پیداوار ہیں ان کا تعلق خالصتاً داخلیت سے ہے۔ یہ اپنا کوئی وجود نہیں رکھتیں اور نہ ہی طے شدہ ہوتی ہیں بل کہ فرد کے انتخاب کے تحت ہی ان کا تعین ہوتا ہے کہ آیا کیا اچھا ہے اور کیا برا؟

وجودیوں کے یہاں موت بھی ایک معمہ ہے جو کہ معروض سے تعلق رکھتی ہے اور فرد کے وجود کے خاتمے کا باعث بنتی ہے۔ ان کے نزدیک چوں کہ مردہ بدن وجود کا حامل نہیں ہوتا اس لیے وہ موت کو امکان نہیں بل کہ امکانات کا خاتمہ تصور کرتے ہیں۔ جب کہ مذہبی تصور کے تحت موت انسان کو نہ ختم ہونے والے امکانات سے جوڑ دیتی ہے۔ کامیو کے یہاں موت کے اسی معروضی انداز کی وجہ سے لایعنیت اور خودکشی جیسے عناصر کی پیش کش زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ لایعنیت اور خودکشی جیسی اصطلاحات وجودی فلسفے میں کامیو کے تصور سے آئی ہیں۔

وجودیت بنیادی طور پر انفرادیت کا فلسفہ ہے اور اجتماعیت کو فرد کی آزادی کے خلاف تصور کرتا ہے۔ یہ فرد کو اپنی ذات تک محدود رکھتا ہے اسے اس نظریے پر لاتا ہے کہ فرد ہی بنیادی مرکز کائنات ہے۔ وہ خود ماحول کو بناتا ہے اور اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ یوں وہ ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول کو متاثر کرتا ہے۔ وہ بلاوجہ یہاں کائنات میں پھینک دیا گیا ہے اس لیے وہ پیدائش سے ہی آزاد ہے۔ اسے خارجی اشیا میں جھانکنے کے بجائے اپنی ذات میں جھانکنے سے اپنے ہونے کا احساس ہوگا۔ چونکہ یہ فرد کی داخلیت پر زور دیتا ہے اس لیے خارجی عوامل اور معروضیت کو یکسر مسترد کر دیتا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ ہیگل کے فلسفہ عقلیت کو رد کر کے اپنی بنیادیں رکھتا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

یہ فلسفہ معاشرتی روایات رسوم اور اقدار کو تسلیم نہیں کرتا بلکہ فرد کے انتخاب کو اہمیت دیتا ہے جو اس کے لئے مختلف طرح کا ماحول اور حالات پیدا کرتا ہے جس میں وہ اپنی زندگی گزارتا ہے۔ یہی عناصر فرد کو سماج میں متاثر کرتے ہیں جب وہ اپنی آزادی سے انتخاب نہیں کرتا بل کہ اس کی ذات پہ چیزوں کو مسلط کیا جاتا ہے تو وہ وجودی کیفیات کا شکار ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز سے بے بس سماج کی روایات و اقدار کے زیر سایہ آ جاتا ہے۔ سماجی اقدار اور اصول کے نظریے کے تحت اس کی ذاتی شناخت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ داخلیت میں انتشار پیدا ہوتا ہے اس کی یہ داخلیت اسے خارجیت سے کاٹ دیتی ہے۔ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو اپنا دشمن سمجھنے لگتا ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ اس کی زندگی کے رخ کا تعین کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح دوسرے انسانوں سے اس کا رویہ یکسر نفرت میں بدل جاتا ہے اور تعلقات میں دراڑ پڑ جاتی ہے۔ جس سے اس کی ذات میں حزن و یاس، پژمردگی، کرب، تنہائی، مغائرت اور بیگانگی کی سی کیفیات پیدا ہوتی ہیں۔ بالخصوص آج کا سماج مشینی سماج بن چکا ہے جہاں فرد اپنے ہی ہاتھوں سے بنی چیزوں کا غلام بن کر ذاتی پہچان گنوا بیٹھتا ہے اور سماج اور اس میں موجود ہر شئے سے خود کو لاتعلق تصور کرنے لگتا ہے۔ اسے اپنا وجود بھی اپنا نہیں لگتا یوں اس کی آزادی و حریت سلب ہو کر رہ جاتی ہے۔ شاہین مفتی لکھتے ہیں:

> مروجہ نظام فرد کی آزادی کے لیے سم قاتل ہے۔ یہ فرد کو ایک کل پرزے کے طور پر استعمال کر رہا ہے جس کی وجہ سے معاشرے میں تنہائی اور بیگانگی کا عمل دخل بڑھ رہا ہے۔ انسان مذہب سے بیگانہ ہو گیا ہے اس کے چاروں طرف تاریکی ہے۔[۶]

وجودیت عقلیت اور سائنس کو یکسر مسترد کرتی ہے۔ سائنس کی اس ترقی نے انسان کے لیے جہاں بے شمار سہولیات فراہم کی ہیں وہیں اسے حالات کے شکنجے میں جکڑ کر اپنی ذات سے بھی اس کا تعلق کاٹ دیا ہے۔ اس کی واضح مثالیں صنعتی اور فرانسیسی انقلاب کے بعد سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ جہاں انسان نے ہر شے کا انکار کرتے ہوئے خود کو مذہب اور خدا سے بھی بیگانہ کر لیا۔

آج کا انسان مشین کا کل پرزہ بن کر سماج میں جینے پر مجبور ہے۔ وہ سماج جس کو بنانے میں اس کا کردار ہونا چاہیے تھا اُس کی مسلط کردہ ان اقدار سے بھی وہ بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اخلاقی قوانین جس کا انتخاب اس نے کیا ہی نہیں ان کے زیر سایہ زندگی جینے پر مجبور ہے۔ وہ اپنی ذات جس کو اس کی مرضی اور مشورے کے بغیر یہاں بھیج کر اجتماعیت سے وابستہ کر دیا ہے اس سے اس لیے بھی بیگانہ ہو کر رہ گیا ہے کہ اس میں اس کی ذات کا کوئی عمل دخل نہیں۔ اس کو ایک مخصوص دائرے میں ڈال کر کہیں گم کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ

خود کو دوسروں سے بیگانہ اور اجنبی تصور کرنے لگا ہے۔اس کی بڑی واضح مثال کامیو کا ناول بیگانہ ہے جس کا کردار "مرسال" جو آزادانہ طور پر جینا چاہتا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا اگر وہ ایسا کرتا تو وہ سماجی شناخت سے محروم ہو جاتا۔یہی سماجی جبریت اسے اپنی شناخت اور انتخاب سے بھی بیگانہ کر دیتی ہے۔شاہین مفتی لکھتے ہیں:

> آزادی کے تصور کی یہ سلبیت انسان کے اندر بیگانگی، مغائرت اور اجنبیت کے اثرات پیدا کرتی ہے۔ہیگل اپنی کتاب(Phenomenology of the mind) میں اس تصور بیگانگی کو شعور افسردہ unhappy consciousness کہتا ہے۔جرمن فلسفی فیورباخ اس اصطلاح کو کچھ مقامات پر بیگانگی مذہب Religious Alienation اور مارکس بیگانگی محنت labor Estranged کا نام دیتا ہے۔اجنبیت و بیگانگی کی وجودی کیفیات شدید کربناکی کا احساس لئے ہوئے ہیں۔جس طرح بیگانگی مذہب میں انسان اپنی ذات کے بہترین اوصاف مذہبی اداروں کی شکل میں منجمد کر کے خود بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔اس طرح سرمایہ انسان کی ذات پر مسلط ہو کر افلاس کی صورتحال کو جنم دیتا ہے جو لاتعلقی اور اجنبیت کے انجماد کی مثال بن جاتی ہے۔(۰۷)

وجودی فلاسفروں کے تصورات سے یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ سماجی رویے اقدار اور قوانین فرد پر جب مسلط کر دیے جاتے ہیں تو وہ مختلف داخلی کیفیات کا شکار ہو کر ہر چیز سے خود کو لاتعلق اور بیگانہ تصور کرتا ہے اور آخر کار وہ اپنی ذات اور شخصیت کو بھی بھول بیٹھتا ہے۔آج کا انسان جس دور اور جن حالات میں جی رہا ہے وہ انتہائی تکلیف دہ اور مایوس کر دینے والے ہیں۔ان حالات اور ماحول میں آج کا فرد دوسرے سے اجنبی بن چکا ہے۔وہ ہر طرح کے ذاتی عمل سے بیزار ہے اور اس مشینی زندگی سے تنگ آکر اپنی ذات میں کھو جانا چاہتا ہے مگر سماج کے رویے اسے اپنی ذات سے بھی اجنبی بنا دیتے ہیں۔یہی کچھ حالات تھے جس نے وجودیت کو پروان چڑھنے میں مدد فراہم کی۔یہی وہ فلسفہ تھا جس نے عدم مقبولیت اور ناشائستگی کے نئے فلسفے کے تحت انسان کو اس کے تصورات، اس کی بنیادی آزادی و انتخاب کا عمل اور داخلی جذبات کو واپس لوٹا دیا۔سماج میں تمام اعمال کا آقا انسان کو قرار دے کر زندگی کو جینے کا ایک نیا حوصلہ بخشا۔

مذکورہ بحث سے وجودیت کے جو چند نکات واضح ہوتے ہیں ان میں وجود کو جوہر پر برتری حاصل ہے یعنی انسان پہلے خود ہے اور پھر اس کا شعور یا جوہر۔اس لیے وہ جو عمل کرتا ہے اس کا خود ذمہ دار ہے۔معاشرے میں انسان ہمیشہ سے کرب کی حالت میں رہنے پہ مجبور ہے۔مختلف طرح کے حالات میں جب

وہ کوئی انتخاب کرتا ہے تب بھی اور جب وہ آزادی سے کسی عمل کو نہیں کر سکتا تو اسے کرب کی حالت سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس طرح بے چارگی، ناامیدی اور مایوسی وغیرہ بھی موجود ہیں جو اُن کیفیات کا اظہار کرتی ہیں کہ فطرت نام کی کوئی چیز نہیں بلکہ انسان خود اپنے اعمال کا تعین کرتا ہے اور خود کو بناتا بھی ہے جس طرح وہ چاہتا ہے۔ ماحول کا اس کی شخصیت بنانے میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ عمل ہی سب کچھ ہے۔ اس لیے وجودی عمل پہ زور دیتے ہیں ناں کہ خارجی محرکات پہ۔

آزادی انسانی وجود کا اٹوٹ حصہ ہے اور آزادی کا استعمال ہی اسے خوشی و سکون بخشتا ہے۔ سچائی اور نیکی کوئی وجود نہیں رکھتیں یہ انسان کی داخلی کیفیات سے جنم لیتی ہیں۔ موت ایک اضافی معروضی شئے ہے جو انسانی وجود کا خاتمہ کر کے تمام امکانات کو یکسر رد کر دیتی ہے۔ اس فلسفے کے بکھرے ہوئے پہلو اور فکر کا پرچار ادب کے ذریعے سے ہوا اور اس کا سہرا بلاشبہ ژاں پال سارتر کے سر جاتا ہے۔ جس نے اس فلسفے کو ایک تحریک کی شکل عطا کی۔ وہ ادب کو زندگی کا آئینہ تو نہیں سمجھتا تاہم اس کے نزدیک وجود کا اظہار اس کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ یوں ادیب کردار تخلیق نہیں کرتا بل کہ ان کرداروں کی مدد سے اپنے وجود کا متلاشی ہوتا ہے۔

مارکسی بیگانگی:

بیگانگی کا تصور تاریخ انسانی میں کافی قدیم ہے اور اس کی مختلف تعبیرات کی جاتی رہی ہیں۔ انسان سماج میں رہتے ہوئے اپنے اردگرد کی اشیا سے، کائنات میں موجود مختلف مظاہر فطرت سے اور خود انسان سے بھی بیگانہ دکھائی دیتا ہے۔ ایک طرف انسان کو کائنات کی ابتدا سے ہی ایک دوسرے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی اور وہ مل کر آگے بڑھنے کے لیے ہمہ تن مصروف عمل رہا۔ دوسری طرف وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان نے مذہب اختیار کیا۔ ماورائی قوت کے سامنے خود کو سربسجود کیا اور خود کو اس ماورائی ذات کی تخلیق کہتے ہوئے اپنے الگ وجود کا پرچار کیا۔ وہ جن مسائل اور جس ماورائی قوت سے ڈرتا تھا اسے اپنے سے بیگانہ کوئی ہستی تصور کر کے زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کے خیال میں خلا میں کہیں کوئی ماورائی طاقت ہے جو سب کچھ کرتی ہے اور وہ خود کچھ بھی نہیں۔ وہ ہر لحاظ سے اسی کے ماتحت ہے۔ یعنی وہ کوئی بیگانی ماورائی طاقت سے جس نے انھیں خود سے الگ کر کے یہاں بے بس اور مجبور بنا رکھا ہے۔ وہ اپنی فطرت سے اپنے اوصاف سے بالکل بیگانہ اس ذات کے سہارے ہے۔

وقت کے ساتھ ساتھ انسانی ترقی ہوئی اور جب انسان نے غاروں سے نکل کر غلام داری سماج میں قدم رکھا تو اس میں بیگانگی کی کیفیت نے جنم لیا۔ غار کے دور میں انسان مل کر رہنا لازم تصور کرتا تھا لیکن جب اس

نے شکار کرنے والے ہتھیاروں پہ اپنی ملکیت کا اظہار کیا تو بیگانگی کی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھنے کا آغاز ہو گیا۔ غلام داری سماج کی بنیاد پڑی اور غیر مرئی انداز میں ملکیت کا اظہار ہونے لگا۔ ایک طرف وہ ماورائی طاقت سے بیگانہ تھا دوسری طرف غلام داری سماج میں باصلاحیت اور چالاک طبقہ ان افراد معاشرہ کو غلام بنانے لگا جو ان کے بنے ہوئے اوزاروں کو استعمال میں لاتے تھے اس طرح یہ طبقہ حکمرانی کرنے لگا۔ یوں ایک سماج میں بیگانگی کا بیج پھوٹنا شروع ہوا۔

زرعی دور میں داخل ہونے پہ یہ خلا مزید بڑھا اور بڑھتا چلا گیا لیکن زرعی دور کی بیگانگی کے اثرات معاشرے پہ اس طرح اثر انداز نہیں ہوئے جس طرح آج کے جدید سماج میں ان کا اظہار ہو رہا ہے۔ جس نے طاقت حاصل کر لی یا کسی خاص خطہ زمین کو اپنے قبضے میں کر لیا تب وہ اپنے جیسی دوسری مخلوق کو ہی خود سے کم تر اور حقیر جاننے لگا اور بیگانگی جنم لینے لگی۔ یہ وہ لوگ ہوا کرتے تھے جنھیں غلام داری سماج میں غلامی کی زندگی جینے پہ مجبور کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ پورا پورا دن کھیتوں کھلیانوں میں محنت کرتے، فصلیں پیدا کرتے اور غذا کے ڈھیر لگاتے لیکن بدلے میں انھیں سوائے روٹی کے کچھ نہ ملتا۔ یہ افراد معاشرہ ایک طرف اپنی ذات سے بیگانہ خود کو زمین داروں کے غلام سمجھتے اور ظلم کو اپنی قسمت تصور کرتے۔ دوسری طرف ماورائی ذات سے رشتہ بھی مضبوط ہوتا چلا گیا اور انسان اپنی ذات سے بیگانہ ہونے لگا۔

مذہب نے انسان کو ایک نظر نہ آنے والی طاقت کے سامنے بے بس اور الگ وجود قرار دیا جس کے سامنے انسان جھک کر اپنے آپ کو اس ذات سے بیگانہ تصور کرنے لگا۔ جس پہ آگے چل کر مختلف نظریات وجود میں آئے۔ نوفلاطونیت کے مطابق جب انسان روح کا اشتراک روح کل کی طرف ہوا تو وہ اپنے اصلی مقام سے گر گیا۔ مادے سے نجات کے لیے وہ کش مکش میں ہے اور روح کل سے جڑنے کے لیے کشمکش میں ہے۔ انسانی عقل کو مذہب پر پرکھنے سے گریز کی راہ اختیار کی جانے لگی اور ثنویت کے خاتمے کے لیے صوفیا نے اسی علیحدگی کو عشق سے موصوم کیا جس سے وہ اس کل سے جڑنا چاہتی ہے۔ ابن عربی نے اسی بیگانگی کو بنیاد بنا کر وحدت الوجود کے حوالے سے پرکھا۔ بعد کے مسلمان فلسفیوں نے بھی انسان اور خدا کی ثنویت کے خاتمے کے لیے انسان کی اس بیگانگی کے حوالے سے خیالات کو پیش کیا۔

فشتے نے کہا کہ جب انسان اپنی فطرت پہ کوئی سرگرمی کرتا تو وہ اس ذات اور فطرت سے خود کو کلی طور پہ الگ کر لیتا ہے۔ اور یوں وہ خود کو اس ذات سے بیگانہ کر چکا ہے۔ فشتے کے بعد ہیگل نے اسی عینیت پرستی کے فلسفے کو وسعت دی کہ روح کل انسان کو خود سے جدا کر لیتی ہے۔ ہیگل کے شاگرد فیورباخ نے ہیگل کے

متضاد تصور پیش کیا۔ اس کے خیال میں مذہب انسان کو خود سے الگ کر کے کسی اور ذات کے سامنے بے بس ٹھہراتا ہے اور وہ اپنی صفات سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ مذہب انسان کا از خود بیگانگی کا باعث ہے اور وہ اپنے آپ سے اپنا غیر تخلیق کرتا ہے۔ ہیگل کے یہاں خیال مطلق اپنے جوہر کو اپنے سے بیگانہ کر کے مظاہر اور انسان کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اس کے برعکس فیور باخ کے یہاں انسان خود اپنے جوہر کو اپنے سے بیگانہ کر کے خدا کی شکل میں دیکھتا ہے۔ اس طرح کے بیگانہ ہونے کے تمام تصورات صوفیانہ انجذاب کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ بعد میں کارل مارکس نے فتشے، ہیگل اور فیور باخ کے نظریات کو بنیاد بنا کر اپنا تصور بیگانگی پیش کیا لیکن یہ واضح رہے کہ مارکس کا تصور بیگانگی ان تمام سے یکسر مختلف اور مادیت پر مبنی ہے اور سماج میں ہونے والے اعمال / محنت سے تعلق رکھتا ہے۔

مارکسزم دور جدید کا ایک ایسا معاشی و سماجی تصور ہے جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمارا واسطہ پڑتا ہے۔ جب ہم سماج میں اپنے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہیں تو ہر طرف نفسا نفسی، نام نہاد مسابقت، ہوس، منافع پرستی، پریشانی اور استحصال دکھائی دیتا ہے۔ ہر شخص زندگی کی دوڑ دھوپ میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ تمام اخلاقی و انسانی اقدار دم توڑ رہی ہیں۔ انسانیت جہاں ایک طرف آئے روز ترقی کی نئی چوٹیاں سر کر رہی ہے وہیں اکثریتی طبقہ زوال کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ معاشرے کا کثیر طبقہ محنت کرتا ہے خون پسینہ ایک کرتا ہے لیکن اس کی زندگی میں تبدیلی برپا نہیں ہوتی بلکہ اس کی اس محنت سے چند افراد معاشرہ عیش کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے میں سماج استحصال کا شکار ہو کر کھوکھلا ہوتا جا رہا ہے۔ افراتفری اور نفسانفسی کے اس عالم میں ہر شخص دوسرے سے اجنبی بن چکا ہے اور اسے اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ یہی اجنبیت کا احساس ہمارے معاشرے کی رگوں میں سرایت کر چکا ہے۔ مارکسی بیگانگی اسے معاشی جبر اور محنت سے جوڑتی ہے۔

مارکسی بیگانگی پر بحث سے قبل ضروری ہے کہ محنت کے حوالے سے مرکزی خیالات سے آگاہی ہو تاکہ مارکسی بیگانگی اور مارکسی نظریات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔ بنیادی طور پر مارکسزم معاشرتی طبقاتی نظام، محنت کش اور سرمایہ دار کے بیچ موجود خلاء کا سائنسی بنیادوں پر تجزیہ کرتا ہے۔ یہ سماج میں ہر چیز کو محنت سے تعبیر کرتا ہے یعنی مارکسی فلسفے میں بنیادی اہمیت ہی محنت کو ہے۔ محنت ہی فطری خام مال کو انسانی تعمیر و ترقی کے لیے قابل استعمال بناتی ہے۔ محنت کے عمل دخل کے بغیر کوئی چیز انسانی زندگی کے لیے کارگر نہیں۔ انسانی محنت ہی زمینی وسائل کو قابل استعمال بناتی ہے لیکن معاشرے کا ایک قلیل طبقہ ان فطری وسائل پہ قبضہ

کر کے کثیر طبقے کو محنت کی چکی میں پیستا رہتا ہے اور ان کی محنت کو نچوڑ لیتا ہے۔ محنت کیا ہے اس کے حوالے سے مارکس سرمایہ میں لکھتا ہے:

> انسانی محنت رگ پٹھوں اور قوت عمل کے خرچ کا نام ہے جس سے انسان تھک جاتا ہے اس اعتبار سے کہ ہر قسم کی محنت انسان کو اعصابی طور پر تھکا دیتی ہے سب محنتیں مساوی ہیں۔ (۸)

یعنی انسان کسی بھی قسم کا عمل کرتا ہے چاہے جسمانی ہو یا دماغی وہ محنت میں شامل ہے اور اسے محنت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ تاہم محنت کی نوعیت میں فرق ہے۔ مارکس نے محنت کو کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے بیان کیا ہے۔ جس کو آسان الفاظ میں جسمانی اور دماغی محنت کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا اور مدعا سمجھنے میں بھی آسانی ہو گی۔

سماج میں نظر دوڑائی جائے تو ہر شخص کی صلاحیتوں میں فرق محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص کی محنت کرنے کی نوعیت دوسرے سے مختلف ہے۔ کوئی ڈاکٹر ہے، کوئی انجینئر ہے، کوئی درزی ہے، کوئی ڈرائیور ہے، کوئی استاد ہے تو کوئی سیاسی رہنما ہے اور کوئی مزدور۔ یعنی محنت کرنے کی صلاحیت اور محنت کو عمل میں لانے کے اعتبار سے انسان ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ کوئی جسمانی محنت سے نتیجہ پیدا کرتا ہے اور کوئی دماغی محنت سے یوں سماج میں محنت کرنے والے اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے ایک دوسرے سے منفرد ہوتے ہیں لیکن ان سب میں مشترک مادہ عمل یعنی محنت کرنے کا ہے۔ وہ چاہے اعصابی محنت کریں یا جسمانی اسی محنت کے اعتبار سے اشیاء کی قدر بھی متعین ہوتی ہے۔ مارکسی بیگانگی بنیادی طور پر محنت کے گرد گھومتی ہے۔

مارکس کے خیال میں جب کسی سماج میں محنت کرنے والے افراد سے ان کی محنت کو اشیا کی صورت میں چھین لیا جاتا ہے تو محنت کرنے والا شخص اپنے ہاتھوں سے پیدا کردہ اشیا سے اجنبیت محسوس کرتا ہے۔ یوں معاشرتی بیگانگی اور طبقاتیت پیدا ہوتی ہے۔ مارکسی بیگانگی کی تفصیلی بحث سے قبل صفدر میر کی رائے ملاحظہ ہو:

> مارکسیت کے ضمن میں "بیگانگی" کا یہ تصور اس طرح مسئلہ بنا کے وجودی فلسفیوں میں سے بعض نے مثلاً سارتر نے اس لفظ کے وجودی معنوں کو مارکس کے اس تصور حقیقت سے جوڑنے کی کوشش کی جس کا اظہار اس نے اپنی ابتدائی تحریروں میں بیگانگی کے لفظ ہی کے ذریعے کیا تھا۔ (۹)

مارکس نے اپنے ابتدائی مضامین وغیرہ میں بیگانگی یعنی(Alienation)کی اصطلاح استعمال کی تھی اور اس کے متعلق اپنا ایک خاص نقطہ نظر پیش کیا تھا۔1844ء میں مارکس نے بیگانگی کے حوالے سے تفصیلی بحث "Economic and Philosophic Manuscripts of1844" کے مضمون "Estranged Labour" میں کی اور یہ واضح کیا کہ سماج میں محنت کا صلہ نہ ملنے سے مزدور میں اجنبیت کا احساس جنم لیتا ہے۔بعد میں "The Holy Family" اور "The German Idelogy" میں بھی اس حوالے سے ذکر کیا۔چوں کہ بیگانگی کا یہ تصور خالصتاً نیا نہیں تھا بلکہ پہلے بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھا۔تاہم مارکس نے انیسویں صدی میں فیورباخ کے تصور بیگانگی جسے وہ مذہب سے جوڑتا ہے سے مختلف مادی بنیادوں پر اس کا تصور پیش کیا۔جسے بعد میں وجودی بھی اپنے یہاں باقاعدہ استعمال کرتے تھے اس بنا پر انہوں نے مارکس کو اپنی برادری میں شامل کرنے کی بھی کوشش کی۔بااین ہمہ مارکس کا نظریہ بیگانگی وجودیوں کے نظریہ بیگانگی سے یکسر مختلف ہے۔مارکس کا نظریہ بیگانگی ہیگل اور فیورباخ کے تصور بیگانگی سے رہنماہی ضرور لیتا ہے لیکن اپنی علیحدہ شناخت قائم کرتا ہے۔

مارکس کے تصور بیگانگی(Alienation) کے مطابق شخصیت کی توڑ پھوڑ تب شروع ہوئی جب گزرے دور میں ملکیتی نظام کا آغاز ہوا،بادشاہت قائم ہوئی،طبقات وجود میں آئے،آقا و غلام،حاکم و محکوم خاص وعام کی حدیں کھینچ گئیں تو معاشرے کی وحدت میں دراڑ آئی۔اس طرح افراد میں تقسیم پیدا ہوئی اسی تقسیم کے نتیجے میں افراد معاشرہ ایک دوسرے سے لاتعلق ہونے لگے اسی لاتعلقی کے تصور کو مارکس نے اپنے فلسفے میں بیان کیا۔مارکس کا مادی تصور / فلسفہ بھی اسی بیگانگی ذات کے گرد گھومتا ہے۔تاہم مارکس نے اسے سرمایہ داری سماج کے حوالے سے بیان کیا ہے۔

انسان کو اس کائنات میں جو چیز دوسرے جانداروں سے منفرد و ممتاز بناتی ہے وہ شعوری عمل اور تخلیق کا عمل ہے۔یعنی انسان صرف کھانے پینے اور تحفظات ہی تک محدود نہیں بلکہ وہ عالم ساز قوت بھی ہے۔ وہ نئی نئی اشیاء تخلیق کرتا ہے مذہب،خاندان،ریاست اور قانون وغیرہ بناتا ہے۔فیکٹریاں مشینیں،آرٹ وغیرہ اس کی تخلیقیت کا مادی اظہار ہیں۔محنت و تخلیقیت ہی کے ذریعے سے انسان نے اپنے اردگرد کے ماحول کو بھی متاثر کیا اور آج رفتہ رفتہ قدرتی ماحول کو بھی اپنی گرفت میں لے رہا ہے۔اس کے باوجود آج جب وہ اپنے اردگرد کا بغور جائزہ لیتا ہے تو وہ اشیاء جن کو اس نے بنایا تھا وہ اسے خود ہی بیگانی نظر آتی ہیں۔وہ جن اشیا کا خالق ہے جن کو اپنے ہاتھوں سے اس نے قابل استعمال بنایا وہ اب اس کی نہیں ہیں۔جس کی بنیادی وجہ معاشرے کا

قائم کردہ نظام ہے۔ جس نے اسے ان چیزوں سے اجنبی بنا کر زندگی کی تگ و دو میں لگا دیا ہے۔ اس تگ و دو کے باوجود جب اسے اس کا پھل نہیں ملتا تو وہ ہر چیز سے بیگانہ ہو جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بیگانگی ذات کا شکار ہو جاتا ہے اور اشیا کی قدر اس کی ذات سے کہیں زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اس حوالے سے مارکس "Economic and Philosophic Manuscripts of 1844" میں لکھتا ہے:

> The worker becomes all the poor the more wealth he produces, the more his production in power and size. The worker becomes an ever cheaper commodity the more commodities he creates. (۱۰)

مارکس نے اس سب کو بیگانگی ذات سے تعبیر کیا ہے۔

> سرمایہ دار معاشرے میں بیگانگی کا نظام ذاتی ملکیت، اکتساب، محنت، سرمایہ، اور زمین کی ایک دوسرے سے جدائی، تبادلہ اور مقابلہ انسان کی قدر اور تخفیف قدر، اجارہ داری اور مسابقت نظام زر پر مشتمل ہوتا ہے۔ (۱۱)

یعنی مزدور جتنی زیادہ دولت پیدا کرتا ہے اس کے سامنے اتنا ہی حقیر ہو جاتا ہے۔ مارکس نے بیگانگی ذات کے چار پہلوؤں کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں۔

(الف) محنت کش کی محنت سے بیگانگی:

محنت کا عمل دخل اور شعوری تخلیقی جوہر تو ہر معاشرے کا خاصا رہا ہے تاہم سرمایہ دارانہ معاشرے میں قائم نظام کا محور محنت کار کی ذات ہے۔ اس وجہ سے مارکس نے دور حاضر کے نظام سے بیگانگی کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مارکسی سوچ کے تحت محنت کار اپنے کام سے جو چیزیں پیدا کرتا ہے وہ ان سے بیگانگی محسوس کرتا ہے اور یہ اس دور کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ یہ دائرہ پھیلتا ہے اور فرد ذاتی جوہر سے بھی بیگانہ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ بیگانگی کی تشریح پیداواری عمل سے کرتا ہے۔ بیگانگی کا یہ پہلو محنت کش سے محنت کرنے کی دلچسپی بھی ختم کر دیتا ہے۔ وہ اپنی مرضی اور خوشی سے کام نہیں کرتا بلکہ پیٹ کا جنم اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ کام میں حصہ لے:

> The Fact that labor is external to the worker,i.e,it does not belong to his intrinsic nature that is in his work,therefore

,he does not affirm himself but denies himself,does not feel content but unhappy,does not develop freely his physical and mental energy but mortifies his body and ruins his mind.The worker only feels himself outside his work,and in his work feels outside himself.His labor is therefore not voluntary,but coerced; it is forced labor. (۱۲)

یعنی

محنت محنت کار کی ذات سے خارج ہو جاتی ہے یعنی وہ اس کے بنیادی وجود کی ملکیت نہیں ہوتی (بلکہ سرمائے کی ملکیت ہوتی ہے) لہذا وہ کام کے دوران میں اپنی ذات کا اقرار نہیں کرتا بلکہ اس کی نفی کرتا ہے۔ وہ آسودگی نہیں بلکہ اداسی محسوس کرتا ہے۔ وہ اپنی جسمانی اور ذہنی توانائی کو آزادانہ فروغ نہیں دیتا بلکہ اپنے جسم کی تحقیر اور دماغ کا زیاں کرتا ہے۔ محنت کار کام سے فراغت پانے کے بعد ہی اپنے آپے میں ہوتا ہے اور کام کے دوران اپنے آپے میں نہیں ہوتا۔ وہ جتنی دیر کام نہیں کرتا چین سے رہتا ہے اور جب کام کرتا ہے تو بے آرامی محسوس کرتا ہے کیونکہ اس کی محنت اپنی مرضی سے نہیں بلکہ جبری ہوتی ہے۔ (۱۳)

مارکس کے نظریہ بیگانگی کی مادی بنیادیں مزدور کی اپنی محنت سے بیگانگی پر ہیں۔ مارکس کے خیال میں مزدور مزدوری کے دوران خوش نہیں ہوتا۔ وہ کام میں بھرپور دلچسپی نہیں لیتا اس کے چہرے سے تھکاوٹ کے آثار واضح ہوتے ہیں لیکن جب وہ کام سے واپس آتا ہے تو وہ خوشی محسوس کرتا ہے تب وہ آزاد ہو جاتا ہے لیکن کام پر جاتے ہوئے اسے ہول اٹھتے ہیں۔ وہ ہر لمحہ گنتی سے گزارتا ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ جب محنت کش کی محنت چند روپے اجرت کے عوض سرمایہ دار کی ملکیت بن جاتی ہے اور اس کی محنت کا استعمال محنت کش کے بجائے سرمایہ دار کرتا ہے۔ اس طرح پیداواری عمل مزدور کے لیے بیگانہ ہو جاتا ہے اور وہ محنت کرنے میں خوشی محسوس نہیں کرتا۔ مزدور کی صلاحیت کے مطابق کام کا نہ ہونا بھی اس کی بیگانگی کا عمل پیدا کرتا ہے۔ وہ اس عمل کو کبھی بھی خوشی سے نہیں کرتا بلکہ جبری طور پر اسے یہ عمل سرانجام دینا پڑتا ہے تاکہ روزگار کے ذریعے زندہ رہ سکے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ وہ جو بھی کام کرے اس میں اس کی اپنی خوشی بھی شامل ہو۔

اگر محنت کار محنت کے عمل میں خوشی سے عمل نہیں کرتا تو اس کی محنت سوائے ذات کی بقا کے اور کوئی نتیجہ خیز چیز پیدا نہیں کر پاتی۔ وہ صرف اس کی ذات کی بقاء کا ایک ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لیے کام کرتے وقت وہ ذات کی نفی کرتا ہے نہ کہ اظہار ذات۔ سرمایہ داری نظام میں ایک محنت کش کی صلاحیتیں نکھرنے کے بجائے برباد ہوتی ہیں۔ وہ خود کو محنت کرنے کی طرف راغب کرنے کے بجائے محنت سے جی چراتا ہے۔ صفدر میر اِس حوالے سے لکھتے ہیں:

> اس کی تخلیقی قوت کا کسی دوسرے کے اختیار میں چلے جانا۔ وہ اپنی آزاد مرضی سے اپنی محنت کے ذرائع، احوال یا نتائج کا تعین نہیں کر سکتا۔ بیگانگی کے اس پہلو کا مطلب ہے اس کی اپنی ذات یا شخصیت سے محرومی۔ (۱۴)

محنت سے بیگانگی کا یہ عمل انتہائی خطرناک نتائج پیدا کرتا ہے مارکس نے اسے بیگانگی ذات کہا ہے۔ محنت کش کسی کام میں دلچسپی اور اپنی صلاحیتوں کو خوشی اور رضا سے استعمال نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ وہ یہ کام زبردستی کر رہا ہے۔ اس کی اس محنت کا نتیجہ اسے صرف اجرت کی صورت میں ملتا ہے ایسی محنت آزادانہ بنیادوں پر جوہر کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ ضرورت پوری کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

> انسان اپنی انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے وہ فقط اپنے حیوانی منصب کے دوران ہی میں آزاد اور خود مختار محسوس کرتا ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور افزائش نسل کے دوران میں یا کسی حد تک اپنے گھر کے اندر لیکن اپنے انسانی منصب یعنی پیداواری عمل کے دوران میں اس کی شخصیت سکڑ جاتی ہے۔ وہ جانور بن جاتا ہے جانور انسان بن جاتا ہے۔ (۱۵)

سرمایہ دارانہ نظام میں محنت کش کی محنت اس کے لئے جینے کا وسیلہ بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ ضرورت کے پیش نظر پیداواری عمل میں شریک تو ہوتا ہے تاہم اس طرح اسے محنت کے عمل سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ محنت کش کی محنت سے یہ بیگانگی معاشرے میں کئی مسائل کی وجہ بنتی ہے۔ بہ نسبت اس کے اگر محنت کش کو اس کی محنت کا برابر صلہ ملے، تخلیقی عمل میں اسے فوقیت دی جائے اور تخلیق کردہ اشیا سے اس کا رشتہ باقی رہے تو وہ کام میں دلچسپی لے گا، اسے کام کرتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں ہو گی۔ وہ جو کام کرے گا وہ اس کی پسند اور صلاحیت کے مطابق ہو گا۔ یوں وہ محنت سے جی چرانے کے بجائے لگن سے محنت کرے گا اور یہ محنت انسانی ترقی میں کارآمد ہو گی۔

(ب) محنت کی پیداوار سے بیگانگی:

محنت کی پیداوار سے بیگانگی سے مراد یہ ہے کہ محنت کش اپنی پیدا کردہ چیزوں سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ جو محنت کرتا ہے اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اشیاء معمولی اجرت کے عوض سرمایہ دار کے قبضے میں چلی جاتی ہیں۔ سرمایہ دار ہی

اس کی قیمت اور قدر کا تعین کرتا ہے۔ وہ اپنی ہی پیدا کردہ اشیاء کو خریدنے کی قوت بھی نہیں رکھتا یوں اس کی محنت اس کی حریف بن کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے۔ محنت کش کی محنت کے نتیجے میں پیداوار کی مقدار حاکمیت اور حلقہ اثر میں اضافہ ہوتا ہے اور محنت کش کے افلاس میں۔ وہ جتنی زیادہ اشیاء پیدا کرتا ہے اتنا ہی بے بس اور مجبور ہوتا جاتا ہے۔ وہ اپنی ہی محنت کے سامنے سستا/کمتر تصور ہونے لگتا ہے۔ اس کی زندگی سستی اور اس کی پیدا کردہ چیزیں مہنگی اور قدر میں اضافہ ہوتا ہے۔ آخر ایک وقت میں وہ محنت ایک حریف کی صورت میں محنت کش سے بیگانہ بن کر الگ وجود کا اظہار کرتی ہے۔ مارکس لکھتا ہے:

> The estrangement inherent in the nature of labor by not considering the direct relationship between the work (labor) and production, It is true that labor produced for the rich wonderful things but for the worker it produces privation,It produce healthy but for the worker, deformit.(۱۶)

یعنی

> محنت کار جتنی محنت صرف کرتا ہے۔ اس کی تخلیق کردہ معروضی دنیا جتنی طاقتور ہوتی جاتی ہے اس کی ذات اس کی باطنی دنیا، اتنی ہی مفلس اور قلاش ہوتی جاتی ہے۔ محنت کار پیداوار میں اپنی جان کھپا دیتا ہے لیکن یہ جان اس کی ملکیت نہیں رہ جاتی بلکہ پیداوار کی ملکیت بن جاتی ہے۔ پیداوار جتنی بڑھتی ہے محنت کار کی معروضی محرومی بھی اتنی ہی بڑھتی ہے جو کچھ اس کی محنت کی پیداوار ہوتی ہے وہ خود نہیں ہوتا لہذا جتنی زیادہ پیداوار ہوتی ہے اتنا ہی وہ کم ہوتا ہے۔(۱۷)

محنت کش کی اپنی پیدا کردہ اشیاء اس کے لیے اجنبی شئے کا روپ دھار لیتی ہیں۔ ایک ایسی چیز کے روپ میں وہ اس کے سامنے آتی ہیں جس پر اس کا کوئی تصرف یا ملکیت نہیں بلکہ اس کے سامنے آزاد خارجی شے کے طور پر۔ اس کی تخلیق کردہ یہ معروضی دنیا اس کے سامنے اتنی ہی زیادہ طاقتور بن کر سامنے آتی ہے۔ جتنی زیادہ وہ محنت کرتا ہے اتنی ہی اس کی باطنی دنیا خالی ہوتی جاتی ہے۔ جتنی زیادہ اور جتنی عظیم اس کی محنت ہو گی وہ اس چیز کے سامنے اتنا ہی کم تر تصور ہو گا۔ محنت کش جتنی زیادہ محنت کرتا ہے اس کے پاس ذاتی استعمال کے لئے اتنا ہی کم ہوتا ہے۔ یعنی وہ جتنی زیادہ قدر پیدا کرے گا اتنی ہی اس کی ذات کی قدر میں کمی ہو گی۔ اشیا خوبصورت

اور وہ بدصورت ہو گا۔ پیداوار جتنی مہذب ہو گی وہ اتنا وحشی دکھائی دے گا۔ جدید دور کی آٹومیٹک صنعت اس کی بہترین مثال ہے جہاں کمپیوٹرائزڈ مشینوں کے آنے سے اوقات کار اور محنت میں کمی کی جگہ اضافہ ہوا ہے۔ جہاں پیداوار بڑھ گئی ہے وہیں مزدور کا استحصال بھی ہوا ہے اور اس کی اپنی تخلیق کردہ دولت میں حصہ کم سے کم ہوتا چلا جارہا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ کام میں یکسانیت اور پھیکے پن کی تکرار نے اس کو مزید متاثر کیا ہے۔

مارکس اس مظہر کی مثال مافوق الفطرت ہستیوں اور مذہب سے دیتا ہے جنہیں انسان نے اپنے ذہن سے تخلیق کیا لیکن ارتقائی عمل کے دوران وہ انسان سے بیگانہ ہو کر آزاد روپ میں نظر آنے لگیں۔ اب انسان ان ہستیوں سے ڈرتا ہے۔ ان کی اپنے اوپر بالادستی تسلیم کرتا ہے۔ آج کے ہمارے معاشرے میں جب ارد گرد نظر دوڑائی جائے تو ایسی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ ایک مزدور نے جو عالیشان مکان تعمیر کیا وہ جب سڑک سے گزرتے ہوئے اسے دیکھتا ہے تو اس کی محنت کی پیداوار اس سے کتنی بیگانی ہوتی ہے۔ وہ خود کو اس کے سامنے کمتر سمجھتا ہے۔ وہ جس نے کوئی مکان بنایا اس کو رہنے کے لئے اپنا مکان نہیں بلکہ وہ محنت کسی دوسرے کی ملکیت کے روپ میں بیگانی چیز کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔

اس عنصر کی بے شمار مثالیں ہیں جیسے موٹر پلانٹ میں کام کرنے والا خود پیدل چلتا ہے اور اس کے ہاتھ کی بنی ہوئی گاڑیاں اس کے لئے اجنبی بن جاتی ہیں۔ خیال رہے کہ مارکس اس پہلو کے تجزیہ میں یہ نکتہ واضح کرتا ہے کہ محنت کش فطرت کے مہیا کردہ خام مال پر محنت کرتا ہے۔ خام مال اس کی محنت کے بغیر کچھ نہیں اور اس کی محنت فطرت کی مہیا کردہ چیزوں کے بغیر کچھ نہیں یعنی دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ اگر خام مال کے اوپر محنت کار محنت نہیں کرے گا تو وہ خام مال خام مال ہی رہے گا۔ اس کو قابل استعمال بنانے کے لیے محنت کش کی محنت درکار ہوتی ہے اور اس محنت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی چیزوں پر پہلا حق بھی اس محنت کش کا ہونا چاہیے نہ کہ کسی سرمایہ دار کا جسے وہ اپنی ملکیت بنالیتا ہے۔ ذاتی ملکیت کے اسی تصور سے طبقاتیت جنم لیتی ہے۔ طبقاتیت بذات خود بیگانگی ہی کی ایک شکل ہے جو انسانوں کو مختلف طبقات میں بانٹ کر ان کے درمیان تفریق پیدا کر دیتی ہے۔

(ج) افراد کی سماج سے بیگانگی:

مارکسی نقطہ نظر کے تحت سرمایہ داری نظام میں انسان اپنی ذات اور محنت کی پیداوار ہی سے بیگانہ نہیں ہوتا بلکہ سماج میں رہنے والے دوسرے انسان بھی اس کے لئے غیر بن جاتے ہیں۔ وہ لاکھوں کروڑوں کے ہجوم میں بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا کہ یہ سب اس کے حریف ہیں۔ یعنی وہ صرف محنت اور محنت کی پیداوار ہی سے خود کو لاتعلق تصور نہیں کرتا بلکہ اس جیسی یہ مخلوق بھی اس کے لیے اجنبی بن جاتی

ہے۔وہ اپنے معاشرے کے لوگوں سے کٹنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ معاشرہ اور اس میں موجود لوگ اسے ختم کرنے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہر شخص اسے اپنا مخالف نظر آتا ہے اور وہ ان سے دوری اختیار کرتا ہے۔مارکس کہتا ہے:

> An immediate consequence of the fact that man is estranged from the product of his labor from his life activity from his species- being, is the arrangement of man from man. When man confronts himself, he confronts the other man. (۱۸)

> محنت کی پیداوار سے بیگانگی کا حیاتی عمل اور نوعی زندگی سے بیگانگی کا براہ راست نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ انسان جب اپنا حریف ہوتا ہے تو وہ لامحالہ طور پر دوسرے انسانوں کا بھی حریف ہوتا ہے۔ (۱۹)

سرمایہ داری معاشرے کی بنیاد غیر عقلی اور ناقابل فہم مسابقت اور مقابلے پر ہے۔ باہمی تعاون معاشرے سے مفقود ہو چکا ہے۔ چنانچہ معاشرے کا ہر فرد نہ نظر آنے والی مسابقت کے عمل کا شکار ہے اور دوسروں کو اپنا حریف تصور کر کے ان سے آگے بڑھنے کے لیے انھیں کچلنے کی سوچ رکھتا ہے۔ ایک محنت کش کی دوسرے محنت کش سے بیگانگی کو سمجھنا تو آسان ہے لیکن اس نظام سرمایہ داریت میں سرمایہ دار اور محنت کش دونوں شامل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرمایہ دار بھی بیگانگیت کا شکار ہوتے ہیں باوجود اس کے کہ وہ اپنی قوت محنت اجرت کے عوض کسی کو بیچتے بھی نہیں؟ اس کا جواب ہاں ہے کیوں کہ سرمایہ دار کی شعوری سرگرمی بھی سرمائے کے نظام کے قوانین کے تابع ہوتی ہے۔ وہ اپنی ذات اور دوسرے انسانوں سے بھی بیگانہ ہی ہوتا ہے تاہم اس کی نوعیت میں فرق ہوتا ہے اور وہ اسے سماجی حقیقت سمجھتا ہے۔ اس لیے بیگانگی کے جو اثرات مزدور کے لیے ہوتے ہیں ویسے ہی اثرات سرمایہ دار کے لیے نہیں ہوتے۔ تاہم وہ سماجی سطح پہ دوسرے انسانوں سے الگ ہی دنیا میں رہ رہے ہوتے ہیں جس کا تصور عام معاشرت میں نظر نہیں آتا۔

سرمایہ داری نظام میں سرمایہ دار اور مزدور بھی ایک دوسرے سے بیگانے ہوتے ہیں۔ مزدور اس لئے بیگانہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی محنت جسے وہ کسی شے میں لگاتا ہے اور وہ کوئی چیز بناتا ہے اجرت کے عوض بیچنے پر مجبور

ہے۔ نہ تو اسے یہ پتہ ہوتا ہے کہ اس کی محنت کس نے خریدی اور اس کی محنت کا مالک کون بنے گا اور نہ سرمایہ دار کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس فیکٹری کا مزدور اس کے لئے محنت کرتا ہے اور اسے ملکیت عطا کرتا ہے وہ کون ہے۔ یعنی مزدور جس فیکٹری میں کام کرتا ہے اس کے مالک اور مالک اپنے مزدور کے لیے اجنبی ہوتا ہے۔

سرمایہ دارنہ معاشرے میں انسانوں کی بیگانگی کی یہ صورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے جیسی مخلوق سے کٹ کر جینے لگتے ہیں۔ انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ سماج میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ انھیں بس اپنی ذات سے ہی مطلب ہوتا ہے باقی ہر کردار ان کے لیے اضافی ہوتا ہے۔ اس جدید معاشرے کا جب بغور تجزیہ کیا جائے تو اس میں شک و شبے کی گنجائش نہیں بچتی کہ آج کے انسان اپنے ہی ہم جنسوں سے بیگانے زندگی کی دوڑ میں مصروف انسانی مقام اور تقاضوں سے کوسراسر بھول چکے ہیں۔ ان کی اس بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ ایک گھر میں رہنے والے افراد بھی اس بیماری کا شکار ہیں۔ وہ اپنے ہی عزیز و اقارب سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور یوں انسانی اقدار اور منصب ان کے لیے محض ایک خیال بن کر رہ جاتا ہے۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

> زندگی کا واحد مقصد روزی، روزگار حاصل کرنا رہ گیا ہے۔ جس دور میں دوسروں کو کہنی مار کر یا دھکا دے کر آگے بڑھنے والے کو کامیاب انسان سمجھا جاتا ہے اور دوسروں کے حقوق اور مفاد کو روند کر ترقی کی چوٹیوں پر پہنچنے والے کی عزت ہوتی ہے۔ ایسے خود غرض ماحول میں انسان اگر تنہائی محسوس نہ کرے اور دوسرے لوگ اس کو اپنا حریف نظر نہ آئیں تو ہمیں حیرت ہوگی۔ (۲۰)

سرمایہ دار معاشرے میں اگر محنت کش کی محنت اس کی اپنی ملکیت نہیں ہوگی اور وہ اس کے لئے حریف بن کر سامنے آئے گی تو اس کا مطلب ہے وہ کسی اور کی ملکیت ہے۔ جہاں تعاون باہمی اور انسانی ہمدردی واخلاقیات کے تحت سماج میں معروضی و حقیقی تعلق قائم ہونا تھا اس کی جگہ بیگانگی اور انفرادیت پسندی نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس کیفیت کا شکار ہر فرد ہے اور معاشرہ کھوکھلا ہو کر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان وجوہات کو تلاش کر کے ایک ایسا سماج قائم کیا جائے جو باہمی تعاون اور انسانی ہمدردی کی صحیح بنیادوں پر قائم ہو۔

(د) نوعی زندگی سے بیگانگی:

متذکرہ بالا تینوں مظاہر سے مارکسی بیگانگی کی ٹھوس حقیقتیں ہیں جو عام فہم دکھائی دیتی ہیں مگر نوعی زندگی سے بیگانگی آسانی سے دکھائی نہیں دیتی۔ نوعی زندگی سے مراد انسان کی تخلیقیت اور فطری صلاحیتیں

اور ذمہ داریاں ہیں۔یعنی انسان اپنی نوع کے اعتبار سے دوسری انواع سے اس لیے مختلف ہے کیوں کہ وہ چیزیں تخلیق کرتا ہے اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی لیکن سرمایہ داری نظام میں نجی ملکیت کی وجہ سے محنت سے بیگانہ ہو کر ایک وقت میں اس نوعی تقاضے سے بھی اجنبی بن جاتا ہے۔

> In estranging from man (1) nature and (2) himself his own active functions, his life activity, estranged labor estranges the species from man...First it estranges the life of the species and individual life, and secondly it makes individual life in its abstracts from the purpose of the species, likewise in its abstracts and estranged form.(۲۱)

انسان اور حیوان کا حیاتی عمل ایک ہی جیسا ہوتا ہے لیکن انسان تخلیقی زندگی کی وجہ سے دوسرے جانداروں سے مختلف ہوتا ہے۔نوع سے مراد انسان کی اپنی داخلی صلاحیتیں اور طبعی میلانات ہیں۔یہ تخلیقی عمل اس کی نوعی زندگی کہلاتا ہے جو اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز حیثیت دیتا ہے۔یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوسرے جاندار تخلیقی عمل نہیں کرتے؟اگر کرتے ہیں تو ان کی نوعیت کیا ہے؟اس کی وضاحت مارکس نے یوں کی ہے:

> The animal is immediately one with its life activity. It does not distinguish itself from it .It is its life activity .Man makes his life activity itself the object of his will and of his consciousness. He has conscious life activity.(۲۲)

یعنی

> حیوان اور اس کا حیاتیاتی عمل ایک ہوتے ہیں۔حیوان اپنے عمل اور اپنی ذات میں فرق نہیں کر سکتا لیکن انسان اپنے حیاتی عمل کو اپنے ارادے اور شعور کا معروضہ بناتا ہے۔اس کا حیاتی عمل شعوری ہوتا ہے۔یہ شعوری حیاتی عمل انسان کو جانوروں کے حیاتی عمل سے ممتاز کر دیتا ہے۔(۲۳)

مارکس نے اس بات کی بھی وضاحت کی کہ بلاشبہ دوسرے جاندار بھی کچھ نہ کچھ پیدا کرتے ہیں لیکن وہ انہی چیزوں کو پیدا کرتے ہیں جو ان کے لیے یا ان کے بچوں کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ یہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں پیدا کرتے ہیں جبکہ انسان اپنی ضرورتوں کے علاوہ بھی اپنی نوع کے دوسرے لوگوں کے لیے آزادانہ طور پر تخلیق کرتا ہے۔ وہ فطرت کو اپنے عمل میں لا کر اپنی محنت سے ایک نیا رخ عطا کرتا ہے مگر اس نظام میں اس کا نوعی عمل درہم برہم ہو چکا ہے۔ وہ انسان جس نے اپنے شعوری عمل سے اجتماعی طور پر انسان ہونے کا اظہار کرنا تھا، اپنے اردگرد کی فطری دنیا کو بدلنا تھا یہ شعور صرف زندہ رہنے کا سہارا بن کر رہ گیا۔ محنت کی کموڈیفکیشن سے پیدا ہونے والی بیگانگی اسے انسان کے جوہر سے بھی بیگانہ کر دیتی ہے۔ اس کی صلاحیتیں آزادی اور خود مختاری جس ماحول میں بروئے کار آنی تھیں وہ سرمایہ داریت کی بھینٹ چڑھ گئیں۔

بیگانگی ذات کی اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مارکس ہوس زر اور حصول زر جو انسان کی زندگی کا مقصد بن چکا ہے کو اس کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ جس سے ذاتی ملکیت کا تصور جنم لیتا ہے اور سرمایہ داریت کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ذاتی ملکیت سے مراد روزمرہ استعمال کی اشیاء نہیں بلکہ وہ راہیں جن سے مزید دولت حاصل کی جا سکے۔ اس لیے وہ ذاتی ملکیت کو ختم کرنے کا تصور دیتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ محنت کش کی اجرت میں اضافے سے بھی مزدور اور سرمایہ دار کے رشتے میں فرق نہیں آئے گا جب تک ذاتی ملکیت کے اس تصور کو ختم نہیں کیا جاتا۔ ذاتی ملکیت کے اس تصور کو ختم کرنے کے لیے مارکس انقلابی جدوجہد کا تصور دیتا ہے۔ جس کے لیے مزدوروں کی ایک جماعت کا قیام ضروری ہے کیونکہ بورژوا طبقہ اب حکمرانی کرنے اور ذرائع پیداوار پر قابض رہنے کا اخلاقی جواز کھو چکا ہے۔ اس لیے دنیا بھر میں موجود کمیونسٹوں کو ایک ہو کر ان کا یہ غلبہ توڑنا ہو گا تاکہ معاشرہ از سر نو تعمیر ہو سکے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مارکس لکھتا ہے:

> کمیونسٹوں کا فوری مقصد وہی ہے جو مزدوروں کی سبھی دوسری پارٹیوں کا ہے یعنی یہ کہ تمام مزدور ایک طبقہ میں متشکل ہوں، بورژوا طبقے کا غلبہ ختم کیا جائے اور پرولتاریہ سیاسی اقتدار پر قبضہ کرے۔ (۲۴)

مارکس مزدوروں کی جماعت کے ذریعے کمیونزم کے نظام کا خواہاں ہے۔ جس کے ذریعے ذاتی ملکیت کا تصور ختم ہو جائے گا اور اس کی جگہ ایک ایسا نظام قائم ہو گا جو باہمی تعاون اور رواداری و بھائی چارے سے انسانی اخلاقیات کی تکمیل کرے گا۔ کیمونزم کے قیام کے بغیر یہ معاشرہ اسی طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار رہے گا اور سرمایہ دار طبقہ عوام کی اکثریتی آبادی کو اپنا غلام بنا کر کیڑے مکوڑوں کی طرح انھیں کچلتا رہے گا۔ کیوں کہ

سرمایہ داریت انسانی فطرت کے خلاف ایک ایسا نظام ہے جو خالصتاً سرمائے کے منافع کے لیے اشیا پیدا کرتا ہے اور منافع در منافع کے لیے سماج کو کھوکھلا کرتا رہتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> کیمونزم ذاتی ملکیت اور بیگانگی ذات کی مثبت تنسیخ ہے مگر ذاتی ملکیت سماجی انقلاب ہی کے ذریعہ منسوخ ہو سکتی ہے۔ خیالی منصوبوں سے منسوخ نہیں ہو سکتی۔ ذاتی ملکیت سے بلند ہونے کے لیے تو کیمونزم کا تصور کافی ہے البتہ ذاتی ملکیت کو حقیقت سے بلند ہونے کے لئے حقیقی کیمونسٹ تحریک ضروری ہے۔ (۲۵)

کارل مارکس نے بیگانگی ذات میں تحقیق و تجزیے کے بعد اس کی وجوہات مادی اور سرمایہ داری نظام کو ٹھہرایا۔ اس نے بیگانگی کا رشتہ نظام زر اور ذاتی ملکیت سے جوڑ کر یہ ثابت کیا کہ اس نظام سے ہی معاشرے میں بیگانگی کی کیفیت جنم لیتی ہے۔ لہذا اس کا حل سوائے کیمونزم کے ممکن نہیں۔

متذکرہ دونوں فلسفوں میں بیگانگی کی نوعیت کے تجزیے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مارکسی اسے خالصتاً خارجی محرکات کی دین تصور کرتے ہیں جب کہ وجودی اسے داخلیت سے جوڑتے ہیں۔ وجودیوں کے خیال میں بیگانگی انسان کی آزادی و انتخاب کے بھرپور طور پر عمل میں نہ آنے کی وجہ سے انسان کی داخل میں پیدا ہونے والی ایک کیفیت ہے۔ وجودی فلسفے کے مطابق جب کوئی شخص کسی غیر معمولی کیفیت سے دوچار ہو کر اپنے داخل میں جھانکتا ہے تو وہ مغائرت، اجنبیت اور بیگانگی کا شکار ہوتا ہے۔ وہ اس کیفیت میں مبتلا دکھائی دیتا ہے کہ اس کی اندرونی فطرت بھی خارجی اشیا سے مطابقت نہیں رکھتی اس سے اس کے داخل میں اضطراب پیدا ہوتا ہے۔

وجودیت سماجی سطح پر ہر طرح کی اخلاقی، مذہبی، معاشرتی اقدار کو رد کرتی ہے۔ اس لیے جب کوئی فرد سماجی اقدار اور قائم کردہ معیارات سے کٹتا ہے تو تنہائی اس کا مقدر بن جاتی ہے اور وہ بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وجودی فلسفے میں تنہائی ایک اہم موضوع ہے۔ ان کے خیال میں انسان اس دنیا میں تنہا ہی آیا ہے اور تنہا ہی اس دنیا سے چلا جاتا ہے اس لیے تنہائی اس کی ناقابل تنسیخ صورتحال ہے۔ اس دنیا میں اس کا کسی دوسرے سے زندہ رہنے کے لیے مادی تعلق تو ہو سکتا ہے لیکن کوئی فطری یا وجودی نہیں۔ صفدر میر کا کہنا ہے:

> مارکس کے تاریخی اور معاشرتی تجزیے کے برعکس وجودیوں کا تجزیہ یہ ہے کہ "بیگانگی" انسان کی فطرت میں شامل ہے اور اس سے کوئی مفر نہیں ہے۔ یہ انسان کی ازلی ابدی

صورت حال ہے جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آسکتی لہذا کشمکش بے سود ہے انسان کی آزادی اس کی زنجیر ہے۔[۲۶]

فلسفہ وجودیت کے یہاں بیگانگی کا احساس انسانی داخل کا نتیجہ ہے جب کہ مارکسی نکتہ نظر کے تحت بیگانگی کا تعلق خالصتاً خارجی محرکات ہوتے ہیں۔وجودی بیگانگی داخل سے خارج کی طرف آتی ہے جب کہ مارکسی بیگانگی خارج سے داخل کی طرف سفر کرتی ہے۔انسان مشینی زندگی گزارتا ہے۔خارجی حالات سے ٹکراتا ہے۔سرمایہ داری نظام میں بندھے ٹکے اصولوں کے تحت محنت کرتا ہے جس سے اس کی ذات اضافی شئے بن جاتی ہے۔وہ جو چیز پیدا کرتا ہے اس سے جذباتی وابستگی قائم کرتا ہے لیکن آج اسے وہ خود سے الگ تصور کرتا ہے۔پیداوار اور اس کے درمیان جو جذباتی وابستگی تھی وہ ختم ہونے سے اس کے لیے وہ چیز بے معنی ہو جاتی ہے۔پیداوار سے محنت کش کا رشتہ تخلیقیت ختم ہو جاتا ہے اور وہ چیز کسی سرمایہ دار کی کمپنی کے نام سے الگ اپنی شناخت کے طور پر وجود میں آتی ہے۔

فلسفہ وجودیت ہر لحاظ سے انفرادیت اور آزادی کی بات کرتا ہے جبکہ فلسفہ اشتراکیت میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت کو بنیاد بنایا جاتا ہے۔ آزادی کا تصور مارکسزم میں بھی موجود ہے لیکن اس کی نوعیت وجودیت سے قطعی مختلف ہے۔مارکسی فلسفے میں آزادی سے مراد معاشرتی سطح پر معاشی لحاظ سے اور صلاحیتوں کے مطابق عمل کے انتخاب میں ہر فرد کو آزادی حاصل ہونی چاہیے۔ساتھ ہی ساتھ ہم جنسوں کے ساتھ تعلق جبری کے بجائے آزادنہ تعاون باہمی پہ ہو۔وہ اپنی مرضی اور صلاحیت کے مطابق کسی بھی طرح کی محنت کرنے میں بااختیار ہو،وہ سماجی سطح پر کسی طبقے کے زیر اثر جینے کے بجائے مجموعی انسانی ترقی کے لیے آزادانہ طور پر کردار ادا کرنے کے لیے آزاد ہو۔اسی طرح مارکسی فلسفے میں انفرادیت کی کوئی جگہ نہیں۔اسی لیے یہ وجودیت سے خود کو ممتاز حیثیت دیتی ہے۔جب کہ وجودیت میں انفرادیت انسان کا بنیادی حق تصور کیا جاتا ہے اور خارجی واجتماعی عوامل کو یکسر رد کیا جاتا ہے۔شاہین مفتی لکھتے ہیں:

> سارتر اور مارکسیوں میں ایک اختلاف ہے۔سارتر ہر طرح سے انسان کی کامل موضوعیت کا قائل ہے اور اسے ہر طرح قائل اور خود مختار سمجھتا ہے،مارکسی معاشی جبر کے قائل ہیں اور انسان کو تاریخی جدلیات کے سامنے مجبور سمجھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ محنت کشوں کو صاحب اقتدار ہونے کے لئے اس جبر سے گزرنا ہی ہے۔سارتر

جبر کو سائنس کی یادگار سمجھتا ہے اور اسے رد کرتا ہے۔مارکسی فرد کو اعمال کی کامل آزادی دینے کے حق میں نہیں۔(۲۷)

بنیادی طور پر بیگانگی کا عمل دونوں فلسفوں میں موجود ہے تاہم ان کی نوعیت میں فرق ہے۔مارکس نے سماج میں فرد کی بیگانگی کی مادی وجوہات تلاش کیں اور بتایا کہ ایک انسان سماج میں کیوں کر دوسرے انسانوں اور اپنی ذات تک سے بیگانہ ہو جاتا ہے؟وہ کون سے عوامل ہوتے ہیں جو انسان کو بیگانگی کی طرف دھکیلتے ہیں؟اس پہ مارکس نے سیر حاصل جوابات اپنے فکر کے تحت سرمایہ داری نظام،محنت کے استحصال اور طبقاتیت کو ٹھہرایا۔انسان کی سماج میں مایوسی،پریشانی،دکھ،مغائرت اور ناامیدی کی کیفیات کو خارجی اسباب فراہم کیے۔اسے معروضی اور عقلی تصوارت دیے جب کہ وجودیوں نے اسے کلیتا داخلیت اور موضوعیت کی پیدوار کہا۔ایک نے انفرادی اور فطری آزادی کی بات کی تو دوسرے نے سماجی آزادی کی۔ایک انفرادیت کی بات کرتا ہے تو دوسرا اجتماعیت کی،ایک سماج کی بات کرتا ہے اور دوسرا سماج کو اضافی تصور کرتا ہے۔ایک خارجی محرکات اور دوسرا داخلی اسباب کو بیگانگی کی وجہ تصور کرتا ہے۔یہ تصور بیگانگی دونوں فلسفوں میں بنیادی اہمیت کے حامل ہیں لیکن ایک دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔

یوں یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں فلسفے ایک دوسرے کے حریف کے طور پر سامنے آتے ہیں۔بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ فلسفہ وجودیت تو خالصتاً مادی نکتہ نظر کے خلاف باقاعدہ طور پر رائج کیا گیا ہے تاکہ اس افراتفری کے شکار معاشرے میں مایوسی،تنہائی،کرب اور دکھ میں گھیرے افراد کو ایک سہارہ فراہم کیا جاسکے۔یوں ان میں واضح اختلاف پیدا ہو جاتا ہے۔

مارکسی بیگانگی اور طبقاتی کشمکش:

مارکسی فلسفے کی بنیاد سماج میں موجود طبقات پر ہے۔مارکس نے اپنے فلسفے کا خمیر سماجی طبقات اور بیگانگی سے اٹھایا۔مارکس کے خیال میں انسانی تاریخ بذات خود طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے اور سماج میں موجود ہر قسم کے مسائل کے پسِ پردہ یہی طبقاتی نظام کارفرما ہے۔طبقات طبقہ کی جمع ہے طبقہ لوگوں کے ایک ایسے گروہ کو کہا جاتا ہے جو عمر یا منصب وغیرہ یا کسی دوسری وجہ سے ایک دوسرے کے ہم پلہ یا قریب ہوں۔جیسے دو طالب علم ایک ہی استاد سے سیکھتے ہیں تو انہیں ایک ہی طبقے میں شمار کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ سماج میں طبقات کا وجود اس وقت ظاہر ہوا جب شروع میں انسان نے زمین کے کسی خاص ٹکڑے کو کاشت کیا اور دعوی کیا کہ یہ ٹکڑا میرا ہے۔زمین کا یہ ٹکڑا جب اس کی ملکیت بنا تو

طبقے وجود میں آئے۔ ایک وہ طبقہ جس کے پاس اپنی زمین موجود تھی اور دوسرا وہ طبقہ جس کے پاس اپنی ملکیت موجود نہ تھی بلکہ وہ دوسروں کی زمین پر کام کرتا تھا۔ یوں یہ سلسلہ شروع ہوا اور ہر آنے والے ہر سماج میں تعلقات پیدا ہونے کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ ہمارا آج کا معاشرہ سماجی طبقاتی نظام پر مبنی سرمایہ داریت کا حامل ہے۔ اب تک جتنی بھی سماجی تنظیموں کا اظہار ہوا ہے ان میں ابتدائی دور کے اشتراکی معاشرے کو چھوڑ کر سبھی معاشرے طبقاتی نظام پر مبنی ہیں۔

مارکس کے نظریہ بیگانگی اور طبقاتی کشمکش کے حوالے سے صفدر میر نے مارکسی فلسفے کی بنیاد کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح سے مارکس نے بیگانگی سے ہی اپنے فلسفے کو مرتب کیا۔ اس حوالے سے انہوں نے ریفریڈ دیسان کے قول کو بطور حوالہ شامل کیا" داس کیپیٹل مارکس کے بنیادی تصور بیگانگی کے تجزیہ کے سوا کچھ نہیں۔[۲۸]

مارکس کا تصور بیگانگی اور طبقاتیت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ متذکرہ بالا اقتباس رہنمائی کرتا ہے کہ مارکس نے جب سماج میں موجود انسانوں کو ایک دوسرے سے اجنبی اور بیگانہ پایا تو اس نے اس کی وجہ کی طرف غور و فکر کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ طبقاتی تقسیم ہونے کی وجہ سے انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے لاتعلقی اور اجنبیت اختیار کئے ہوئے ایک دوسرے کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں ہے:

> تمام سماجوں کی آج تک کی تاریخ طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ آزاد اور غلام، پتریشین اور پلے بین، جاگیر دار آقا اور ذراعی غلام، گلڈ ماسٹر اور کاریگر غرضیکہ جابر اور مجبور تسلسل کے ساتھ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہیں، کبھی کھلے بندوں اور کبھی پس پردہ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہے اور ہر بار اس لڑائی کا یہ انجام ہوا کہ یا تو نئے سماج کی انقلابی تعمیر ہوئی ہے یا پھر لڑنے والے طبقے ایک ساتھ ہی تباہ ہو گئے۔[۲۹]

جب سماج میں طبقات بن گئے تو پھر مجبوراً ذرائع پیداوار سے محروم لوگ ذرائع پیداوار کے مالک لوگوں کے لیے کام کرنے لگے۔ وہ ذرائع پیداوار جن پر ان کی ملکیت نہیں بلکہ محنت کر کے جو کچھ پیدا کرتے ہیں اس میں سے تھوڑا سا حصہ اپنے زندہ رہنے کے لیے اور باقی مالک کو دینے کا رواج بنا۔ اس طرح لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا ذرائع پیداوار کے مالکوں نے اس لوٹ کھسوٹ کو جاری رکھنے کے لیے جبر و تشدد اور ظلم و ناانصافی سے کام لیا۔ ابتدا میں یہ استحصال اتنا زیادہ تو نہیں تھا تاہم وقت کے

گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس ظلم سے ستائے ہوئے طبقے اور ذرائع پیداوار کے مالک کے درمیان کشمکش بھی جاری رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ طبقات زرعی سماج سے نکل کر سرمایہ داری سماج میں داخل ہو گئے اور طبقاتی استحصال کی شکل پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔ آج کا سماج سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے جو کم و بیش پچھلے تین سو سال سے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔

سرمایہ داری نظام تاریخی اعتبار سے طبقاتی کشمکش میں اضافے کا باعث بنا۔ زرعی دور میں بھی یہ کشمکش آقا اور غلام، جاگیر دار اور مزارع، بادشاہ اور رعایا کے درمیان موجود تھی تاہم اس کی نوعیت اور استحصال میں واضح فرق تھا۔ سرمایہ داری نظام نے جہاں تمام قسم کی سابقہ رجعت پرستی کا خاتمہ کیا تو استحصال کے نئے ہتھکنڈے بھی اپنائے۔ اس نے جاگیر داری، قبائلی اور دیہاتی تعلقات کو چوٹ پہنچائی اور انسانی تعلقات کو آنے اور پائی میں بدل کر ریاکاری اور مکر سے بھری تجارت کی آزادی دی۔ اس نظام نے سماج میں موجود پیشوں کی عظمت کو بھی خوب ٹھیس پہنچائی۔

سماج میں طبقات کی وجہ سے مالک اور مزدور کا جو تصور پیدا ہوا اس سے مزدور کے استحصال میں پہلے سے کہیں گنا اضافہ بھی ہوا جس سے سماج میں طبقاتی کشمکش میں بھی اضافہ ہوا۔ مارکسی فلسفے کے مطابق طبقاتی کشمکش انسانی معاشرے کی تاریخ میں معاشروں کے تغیر و تبدل اور ارتقا کا قانون رہی۔ تاریخی لحاظ سے اس غلط فہمی کو پھیلایا گیا کہ تاریخ بادشاہ، سپہ سالار اور عظیم لوگ بناتے رہے بلاشبہ اس میں ان کا بھی کردار ہے۔ تاہم اس کے پیچھے بھی وجہ طبقاتی کشمکش ہی ہے جو انہیں ایسا کردار ادا کرنے پر مجبور کرتی رہی۔ چوں کہ ذرائع پیداوار سے محروم طبقہ محنت کے بدلے میں صرف اتنا حاصل کر پاتا ہے جس سے وہ اپنی روح اور جسم کا تعلق قائم رکھ سکے۔ اس لیے فطری طور پر ان طبقات میں نفرت اور رد عمل کی کیفیت پیدا ہوتی ہے جو کہ طبقاتی کشمکش کی راہ ہموار کرتی ہے۔

سماجی ارتقا کا محرک طبقاتی کشمکش ہوتی ہے جو ذرائع پیداوار کے مالک اور محروم طبقوں کے درمیان ہوتی ہے۔ یہ دونوں طبقے فطری لحاظ سے ایک دوسرے کے حریف بھی ہوتے ہیں۔ یوں ان کے درمیان یہ کشمکش ہمیشہ سے جاری رہتی ہے جو سماج میں تبدیلی کی وجہ ثابت ہوتی ہے۔ آج جس نظام میں انسان زندگی بسر کر رہے ہیں یہ نیم جاگیر داری اور سرمایہ دارانہ نظام ہے جس نے سماجی تعلقات کی نوعیت میں مزید اضافہ کیا۔ استحصال کے بڑھنے کی وجہ سے سماج میں انسان ایک دوسرے سے لاتعلق اور اجنبی دکھائی دیتے ہیں۔ سماجی رشتے کھوکھلے ہو رہے ہیں۔ افراد معاشرہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کو اپنے لئے حریف تصور کرتے

ہیں۔ محنت کے استحصال کی وجہ سے سماج میں بیگانگی ذات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مزدور گھنٹوں محنت کرتا ہے لیکن اس کی حالت زار میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کی معاشی حالت ابتر ہو رہی ہے۔ اسی لیے اس کا محنت میں جی نہیں لگتا اور کام کرنے میں ذرا بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوتی۔

دور جدید صنعتی دور ہے جس نے انسانیت کی ترقی کو ایک جست کی صورت میں آگے تک پھیلا دیا ہے۔ جس ترقی کے مینار کو انسان نے ہزاروں سال کی مسلسل جدوجہد کے بعد حاصل کیا اسی سے سرمایہ داریت نے جنم لیا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مشین کی ایجاد سے مجموعی انسانیت ترقی کی منازل سے ہمکنار ہوتے ہوئے زندگی کے ان مادی مسائل سے چھٹکارا حاصل کرتی۔ لیکن اس کے باوجود آج کا انسان دو وقت کی روٹی کے لئے مجبور اور لاچار ہے وہ اپنا پیٹ بھرنے کے سوا انسانی نوعی تقاضے کو پورا کرنے میں بری طرح سے ناکام ہو چکا ہے۔ وہ اعلی تعلیم، اچھے معیار، صحت، اچھی خوراک اور رہائش کے لیے اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیتا ہے لیکن کوئی خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوتی۔ ایسے میں اقدار، روایات اور اپنے جیسے انسانوں سے خود کو الگ تصور کرنے لگتا ہے اور دولت پیدا کرنے والی ایک مشین بن کر رہ جاتا ہے۔

جب اسے اس صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ مایوسی ناامیدی اور کرب سے دوچار ہوتا ہے۔ اس کا دل محنت سے اچاٹ ہو جاتا ہے اور ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ ہر شے سے کنارہ کشی کر لیتا ہے۔ یوں اس کے لیے سماج، اشیاء اور اس میں موجود نظام زندگی بے معنی اور اجنبی ہو جاتا ہے۔ یہ سب آج کے جدید صنعتی معاشرے میں ہو رہا ہے یہی وجہ ہے کہ آج ہر انسان دوسرے انسان اور اپنی ذات تک سے بیگانہ ہو چکا ہے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مصنفین لکھتے ہیں:

> مشینوں کے وسیع استعمال اور محنت کی تقسیم کار کی وجہ سے مزدوروں کا کام اپنی تمام انفرادی خصوصیت کھو چکا ہے اور اسی وجہ سے مزدور کے لیے اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی وہ مشین کا دم چھلا بن کر رہ گیا ہے۔ (۳۰)

آج کے اس سرمایہ داری معاشرے میں طبقاتی نظام نے انسان کو انسانیت سے بیگانہ کر کے صرف کام کرنے والی مشین بنا دیا ہے جس سے انسان اپنے انسانی نوعی تقاضوں کی تکمیل کرنے اور کائنات کے رازوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بجائے زندگی کی مادی ضروریات کو پورا کرنے میں مصروف ہے۔

سرمایہ داری معاشرے نے سابقہ معاشروں کی رجعت پرستانہ روایات کا خاتمہ کرتے ہوئے انسانیت کو ایک نئے دور سے آشنا ضرور کیا مگر اس کی بنیاد طبقات پر کھڑی ہے۔ سرمایہ داری نظام کی بقا اور قیام کی واحد

صورت یہی ہے کہ اس میں طبقات کا یہ سلسلہ چلتا رہے۔ اس نے سماج میں دو بڑے گروہ (بورژوا اور پرولتاریہ) پیدا کیے۔ یعنی سرمایہ دار اور مزدور۔ یہ سماج کے دو بڑے طبقے ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں اسی بنا پر یہ ہمیشہ برسرپیکار بھی رہتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقہ ذرائع پیداوار اور ریاستی اقتدار پر قابض ہوتا ہے جس سے ریاستی ادارے بھی انھیں کے مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔ یہ آپسی اختلافات کا شکار بھی ہوتے ہیں لیکن بحیثیت ایک سرمایہ دار طبقے کے یہ مزدور طبقے کے مقابلے میں متحد و یک جان ہوتے ہیں اور اپنے خلاف ہر قسم کی تحریک کو کچلنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہوتے ہیں۔ طبقات میں چونکہ جنگ ہونا ایک فطری عمل ہے اس لیے یہ اپنے تحفظ کے لیے اٹھنے والی ہر آواز کو طاقت میں ہونے کی وجہ سے دبا دیتے ہیں۔

سرمایہ دار طبقہ کے مقابلے میں دوسرا طبقہ محنت کش ہے جو ان کے ذرائع پیداوار پر محنت کر کے دن رات ان کی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ خود محض اپنی بنیادی ضروریات کو پورا کرتا ہے تاکہ زندہ رہ سکے۔ سہولیات حاصل کرنا یا ان سے استفادہ کرنا محض ایک خواب ہوتا ہے۔ اس طبقے میں لڑنے کی خواہش ہوتی ہے یہ طبقہ ہمیشہ معاشرتی انقلاب برپا کرنے کی جدوجہد کرتا ہے۔ ایسی محنت جس کے نتیجے میں انہیں صرف پیٹ کا جہنم بھرنا ہی نصیب ہو اس ظالمانہ استحصالی نظام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ اس وجہ سے ان دونوں طبقات کے درمیان چپقلش بھی جاری رہتی ہے۔

چپقلش کے نتیجے میں وہ سماج میں بڑی تبدیلی کے خواہاں ہوتے ہیں لیکن انہیں اپنی جدوجہد کے دوران میں سرمایہ داروں کی طرف سے سخت رد عمل کا سامنا ہونے کے ساتھ ساتھ متوسط طبقے جسے مارکس پیٹی بورژوا کہتا ہے سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ یہ طبقہ کم تعداد میں ہوتا ہے جو اس مروجہ نظام سے تقریباً خوش ہوتا ہے اور وہ بھی سرمایہ دار طبقے میں شامل ہونے کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ طبقہ انسانی تقاضوں سے بے پرواہ ہوتا ہے کہ سماج کو کس سمت میں تبدیل کرنا ہے۔ یہ اپنے سے نچلے طبقے سے نفرت بھی کرتا ہے اور اس کی حالت پہ ہنستا بھی ہے۔ اس کے پیش نظر صرف اور صرف دولت کما کر سرمایہ دار طبقے میں شامل ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔

متوسط طبقہ بھی دن رات محنت کرتا ہے اور بنیادی سہولیات زندگی سے کسی حد تک مطمئن ہوتا ہے لیکن یہ انسانی تقاضوں سے یکسر بے خبر ہوتا ہے جسے مارکس نے بیگانگی سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے باوجود اس طبقاتی کشمکش میں یہ متوسط طبقہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس میں کچھ ایسے افراد بھی موجود ہوتے ہیں جو معاشرے کا تجزیہ کر کے ان مزدوروں کے لیے لیڈرشپ کا کردار ادا کرتے ہیں۔ کیونکہ مزدور محنت کے

استحصال کے نتیجے میں سخت رد عمل کے لیے متحد ہو کر لڑ رہے ہوتے ہیں جس کے لیے انہیں اس طبقے کی حمایت کا حاصل ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اس طبقے کے کچھ افراد سے مل کر انقلابی جدوجہد کرتے ہیں جس کے نتیجے میں سماجی تبدیلی رونما ہوتی ہے۔

سرمایہ داری نظام نے انسان کی شخصیت کو بالکل ہی کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس کھوکھلے پن کے نتیجے میں سماج میں تقسیم در تقسیم ہوتی چلی جارہی ہے جس سے سماجی بیگانگی کی جڑیں مضبوط ہو رہی ہیں اور سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے۔ نتیجتاً فطری طور پر کشمکش میں بھی اضافہ ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ سرمایہ داری نظام نے سماج کو مجموعی طور پر انارکی کی کیفیت میں مبتلا کر رکھا ہے۔ اس بحرانی کیفیت میں مزدور اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو چند پیسوں کے عوض بیچنے کے لیے مجبور ہے۔ اس طرح سرمایہ دار استحصال کرتے ہوئے سماج میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی قبر کھودنے لگتا ہے۔ وہ جس طرح محنت کش کی محنت کا استحصال کرتا ہے اس کے خلاف بغاوت زور پکڑتی جاتی ہے جس کے نتیجے میں سماج میں ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ مارکس نے آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے یہ اظہار کیا تھا کہ سماج میں ارتقا اسی چپقلش کی بنیاد پر ہوتا آرہا ہے اور جدید سرمایہ دارانہ معاشرہ بھی جس نے ایک طرف ترقی کی منازل سر کیں وہیں اپنے لئے قبر بھی کھودی ہے جس میں جلد ہی یہ خود کو دفن کرلے گا۔ کیمونسٹ مینی فیسٹو میں لکھتے ہیں:

> بورژوا طبقے کے وجود اور اقتدار کی لازمی شرط یہ ہے کہ سرمایہ دار برابر وجود میں آتا اور بڑھتا رہے۔ سرمائے کے وجود کے لئے اجرتی محنت لازمی شرط ہے اجرتی محنت کا بھی تمام تر انحصار محض مزدوروں کے آپس کے مقابلے پر ہے، صنعت کی ترقی سے جس کو بورژوا طبقے کے ہاتھوں بلا ارادہ فروغ ہوتا ہے اس سے مزدوروں کی ایک دوسرے سے علیحدگی دور ہوتی ہے جو باہمی مقابلے کا نتیجہ تھی اور اس کے بجائے ایک ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ان میں انقلابی ایکتا پیدا ہونے لگتی ہے۔ غرضیکہ جدید صنعت کی ترقی سے وہ بنیاد ہی غارت ہو جاتی ہے جس پر بورژوا طبقہ مال پیدا کرتا ہے اور تصرف میں لاتا ہے۔ لہذا بورژوا طبقے نے سب سے بڑھ کر جن کو پیدا کیا وہ اس کی اپنی قبر کھودنے والے ہیں اس کا زوال اور پرولتاریہ کی فتح لابدی ہے۔ (۳۱)

ظلم جب بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے کہ مصداق مزدوروں کا استحصال انھیں سرمایہ دار طبقے کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے یوں یہ طبقات ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو جاتے ہیں۔ مزدور طبقہ جو علیحدہ علیحدہ اپنا

استحصال کراتا ہے ایک مٹھی کی مانند ہو جاتا ہے۔ پھر یہی مزدور طبقہ یا زرعی عہد کا مزارع و غلام اپنے آقاؤں کی جڑوں میں دراڑیں ڈالتا ہے۔ آج بھی اس سرمایہ داری نظام کی جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں یہ علی الاعلان اپنی بربادی کا جشن زور و شور سے منا رہا ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والے استحصال نے اس نظام کی تمام صورتیں اور حقائق کے پول کھول کر رکھ دیے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا کا ایک بڑا طبقہ سرمایہ داری نظام کے دوغلے پن سے جس نے ہر ایک کی ترقی کا نعرہ مستانہ بلند کیا متاثر ہو کر مایوس ہو چکا ہے۔ اس مایوسی سے اس کے اندر انتشار پیدا ہو رہا ہے جو کسی بڑی سماجی تبدیلی کی نشاندہی کرتا ہے جس کی بابت مارکس نے واضح کیا کہ یہ سب مزدور انقلاب کی جدوجہد سے ممکن ہو گا اور یہ نظام اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارے گا۔

آج جب ہم اپنے سماج میں موجود انسانوں کی زندگیوں کا مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ پتہ چلتا ہے کہ ہر شخص اس نظام سے ناخوش ہے وہ ہر روز کئی گھنٹوں کی محنت کے باوجود اپنی مادی ضروریات سے باہر نہیں نکل پا رہا۔ دوسری جانب ان کی محنت پر قابض لوگ خواہش کی بلند و بالا عمارتیں قائم کر رہے ہیں۔ وہ اپنی محنت سے بیگانے اس نظام کی تعمیر میں جو حصہ ڈال رہے ہیں اس سے اب انہیں واقفیت حاصل ہو رہی ہے جس سے اندرونی طور پر نظام میں خلفشار پیدا ہو رہا ہے۔ اسی خلفشار کو انقلاب سے موسوم کیا جاتا ہے اور بیگانگی کا واحد حل کیمونسٹ انقلاب ہی ہے۔ اگر آج اس بیگانگی سے چھٹکارا پانا ہے اور سماج کو نئی بنیادوں پر قائم کرنا ہے تو اس کے لئے اس سرمایہ داری نظام کے خلاف ہم آہنگ جدوجہد کی ضرورت ہے جو انسانیت کو نئے مستقبل سے روشناس کروا سکتی ہے۔ مارکس نے ذاتی ملکیت کے خاتمے کو اس کے لیے ضروری تصور کیا ہے یعنی جب ذاتی ملکیت کا تصور ختم ہو جائے گا تو بیگانگی کی یہ صورت حال خود بخود ختم ہو جائے گی اور کشمکش کے بجائے سماج باہمی تعاون میں بدل جائے گا۔ اس حوالے سے سبط حسن لکھتے ہیں:

> مارکس نے پہلے سرمایہ داری معیشت میں بیگانگی ذات کے مختلف عوامل و مظاہر کی نشاندہی کی پھر ان کا رشتہ ذاتی ملکیت اور نظام زر سے جوڑا اور بتایا کہ انسان کی شخصیت اور تخلیقی صلاحیت اس کے فکر و عمل اس کے اخلاق و احساسات پر ان کا کتنا مہلک اثر پڑتا ہے اور تب ان سے یہ منطقی نتیجہ نکالا کہ سماجی انقلاب لائے بغیر اور کمیونسٹ معاشرہ قائم کیے بغیر انسان کی مادی اور روحانی نجات نہیں ہو سکتی۔ تحصیل ذات کی لازمی شرط شخصیت کی مکمل آزادی ہے۔۔۔ شخصیت کی مکمل آزادی اور خود مختاری

کیمونزم ہی کے دور میں ممکن ہے لہٰذا تحصیل ذات حقیقی معنی میں کیمونزم کے دور میں
سرانجام پاسکتی ہے۔ (۳۸)

مارکس کے نزدیک بیگانگی منطقی طور پر طبقات کی پیداوار ہے اور طبقات ذرائع پیداوار پر قابض ہونے اور ذاتی ملکیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ بلاشبہ سرمایہ داریت سے قبل بھی بیگانگی ذات کے عناصر ملتے ہیں تاہم ان کی نوعیت آج کے دور سے قطعی مختلف ہے۔ آج کا انسان جس بیگانگی ذات کا شکار ہے وہ خالصتاً سرمایہ داری نظام کی دین ہے اور اس کا واحد حل کیمونزم ہے جو طبقاتی جدوجہد کے نتیجے میں برپا ہو گا اور انسان ان مسائل سے نکل کر نوعی تقاضوں اور کائنات کے اسرار و رموز سے واقف ہو گا۔ یہ سرمایہ داری نظام بذات خود طبقاتی کشمکش کو پیدا کرتا ہے اور اسی کے ہاتھوں خود کو دفن بھی کرے گا یوں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مارکس بیگانگی کو خالص مادی مسائل سے جوڑتا ہے اور ان کا حل طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں کیمونزم کی صورت میں نکلے گا۔

مارکسی بیگانگی کے پیداواری رشتوں پر اثرات:

پیداواری رشتے مادی حالات کی دین ہوتے ہیں۔ کسی بھی سماج میں موجود مادی حالات نئے نئے پیداواری رشتوں کا تعین کرتے ہیں جس سے سماج کے رخ کا تعین ہوتا ہے۔ جس طرح کے مادی حالات ہوں گے اسی کے مطابق سماجی رشتے بھی قائم ہوں گے۔ انسانی تاریخ مختلف ادوار سے گزر کر آج جس مقام پر ہے یہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی بلکہ دور کے تقاضوں کے مطابق مادی حالات نے پیداوار کے رشتوں کا تعین کیا اور ایک عرصے بعد یہ سماجی رشتے تبدیل ہو کر کسی نئے روپ کو دھار کر سماج میں داخل ہوئے۔ مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ پیداواری رشتے جن ادوار سے گزرے ان میں دو طبقے وجود میں آتے رہے ہیں ایک ظالم اور دوسرا مظلوم طبقہ۔

ابتدائی دور جس میں انسان مل جل کر زندگی بسر کرتے تھے پھر اس میں طبقات وجود میں آئے۔ مارکس کے خیال میں یہ تاریخ چار ادوار پر مشتمل ہے۔ زمانہ قدیم میں دولت کی پیداوار اور تقسیم اشتمالی طور طریقوں سے ہوتی تھی جسے اشتمالی دور کہا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب انسان نے زمین پر چلنے پھرنے کا آغاز کیا اور خونی درندوں وغیرہ سے لڑنے کے لئے اس کے پاس چھڑی اور پتھر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اسے اپنے آپ کو بچانے اور تحفظ دینے کے لیے ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت تھی۔ پھر انسان نے تیر و کمان ایجاد کر لیے اور شکار وغیرہ کے ذریعے سے مشترکہ طور پر فائدہ اٹھاتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں نے اوزار

بنانے میں بھی مہارت حاصل کی اور شکار کے جانوروں کو زندہ پکڑنا بھی سیکھ لیا۔ ان جانوروں کو سدھا کر زمین سے پیداوار حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا۔ یہیں سے مادی حالات نے پیداواری رشتوں اور تعلقات کی بنیاد ڈالی۔ پیداواری رشتے جو پہلے کسی خاص شکل میں واضح نہیں تھے یا اپنا وجود نہ رکھتے تھے، مادی حالات تبدیل ہوئے تو پیداواری قوتوں میں آہستہ آہستہ تبدیلی رونما ہوئی جس سے پیداوار کے نئے طریقے بھی وضح ہوئے۔ پیداواری رشتوں کو سمجھنے کے لئے عاصم اخوند لکھتے ہیں:

> پیداواری قوت سے مراد انسان، محنت کے اوزار اور فطرت سے انسانی محنت کا عمل ہے۔ دوسرے لفظوں میں ان تینوں کی اکائی کو پیداواری قوت کہتے ہیں اور محنت کے اس عمل کے دوران انسان آپس میں جو تعلقات قائم کرتے ہیں وہ پیداواری رشتے کہلاتے ہیں۔ ان دونوں کے اجتماع کو "پیداوار کا دستور" یا طریقہ کار کہتے ہیں۔ (۳۳)

پیداوار کا طریقہ کار ہر سماج کا بنیادی ڈھانچہ تصور کیا جاتا ہے اور یہ طریقہ کار سماج کی سمت کا تعین بھی کرتا ہے۔ پیداوار کے دستور میں پیداواری قوت کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے یعنی فطرت کے ساتھ انسان کے تعلق کی اور اسی مطابقت سے جلد یا بدیر پیداواری رشتے تبدیل ہوتے ہیں۔

چوں کہ انسان اب قدیم اشتمالی دور سے نکل کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اسی دور میں آقا و غلام کا تصور پیدا ہونے لگا تھا جو قبائل زرعی دور میں داخل ہونے سے قبل مختلف قسم کے اوزار اور برتن بنانے میں ماہر ہو چکے تھے۔ ان لوگوں کو جو کسی طرح سے کمزور تھے انہیں اپنا غلام بنانے لگے۔ یہ غلام داری سماج تھا تاہم زرعی و غلام داری سماج کی کم و بیش اکٹھی ہی بنیاد پڑی۔ پھر ان لوگوں نے اپنے غلاموں کو شکار کرنے اور زمین پر کام کرنے کے لیے لگا دیا یوں پہلی مرتبہ پیداواری رشتوں کا تعین ہوا اور یہ رشتہ آقا و غلام کا رشتہ کہلایا اور پیداواری رشتے کا وجود دیکھنے میں آیا۔ آقا غلام سے اپنی ضرورت کے کام کراتا اور اس کی محنت سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ غلام مختلف قسم کے اوزار استعمال کر کے پیداوار بڑھاتا جو اس کے آقا کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس سے اس غلام کے یہاں بغاوت پیدا ہوئی اور مزید نئی راہیں کھولنا شروع ہوئیں جس سے بڑے پیمانے پر زراعت کا آغاز ہوا۔ کاشتکاری کے لیے بیل استعمال ہونے لگے گلہ بانی کا آغاز ہوا۔ نئی دھاتوں کی دریافت ہونے لگی اور نقل و حرکت بڑھی۔ اس نئی ضرورت نے جاگیر داری نظام کی بنیاد ڈالی۔

جاگیر داری سماج میں وہ لوگ جو پہلے غلام تھے اب کسان کہلانے لگے اور جو آقا تھے وہ جاگیر دار۔ اس سماجی نظام میں سب سے اہم ذریعہ زراعت تھا اس بنیاد پر زمینوں پر کام کرنے والے کسانوں کو بھی اب

پیداوار کا حصہ تصور کیا جانے لگا۔ کیوں کہ اس صورت میں محنت کش کو دل لگا کر کھیت میں کام کرنے کے لئے ابھارا جا سکتا تھا۔ اب یہ کسان چھوٹے چھوٹے اوزاروں کا مالک تھا اور کسی حد تک سماجی حقوق بھی میسر تھے۔ لیکن اس میں ایک تبدیلی ہوئی، غلام داری سماج میں آقا اپنے غلام کو قتل کروا دیتا تھا یا خود قتل کر دیتا تھا کسی دوسرے کو بیچ دیتا تھا لیکن اب وہ کسان کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس کی زمین پر کام کرنے اور پیداوار بڑھنے کا سلسلہ رک جاتا۔ البتہ اگر کبھی جاگیر بیچنی پڑ جائے تو وہ اس زمین پر کام کرنے کی وجہ سے دوسرے زمین دار کے ساتھ کام کرتا رہتا۔

جاگیر داری سماج میں زمیندار نے کسان کی محنت سے خوب منافع کمایا اور کچھ حصہ کسان کو بھی دیا۔ اس لیے کہ غلام داری سماج کی نسبت وہ اس کی پیداوار اسی صورت بڑھا سکتا تھا جب اس کا ذاتی مفاد بھی اس سے جڑا ہو۔ اس دور میں جولاہا، موچی اور کاریگری کے نئے پیداواری رشتے بھی پیدا ہونے لگے تھے کیونکہ ان سب کا تعلق زراعت سے براہ راست ہے۔ اس لیے ہر پیشے کے لوگوں نے خود کو منظم بھی کیا۔ اب پیداوار کے بڑھنے سے تجارت ہونے لگی اور تاجر کو زیادہ منافع کی سوچ نے چھوٹے کارخانوں کے لیے نیا راستہ بنانا شروع کر دیا۔

گھریلو صنعتیں اور کارخانوں کا قیام عمل میں آنے لگا جہاں زراعی دور میں بھاگے کسانوں سے کام لیا جاتا تھا۔ ان اجرت پر کام کرنے والے مزدوروں نے ایک قسم کا تغیر سماج میں برپا کیا جس سے پیداوار بڑھنے لگی اور یوں تاجر آہستہ آہستہ اس سرمایہ دار طبقے میں تبدیل ہونے لگے۔ مشین ایجاد ہوئی، صنعتی انقلاب برپا ہوا اور جاگیرداروں نے بھی زرعی مزدوروں کا تصور رائج کر کے سرمایہ دار کاشتکار بننے کی بنیاد ڈالی۔

جاگیر داری دور کا خاتمہ پیداوار کے بڑھنے اور مشین کی ایجاد سے ہوا۔ مشین اور کارخانوں میں پیداوار کے ڈھیر لگنے لگے جس سے وسیع پیمانے پر تجارت کو فروغ حاصل ہوا۔ کارخانوں اور مشینوں کے مالک دن دگنی رات چوگنی ترقی کر کے سرمایہ کار بن گئے اور وہی کسان مزدور میں بدل گئے۔ اس طرح ایک نئے دور میں نیا سماجی رشتہ قائم ہوا جس کو سرمایہ دار اور مزدور کا پیداواری رشتہ کہا جاتا ہے۔ سرمایہ داری سماج میں پیداوار کے ڈھیر لگنے سے سماج میں بسنے والے افراد کو دو بڑے طبقوں میں تقسیم کر دیا۔

پہلے جاگیر دار، کسان، جولاہا کاریگر بادشاہ وغیرہ کے مختلف طبقات موجود تھے جو اب صرف دو طبقوں میں بٹ گئے۔ اس نظام میں سرمایہ دار مزدور کو صرف اجرت کے عوض کام کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ مزدور اس مختصر اجرت کے لئے اپنی محنت کو سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ دیتا ہے۔ پہلے وہ جو چیز بناتا اس کے تبادلے سے

ضرورت کی اشیاء لیتا تھا اور بازار میں لے جاتا تھا۔ اب اس کی محنت سے پیدا ہونے والی اشیاء اس کے بجائے فیکٹری مالک یعنی سرمایہ دار کے پاس چلی جاتی ہیں پہلے جس چیز کو اپنا تصور کرتا تھا اب وہ اس کی نہیں بلکہ فیکٹری مالک کی ہو جاتی ہے۔

سرمایہ داری نظام میں مزدور طبقہ سرمایہ دار کی فیکٹری میں مسلسل محنت کر کے اجرت کے عوض سرمایہ دار کے منافع میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ جہاں یہ محنت اس کی ملکیت بننے کے بجائے سرمایہ دار کی ملکیت بن جاتی ہے اور وہ اپنی اس محنت کی پیداوار سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ وہ انسانی محنت جس کو دستکاری کے عہد میں اولیت حاصل ہوئی تھی اب ختم ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ بڑی بڑی مشینوں نے لے لی جس سے پیداواری عمل میں تبدیلی ہوئی۔ اب سرمایہ داری نظام میں آزاد مزدور درکار تھا جو کسی طرح کی ذاتی ملکیت نہ رکھتا ہو اس طرح سے سرمایہ دار اور مزدور کا رشتہ بھی بازاری رشتے میں بدل گیا۔ یعنی سرمایہ دار مزدور کی محنت کا خریدار اور مزدور محنت کو بیچنے والا۔ الغرض سرمایہ داری نظام میں ہر چیز بازار میں صرف فروخت ہونے کے لئے پیدا ہونے لگی۔

سرمایہ داری نظام نے منافع کی غرض کے لیے اشیاء کا ڈھیر لگایا اب یہ اشیاء سماج میں ضرورت پوری کرنے کے لیے پیدا نہیں ہوتیں بلکہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے کی خاطر پیدا ہونے لگیں۔ مارکسی نقطہ نظر کے تحت سرمایہ دار کا پیداوار میں نہ ہونے کے برابر حصہ ہوتا ہے جبکہ مزدور جس کا پیداوار میں ۹۵ فیصد حصہ ہے وہ خود اس پیداوار سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کی یہ محنت صرف پانچ فیصد کام کرنے والے سرمایہ دار کی ملکیت بن جاتی ہے۔ فیکٹریوں اور کارخانوں میں کئی کئی مزدور مل کر کام کرتے ہیں لیکن سرمائے کا یہ نظام سرمائے کو صرف چند افراد کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ سبط حسن اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> سرمایہ داری نظام کا بنیادی تضاد ہی یہ ہے کہ پیداوار اور پیداوار کے ذرائع تو ذاتی ملکیت ہوتے ہیں لیکن طریقہ پیداوار کی نوعیت اس طرح کی ہوتی ہے یعنی بازاری چیزیں، فیکٹریوں، کارخانوں، بڑے بڑے زرعی فارموں میں محنت کار مل جل کر پیدا کرتے ہیں مگر یہ چیزیں چند افراد کے قبضے میں چلی جاتی ہیں جو سرمائے کے گماشتے ہوتے ہیں۔ (۳۴)

سرمایہ داری نظام نے تمام تاریخی ادوار سے فیض حاصل کیا سماج میں ترقی کی نئی راہیں نکالیں لیکن دعووں کے برعکس مجموعی انسانیت کو ترقی دینے میں ناکام رہا۔ جس سے اس کے اپنے تضادات بھی واضح ہوتے

ہیں اور اس کی قلعی کھل جاتی ہے۔ مارکس کے خیال میں یہ نظام قائم ہی تضادات پر ہے اور یہی تضادات اس کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

مذکورہ سماجوں کے پیداواری رشتوں کے اجمالی جائزہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سماج میں موجود مادی حالات اور سماجی کاروباری رشتے مجموعی طور پر سماج پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ کسی بھی سماج میں جس طرح کے طبقات کا وجود ہوتا ہے ان کے پیچھے پیداواری رشتے کارفرما ہوتے ہیں۔ مارکس کے نزدیک تاریخ طبقاتی جدوجہد کی عکاس ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیداواری رشتوں میں جس توازن کی ضرورت تھی وہ توازن قائم نہیں ہو سکا۔ ابتدائی انسانی معاشرت باہمی تعاون پر مشتمل تھی مگر آگے بڑھنے کے ساتھ اس میں تضادات ابھرتے گئے جس کا عروج سرمایہ داری سماج میں ظاہر ہوا۔ یہ اس سماجی نظام ہی کی دین ہے کہ ایک طرف اتنی تعمیر و ترقی ہوئی اور دوسری طرف سماج میں افراد الگ الگ بٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سماج کی تبدیلی میں افراد کا کردار تو مسلمہ ہوتا ہے معاشی حالات اور مادی رشتے بھی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مذہب، ثقافت اور خاندانی نظام بھی تاہم یہ کردار ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

موجودہ سرمایہ داری نظام نے بھی سماج کی جڑوں کو کلی طور پہ ناکارہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ آج پیداواری رشتوں نے انسان کو سماج میں کردار ادا کرنے، آگے بڑھنے اور نوعی تقاضوں کی تکمیل کرنے کے بجائے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ اس حوالے سے ایک اقتباس:

> کسی بھی معاشی نظام کی ترقی اور تنزلی سماج کے ہر پہلو کو متاثر کرتی ہے۔ آج بطور ایک معاشی نظام سرمایہ داری کے بحران نے ہر سماجی رشتے کو مسخ کر دیا ہے اور معاشرے کا تانا بانا ہی ادھڑ رہا ہے۔ سماجی تعاون اور اجتماعی سوچ سے وابستہ انسانیت کے عظیم احساسات کو انفرادیت، لالچ، مفاد پرستی اور اس کی گہری کھائی میں دفن کر دیا ہے۔ ہر فرد سماج، فطرت اور اپنے آپ سے بیگانا ہے اور "بھیڑ میں بھی تنہائی" کا احساس ہے۔۔۔ معاشرے، انسانی رشتوں اور رویوں کی تشریح انفرادی حوالے سے نہیں کی جاسکتی بلکہ حاوی معاشی اور سماجی نظام کے حوالے سے کی جانی چاہیے۔ (۳۵)

جہاں آج کے اس موجود سماجی نظام نے سماجی پیداواری رشتوں کے ذریعے سماج کی ساخت کو متاثر کیا ہے وہیں قدیم سماج بھی ان پیداواری رشتوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ جب انسان غلام داری سماج میں داخل ہوا تو آقا غلام کے پیداواری رشتے نے ابتداء سے ہی دو طبقات اور انفرادی ملکیت کا مبہم سا رشتہ پیدا کر

دیا جو طاقت کے زور پر بنا تھا۔ اس دور میں آقا اور غلام ایک دوسرے سے توازن / باہمی تعاون کے بجائے طاقتور اور انفرادی ملکیت کی وجہ سے الگ شناخت کے حامل تھے۔ غلام کا رشتہ آقا سے باہمی تعاون کے بجائے مجبوری پر قائم تھا۔ اس مجبوری کی بنا پر وہ اپنے آقا کے لیے زندگی کا سامان مہیا کرتا تھا دوسرے قبائل سے لڑتا تھا شکار کرتا تھا اور ابتدائی زرعی کام بھی کرتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب اسے احساس ہوا کہ اس سخت کوشی کے نتیجے میں سوائے دو وقت کے کھانے کے اسے کچھ نہیں ملتا بلکہ اس کی اس محنت کا پھل اس کا آقا کھا جاتا ہے تو وہ منحرف ہو گیا۔ اس نے ہر طرح کی محنت سے خود کو علیحدہ کر لیا اب وہ محنت سے جی چراتا تھا اور پھر بغاوت بھی جنم لے چکی تھی جس نے سماج کو جاگیر داریت میں بدلا۔

اسی طرح جاگیر داری دور میں زمیندار اور کسان کا پیداواری رشتہ بنا جس کی ذیل میں دیگر چھوٹے چھوٹے طبقات بھی بنے تاہم ان کی اپنی اہمیت ہے۔ کسان اور مزارع پیداوار کا دو سے تین تہائی حصہ جاگیر دار کو دیتے تھے اور باقی سے اپنے خاندان کا پیٹ پالتے تھے۔ یہ دور کئی ہزار سال تک چلتا رہا۔ اس دور میں کسان اور مزارعے کی محنت کا پھل جاگیر دار کھاتا رہا جس سے کسان قطعی طور پر نا آشنا تھا۔ جاگیر دار زمین کا مالک ہونے کے ناطے بغیر محنت کے کسان کی محنت سے زندگی کی رونقیں سمیٹا تھا اور کسان دو وقت کی روٹی سے خاندان کا پیٹ پالتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب یہ شعور ہوا کہ اس کی محنت پر جاگیر دار عیاشی کرتا ہے تو کوئی اپنی مجبوری کے باعث بھاگ جاتا اور کوئی خودکشی کر لیتا۔ چودھویں پندرہویں صدی عیسوی میں کسانوں نے جاگیر داری سماج کے خلاف بغاوت کا آغاز کیا جو صنعتی دور کے آغاز پر سرمایہ داریت کے وجود میں آنے سے انجام کو پہنچا۔

اس زرعی دور کی تاریخ بھی ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کسان اور مزارعے کو اس کی محنت کے بدلے میں سوائے اپنا اور خاندان کا پیٹ پالنے کے کچھ نہیں ملتا تھا۔ جن لوگوں کے پاس اپنی زمینیں تھیں وہ اپنی ضرورت کی اشیاء کو تبادلے کے ذریعہ سے حاصل کر لیتے تھے۔ دستکاری سے حاصل ہونے والی پیداوار کو بازار میں جنس کے بدلے جنس سے بدل لیتے تھے۔ جس سے اسے محنت کے اپنے ہونے کا احساس ہوتا تھا مگر جونہی یہ دور اگلے مرحلے میں داخل ہوا اس سے بھی محروم ہو گے۔ اب سرمایہ داری سماج کا قیام ہوا جس میں ذرائع پیداوار یعنی فیکٹریاں اور مشینیں سرمایہ دار کے پاس چلی گئیں۔ پچھلے دور کا جاگیر دار اور تاجر سرمایہ دار بن گیا اور کسان بطور مزدور طبقہ اجرت کے عوض اپنی محنت فروخت کرتا ہے۔ آج کے اس سماج میں یہی وجہ ہے کہ بیگانگی کی نوعیت قدیم سماجوں کی نسبت یکسر مختلف ہے۔ اس نظام نے ہر شخص کو بیگانہ ذات بنا کر لوٹ کھسوٹ کے

ذریعے سماج کی بنیادیں ہلا کر رکھ دی ہیں۔ افراد معاشرہ سماجی سطح پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں سماج میں بیگانگی ہی بیگانگی دکھائی دیتی ہے۔

مارکس نے کہا تھا کے محنت کی بیگانگی سے ہی افراد معاشرہ سماج میں بیگانے ہو جاتے ہیں۔ تمام سماج اسی پہلو کا اظہار کرتے ہیں کہ افراد کی کسی بھی سماج میں بیگانگی وہاں قائم پیداواری رشتوں کی وجہ سے ہوتی ہے اس لیے مارکس نے تاریخ کو طبقاتی جدوجہد کا استعارہ کہا اور اس کا حل باہمی تعاون کی صورت میں بتایا جہاں سماج میں پیداواری رشتوں میں فرق نہ ہو بلکہ سب کے لئے یکساں ہوں۔ اس طرح پیداواری رشتوں میں تصادم کی جگہ باہمی تعاون ہو گا اور یہی باہمی تعاون انسانیت کو اس کی منازل کی طرف لے کر جائے گا۔

مارکسی بیگانگی کے سماجی پہلو:

جدید تہذیب کا حامل کہلایا جانے والا معاشرہ سماجی زوال میں مبتلا ہے۔ اس معاشرے کے انسان جس کرب، دکھ اور مایوسی میں جی رہے ہیں اس نے آج کے انسان کی زندگی کو نہایت تلخی اور تناؤ سے دوچار کر رکھا ہے۔ معاشرہ اس قدر انتشار کا شکار ہے کہ ہر چیز اور ہر حرکت میں تیزی کے ساتھ اکتاہٹ کے پہلو واضح نظر آتے ہیں۔ ہر کام کو جلد سے جلد نبھانے کی نہ ختم ہونے والی مقابلے کی دوڑ لگی ہے۔ اس سماج میں بحران کی سی کیفیت پیدا ہو کر ایک پیچیدہ مسئلے کی صورت میں سماج کے افراد کو دبوچ رہی ہے۔ فرد کو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اس کے لیے کونسی چیز صحیح اور کون سی غیر ضروری ہے۔ آگے بڑھنے کی اس دوڑ میں معاشرے کا کثیر طبقہ گوناگوں مسائل میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج کی ساخت بھی متاثر ہو رہی ہے جس سے افراد معاشرہ اپنی ذات اور شخصیت میں ایسے کھو چکے ہیں کہ انہیں اس سے باہر نکلنے کی راہ دکھائی نہیں دیتی۔

آج کے دور میں افراد سماجی و نفسیاتی بحران میں خود کو گھرا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ فرد کا دوسروں پر سے بھروسا اٹھ گیا ہے بلکہ اپنی ذات سے بھی بھروسا ختم ہو رہا ہے۔ ہر رشتے میں مطلب اور لالچ کا زہر بھرا ہوا ہے۔ سب کچھ مفادات کی بھینٹ چڑھ چکا ہے قربانی اور ایثار کا جذبہ بھی ناپید ہو رہا ہے۔ انسان کے دلی جذبات و احساسات بھی سماج کی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ بکھر کر رہ گئے ہیں۔ انسان کسی اخلاقی تعلق کو قائم کرنے میں خود کو ناکام پاتا ہے۔ اس سے اس کی ذات میں اذیت، کرب اور ذہنی سوچوں کا انبار لگا ہوتا ہے۔ یہ کہانی آج کے سماج کے ہر فرد کی کہانی ہے لیکن یہ حالت ہمیشہ سے ایسی نہ تھی۔ سبط حسن لکھتے ہیں:

> شخصیت کی یہ توڑ پھوڑ دراصل اس وقت شروع ہوئی جب معاشرہ طبقات میں تقسیم ہوا اور اس کی وحدت پر پہلی ضرب لگی۔ جن دنوں معاشرہ طبقوں میں نہیں بٹا تھا اور نہ بادشاہتیں قائم ہوئی تھیں بلکہ ہر قبیلے کی نوعیت ایک بڑے گھرانے کی تھی اور لوگ زرعی زندگی یا گلہ بانی یا مائی گیری کے اشتراکی دور سے آگے نہیں بڑھے تھے تو معاشرہ ایک سالم وحدت تھا۔[۳۶]

مندرجہ بالا اقتباس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ سماج اور فرد کی ذات میں ٹوٹ پھوٹ کا جو سلسلہ قائم ہے یہ سماج کی ناہمواری اور غیر متوازن مادی حالات سے پیدا ہوا ہے۔ طبقات میں بٹنے سے ہی افراد معاشرہ میں ذہنی اور نفسیاتی مسائل کا آغاز ہوتا ہے لیکن ابتدائی ادوار میں ان مسائل کی نوعیت مختلف تھی۔ ان کے مسائل آج کے طبقاتی معاشرے سے میل نہیں کھاتے۔ وہ لوگ استحصال کا شکار تھے لیکن ان کی ذات میں اس قدر بیگانگی اور سماجی ٹوٹ پھوٹ نہیں تھی جتنی آج سرمایہ داری نظام میں ہے۔ قدیم سماجوں میں بیگانگی اور تنہائی کا مسئلہ اجتماعی صورت حال کی عکاسی نہیں کرتا۔ البتہ انفرادی سطح پر یہ احساس موجود تھا جب کہ آج کا معاشرہ مجموعی طور پر اس کا شکار ہے۔ جہاں ہر شخص خود کو تنہا اور دوسرے کو اپنے لیے بیگانہ اور حریف تصور کرتا ہے۔

جدید سرمایہ داری نظام میں جہاں ایک طرف انسانی محنت کے نتیجے میں سرمائے کا انبار ہے تو دوسری طرف افلاس، غربت، بھوک، ذلت و اذیت، غلاظت، لاعلاجی، نفرت، تعصب اور جہالت کا راج ہے۔ ایک طرف چند افراد کے پاس دنیا کی آدھی سے زیادہ دولت ہے تو دوسری طرف غذائی قلت کا شکار معاشرہ۔ ہزاروں لاکھوں انسان کبھی جنگوں کبھی بیماریوں تو کبھی غذائی قلت سے لقمہ اجل بن رہے ہیں۔ کہیں دہشت گردی کے اڈے ہیں تو کہیں طاقت کے نشے میں چور طاقتیں انسانوں کو کیڑے مکوڑوں کی طرح کچل کر سماج کو عدم استحکام اور بے روزگاری و عدم تحفظ سے دوچار کر رہی ہیں۔ انسان تنہائی پرست اور طرح طرح کے نشے میں مبتلا ہو کر ذہنی سکون تلاش کرنے میں سرگرداں ہے مگر "سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں" کے مصداق سرمایہ داری نظام نے انسانیت کے سکون کو غارت کر دیا ہے۔

مارکس نے ڈیڑھ صدی قبل کہا تھا کہ یہ سرمایہ داری نظام تضادات پر مبنی ہے۔ یہ سرمائے کی ہوس میں تمام انسانی رشتوں اور احساسات و جذبات کو کچل کر منافع در منافع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جس کی وجہ سے دن رات محنت کرنے کے باوجود لوگوں کا معیار زندگی بہتر ہونے کے بجائے پہلے سے بھی بدتر ہوتا جا رہا ہے اور

مستقبل میں مزید انتشار کا باعث بنے گا۔ اس انتشار اور بدتر نتائج کی وجہ سے ہر فرد اپنی محنت سے بیگانہ ہو کر اپنی ذات کو بھی بھول رہا ہے۔ بورژوا طبقات دولت کی لالچ میں سماجی بنیادوں کو پولا کر رہے ہیں۔ دولت بٹورنے اور ذاتی ملکیت میں اضافے کا یہ نہ ختم ہونے والا جذبہ خود غرضی، لالچ اور نفسا نفسی کو فروغ دے رہا ہے جس سے سماج میں تفریق و تصادم کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔ اعلیٰ انسانی اوصاف پر منافع اور مراعات کو ترجیح دی جاتی ہے اس لیے ہر فرد دوسرے سے بیگانہ سبقت لے جانے کی دوڑ میں انسانی اخلاقیات کا جنازہ نکال رہا ہے۔

لالچ خود غرضی نفسا نفسی اور آگے بڑھنے کی دوڑ نے سماج میں قائم تمام اخلاقی و جذباتی رشتوں کی جڑیں کاٹ دی ہیں۔ مارکسی نقطہ نظر کے تحت محنت کا برابر صلہ نہ ملنے کی وجہ سے ہی انسانی اخلاقیات تباہ ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج اخلاقیات برائے نام کی رہ گئی ہیں ہر کوئی چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرے۔ اس کے لیے چاہے اسے دوسروں کو کچلنا ہی کیوں نہ پڑے۔ وہ انسان جو باہمی تعاون پر انسانی سماج کا آغاز کرتا ہے اب تفریق کا شکار ہے۔ جس کی محض یہی وجہ ہے کہ اس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہو رہی ہیں اور ذہنی طور پر وہ خلفشار کا شکار ہے۔

دہشت گردی کا خوف و ہراس اور جنگی ہتھیاروں کے نتیجے میں ہزاروں انسانوں کو لقمہ اجل بنتے دیکھتے ہیں تو اس کے پیچھے ایک ہی وجہ کار فرما ہوتی ہے زیادہ سے زیادہ منافع اور طاقت کا حصول۔ سماج انسانوں کی بنیادی ضروریات پوری کرنے میں ناکام ہے مایوس ہو جانے والے افراد معاشرہ مختلف طرح کے جرائم میں ملوث ہو کر دوسروں کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ دہشت گردی، ڈاکے ڈالنا، چوری کرنا، قتل کی وارداتیں ہونا اور بعض کا نشے کے عادی مجرم بن جانا پیدائشی نہیں بلکہ سماج میں قائم نظام کی وجہ سے ہے۔ انتہا پرستی اور بنیاد پرستی آج کے سماج کا ایک ناسور ہے۔ یہ نظام معاشی بدحالی، سیاسی عدم استحکام اور سماجی عدم تحفظ کو فروغ بخشتا ہے اور (Survival of the fittest) کے اصول کے تحت چند افراد معاشرہ کو مراعات سے نوازتا ہے جب کہ مجموعی معاشرہ مسائل میں الجھا رہتا ہے۔ جس سے افراد معاشرہ کی اعلیٰ انسانی اقدار اور صلاحیتیں زوال کا شکار ہو جاتی ہیں اور سماج میں کسی ہمہ گیر تبدیلی کے بجائے جمود کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پائند خان خروٹی اپنے مضمون "اشتراکی مفکر اعظم کا تصور بیگانگی" میں لکھتے ہیں:

> سرمایہ دارانہ معاشرہ جو محنت کشوں کی محنت پر پھلتا پھولتا ہے انہیں اپنی محنت اور ان کی پیدا کردہ تمام مصنوعات یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بیگانگی اختیار کرنے پر مجبور

کر دیتا ہے۔ زیر دست طبقے سے تعلق رکھنے والے معاشرے میں موجود معاشی ناآسودگی، سیاسی انتشار اور سماجی عدم تحفظ کے باعث ایک مسلسل محرومی، ذہنی کوفت اور کرب میں مبتلا رہتے ہیں۔ اپنے اور اپنے بچوں کے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے وہ دن رات سرگرداں رہتے ہیں۔ اپنی بنیادی ضروریات خوراک، پوشاک، رہائش، تعلیم اور علاج وغیرہ کے حصول کے لیے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے، سیاسی، ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں شرکت کرنے کے لیے ان کو فرصت کے لمحات بھی میسر نہیں ہوتے۔ اس طرح ان کی جمالیاتی حس دب جاتی ہے۔ (۳۷)

آج کے سماج میں افراد اپنی محنت اور صلاحیتیں بیچنے پر مجبور ہیں۔ وہ اعلیٰ انسانی اخلاقی قدروں اور نوعی تقاضوں سے بے خبر صرف زندہ رہنے کی دوڑ میں اپنے اردگرد سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے انسانی رشتوں کی اہمیت ختم ہو رہی ہے۔ جذبات و احساسات پر مبنی رشتے زوال کا شکار ہیں انسانی تخلیقی صلاحیتیں زنگ آلود ہیں۔ مذہب آرٹ قانون خاندان ہر نظام زندگی تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہے۔ وہ انسان جس نے کائنات کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل کرنی تھی نئے جہان دریافت کرنے تھے وہ فی الحقیقت مادی مسائل میں الجھ کر انسانی سطح سے بھی گر چکا ہے۔ اسے اپنے جیسے دوسرے انسان حریف کے طور پر نظر آتے ہیں۔ ان منفی اثرات نے زندگیوں کو تہہ و بالا کر کے لوگوں کو اپنے پیاروں کی جان تک لے لینے پر بھی مجبور کر دیا ہے۔ خاندانی نظام اور رشتے ختم ہو رہے اور سماج میں جرائم بے روزگاری اور عدم استحکام کی کیفیت ہے۔ کمیونسٹ مینی فیسٹو میں مصنفین لکھتے ہیں: "بورژوا طبقے نے خاندانی رشتوں کی دلگداز جذبات پرستی کا نقاب بھی چاک کر دیا ہے اور ان کو محض روپے آنے پائی کا رشتہ بنا کر رکھ دیا ہے۔" (۳۲)

ایسی سماجی صورتحال میں تشدد، جارحیت اور غیر انسانی رویوں میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ قتل و غارت گری اور دہشت گردی کی وارداتیں بڑھ رہی ہیں افراد نفسیاتی امراض کا شکار ہو کر اپنی جان لینے پر مجبور ہیں۔ دولت کے اس سماج کی نفسیات، اخلاقیات و اقدار تباہی کے جس دہانے پر کھڑی ہیں ضروری ہے اس سنجیدہ مسئلے کی طرف غور و فکر کیا جائے کہ آج کے سماج گوناگوں مسائل سے کیوں دوچار ہیں؟ وہ کون سی وجوہات ہیں جس سے معاشرے کے افراد پر انتہائی نفسیاتی اثرات مرتب ہو رہے ہیں؟

واضح رہے یہ انفرادی مسئلہ نہیں بلکہ اجتماعی مسئلہ ہے کیوں کہ سماج کا ہر فرد ایک خاص نظام کے تحت زندگی گزار رہا ہوتا ہے جس کی بنیادی ہمیشہ معاشی نظام فراہم کرتا ہے۔ اسی معاشی نظام پر سیاسی، سماجی اور

ثقافتی نظام عمل میں آتا ہے۔ مارکسی تصور کے تحت بیگانگی کو جڑیں سرمایہ داری نظام فراہم کرتا ہے جن کو کاٹنا ضروری ہے تاکہ انسان اجتماعی انسانی اخلاقیات اور تقاضوں سے انسانیت کو ترقی کی طرف گامزن کر سکے۔ نہ صرف یہ بلکہ تحصیل ذات کے لئے انسان کا سماجی مسائل سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔ ڈاکٹر لال خان اپنے مضمون سماجی بیگانگی میں لکھتے ہیں:

> اس ضرورتوں بھرے سماج کو بدلنے کے لیے اس معاشرے کے تمام ذرائع اور وسائل کو اشتراکی ملکیت میں دے کر ہی انسان کے لیے محرومی اور بیگانگی سے آزاد زندگی کا حصول ممکن بنایا جاسکتا ہے۔ (۳۹)

یعنی سماجی بیگانگی کے خاتمے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انفرادی ملکیت کا خاتمہ کیا جائے اور محنت کش طبقے سے اس کی چھینی ہوئی محنت اور اشیا کو مجموعی انسانوں کی ملکیت میں دے دیا جائے۔ تاکہ اداس چہروں پر حقیقی مسکراہٹ، مایوسی و ناامیدی کی جگہ روشن مستقبل اور امید، مسابقت کی جگہ باہمی تعاون اور مشینی انسان کی جگہ ایک تخلیقی انسان کی راہیں ہموار ہوں۔ آج کے اس معاشرے کے تمام سماجی و معاشی اور سیاسی مسائل کا واحد حل انفرادی ملکیت کے خاتمے اور باہمی تعاون کے نظام کے قیام پر مبنی ہے۔

ادیب اور سماجی بیگانگی:

ادب کسی بھی سماج کا آئینہ ہوتا ہے جس میں اس سماج کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ کسی سماج کی اگر تاریخ کا جائزہ لینا ہو یا اس کے حالات سے واقفیت حاصل کرنی ہو، روایات و ثقافت کا مطالعہ کرنا ہو یا عقائد و تصورات کا جائزہ لینا ہو تو ادب وہ واحد ذریعہ ہوتا ہے جس سے اس سماج کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔ ادب انسان اور سماج کے اظہار کا ایک شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ اس میں زندگی کی رونقیں اور مایوسی و محرومیاں سب ظاہر ہوتی ہیں ادب اور سماج کا آپس میں ایک اٹوٹ تعلق ہوتا ہے۔ یہ سماج میں محنت کشوں، کسانوں، خواتین اور مظلوموں کے حقوق کی ترجمانی بھی کرتا ہے اور داخلی و تخیلی احساسات و جذبات کا اظہار بھی۔ سماج کی ترقی میں ادب اور اس کے تخلیق کار کا اہم حصہ ہوتا ہے یعنی سماج اور ادب ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوتے ہیں اور ان کو کسی بھی صورت الگ تصور نہیں کیا جاسکتا۔

ادب خود بخود تخلیق نہیں ہوتا بلکہ ادیب اس کو تخلیق کرتا ہے۔ یہ ادیب کے داخلی جذبات اور خارجی محرکات سے وجود میں آتا ہے۔ جس طرح کے سماجی حالات ہوتے ہیں ویسے ہی ادیب کے جذبات بھی کسی شاہکار میں نظر آتے ہیں۔ ادیب جس ماحول میں رہتا ہے وہ اس سے متاثر ہوتا ہے۔ اپنے گردوپیش کا بغور

مطالعہ کرتا ہے جس کے نتیجے میں اسے نئے احساسات اور جذبات سے گزرنا پڑتا ہے اور وہ اپنے احساسات و جذبات کو الفاظ کی صورت میں بیان کر دیتا ہے۔ وہ حالات کے مطابق ہی اپنے جذبات و احساسات اور خارجی محرکات کا ذکر کرتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ وہ سماج سے کٹ کر کوئی ان دیکھی دنیا کی بات کرتا ہو بلکہ وہ گردوپیش کا مطیع ہوتا ہے۔ جیسے جیسے حالات تبدیل ہوتے رہتے ہیں ادیب کے جذبات میں بھی تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے مثلاً فضا کا ہیر پھیر کبھی اسے لطف دیتا ہے، ہنساتا ہے اور کبھی رلاتا ہے۔ موت اور بھوک کا احساس تکلیف دیتا ہے تو بچے کی پیدائش اور پیٹ بھر کر کھانے میں اسے خوشی محسوس ہوتی ہے۔ سجاد ظہیر اپنے مضمون "ادب اور زندگی" میں لکھتے ہیں:

> ادیب سماج کے مطالبات اور اپنے گردوپیش سے ہر انسان کی طرح متاثر ہوتا ہے۔ وہ جس زمانے میں جس تہذیب و تمدن کی گود میں پرورش پائے گا، جن لوگوں کے ساتھ رہے گا اور جن روایات و خیالات کا حامل ہوگا وہ یقیناً اس کے جذبات کو رنگ و روپ دیں گے۔ (۴۰)

ماحول کے اعتبار سے ادیب اور اس کا فنی شاہکار اس زمانے کی زندگی سے لبریز ہوگا۔ یہی وہ بنیادی دائرہ / تصور ہے جس سے ہمیں ادیب اور اس کے شاہکار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ تاریخی لحاظ سے جب ہم ادبی تاریخ یا ادب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ادب میں سماج کی قدیم ترین تاریخ اور حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ وہاں کے رسوم و رواج اور تہذیب و ثقافت بھی نظر آتی ہے۔ ایک طرف ادب ہمیں ان لوگوں سے متعارف کرواتا ہے جو بدلتے سماجی حالات کے ساتھ اپنے ادب میں بھی تبدیلی لاتے رہے اور سماجی حالات کی عکاسی کرتے رہے لیکن دوسری طرف ہمیں ایسے ادیب بھی ملتے ہیں جو اپنے دور سے بالکل الگ کٹے ہوئے ان دیکھی دنیا کے خیالات کو بیان کرنے میں مصروف رہے۔

بالخصوص جب ہم اپنی دھرتی برصغیر کے اس دورانیے کو دیکھتے ہیں جس میں اردو ادب پروان چڑھا تو ہمیں ایسے ادیب و شاعر دکھائی دیتے ہیں جن کے یہاں سماجی حالات و واقعات کی عکاسی نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کے شاہکار دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ کسی ان دیکھی دنیا کا سفر کر رہے ہیں۔ وہ دنیا جس کا یہاں کے سماجی حالات سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ تخیل کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے محسوس ہوتے ہیں اور اپنے سماج سے کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ ایک خاص قسم کی سماجی بیگانگی کا شکار تھے۔ ملکی حالات انتہائی زوال پذیر اور ابتری کا شکار تھے جب کہ ان لوگوں کا ادب سماج سے بالکل الگ ایک خاص سمت

میں سفر کر رہا تھا۔ ملک ایک طرف معاشی و سماجی اور سیاسی بد حالی کا شکار ہے تو دوسری طرف لڑائیاں ہو رہی ہیں اور ہمارے ادیب اس سے چشم پوشی کرتے ہوئے عشق و عاشقی کی نیرنگیوں میں مصروف ہیں۔ اختر حسین رائے پوری اس حوالے سے سخت رد عمل اپناتے ہوئے لکھتے ہیں:

> تمام ہندوستانی شعرا زندگی سے کٹے بے خبر اور بے پروا تھے، ان کے خیالات کتنے اوچھے اور احساسات کتنے بے حقیقت تھے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے چشم عبرت کی ضرورت ہے۔ پلاسی کی لڑائی کتنا بڑا فوجی سانحہ تھا پانی پت کی تیسری لڑائی ہندو طاقت کے لیے پیام موت تھی۔ ٹیپو سلطان کی شکست مسلمانوں اور ہندوستانیوں کے تنزل کا اعلان تھا۔۔ کسی بڑے شاعر نے پلاسی کی لڑائی پر ایک نوحہ نہیں لکھا۔ واقعہ سن ۵۷ء پہ داغ کا شہر آشوب اور غالب کے خطوط پڑھیے اور سر پیٹ لیجیے کہ جب پورے ملک کی قسمت کا فیصلہ ہو رہا تھا، یہ حضرات اپنی دو تیوں کے سوا کچھ نہ سوچ سکتے تھے اور سوچتے تھے تو ایسے بزدلانہ اور رجعت پروانہ طریقوں سے جو زندگی اور شاعری کے لئے باعث ننگ ہیں۔ (۴۱)

بلاشبہ اس اقتباس سے ایک خاص نقطہ نظر اور سخت منافرت کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے لیکن یہ عنصر بالکل بھی پوشیدہ نہیں کہ جن حالات سے اس وقت ہندوستانی سماج گزر رہا تھا ایسے حالات میں ادیب سماج سے کٹے ہوئے تھے۔ انہیں سماج کے جن پہلوؤں پر نظر رکھنی تھی ان سے قطع نظر وہ حسن و عشق کے فلسفوں میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ نظیر اکبر آبادی کے علاوہ اکثر بڑے بڑے نام اپنے دور کے حالات کو قلمبند کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ میر درد جیسے نامور شاعر اور اُن کے معاصر دنیا سے بیگانہ مذہب میں پناہ ڈھونڈ رہے تھے۔ یہ سب کیوں تھا؟ ایسی کون سی وجوہات تھیں جس وجہ سے اس دور کے ادیب سماج کے حالات کو قلمبند کرنے کی طرف راغب نہیں ہو پائے؟ وہ ماضی اور تخیل کی دنیا میں زندگی کو ڈھونڈتے رہے۔

جب اس کا مارکسی فلسفے کے تحت جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی و ملکی حالات ہی ناگفتہ بہ ہو چکے تھے۔ بار بار کے اندرونی و بیرونی حملوں نے افراد معاشرہ سے ان کے انسانی اور نوعی تقاضوں کو ان کی ذات سے چھین لیا تھا۔ لوگ سماجی حالات تو دور اپنی ذات تک سے بیگانہ تھے انہیں سماج سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جب کسی سماج میں موجود نچلے طبقات زوال کا شکار ہوں تو ایسے حالات میں وہ سماج سے الگ تھلگ اپنی ہی

مخصوص دنیا میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں جسے مارکس نے سماج میں مادی حالات سے پیدا ہونے والی سماجی بیگانگی سے تعبیر کیا ہے۔

سماج میں رہتے ہوئے ہر شخص حالات و واقعات اور رسوم و روایات کے ساتھ ساتھ ہونے والی تبدیلیوں سے متاثر ہوتا ہے اور ہونا بھی چاہیے اسی طرح ایک ادیب کو بھی اپنے سماج سے متاثر ہونا چاہیے۔ اسے سماجی حالات وواقعات کو اور اپنے جذبات کو تخلیق میں جگہ دینی چاہیے لیکن اگر وہ اپنے دور کے حالات کو بیان کرنے سے قاصر ہے تو اس کا مطلب ہے وہ سماجی بیگانگی کا شکار ہے۔ آج جب ہم اپنے سماج پر غور وفکر کرتے ہیں تو ہمیں ایسے حالات نظر آتے ہیں جس نے انسانوں کو سماجی سطح پر بالکل ہی مایوس کر دیا ہے۔ سرمایہ داریت کے اس زہر نے جہاں ہر چیز کو متاثر کیا ہے وہیں ادب اور ادیب بھی اس کا نشانہ بنے ہیں۔ انہی حالات کا نتیجہ ہے کہ وہ منہ موڑ کر تخیل کی دنیا میں پناہ ڈھونڈنے پر مجبور ہے۔ اسے سماج کے جن حالات کو بیان کرنا چاہیے تھا ان حالات کی بجائے کبھی ماضی میں اور کبھی اپنے اندر جھانکنے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ ان حالات کو موضوع بناتا، پس پردہ وجوہات کو بے نقاب کرتا، لوگوں کے جذبات کو ابھارتا مگر وہ ان مسائل کے بجائے چھوٹے چھوٹے ایسے پہلو کو بیان کرتا ہے جو بذات خود اسی نظام کی دین ہیں۔

ادیب معاشرے کا باوقار دانشور اور ذہین فرد تسلیم کیا جاتا ہے لیکن آج کا ادیب یکسر مختلف ہے۔ ماضی میں ادیبوں کا سماج کی تبدیلی میں ایک پر اثر کردار ہوتا تھا لیکن اب سرمایہ داری نظام نے تخلیق کار کو اس کے فرائض سے یکسر بے دل اور لاتعلق بنا کر رکھ دیا ہے۔ اب لکھاری کی حیثیت محض تفریح مہیا کرنے والے کی رہ گئی ہے۔ آج کا ادیب ذاتی مفادات انعام واکرام اور شہرت و تحسین حاصل کرنے میں مگن ہے۔ ادب کو پیسوں اور شہرت کی غرض سے لکھا اور بیچا جاتا ہے۔ جو کچھ تھوڑا بہت لکھتے بھی ہیں محض نقالی اور جگالی کرتے ہیں جس سے کوئی واضح نقطہ نظر ادب کے حوالے سے سامنے نہیں آرہا۔

ادیب کا وہ کردار جس سے وہ اپنے سماج کے حالات اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں کے محرکات کا تذکرہ کرتا، کہیں کھو گیا ہے۔ انسان اپنے تخلیقی عمل سے حیوانوں سے خود کو الگ کرتا ہے اور سماج کو اعلیٰ و ارفع سطح تک پہنچ جاتا ہے۔ مہر و محبت، امن و امان اور خوشحالی کا درس دیتا ہے۔ اس کی جگہ مراعات اور ذاتی مفادات نے لے لی ہے۔ اب ادیب ادب کو اپنی ذات کے لئے تو تخلیق کرتا ہے لیکن سماج کے لئے نہیں۔ اس تخلیقی شاہکار میں ہمیں رومانوی دکھ تو نظر آتا ہے لیکن سماج نہیں۔ وہ ذاتی مراعات کے لیے نغمے تو گاتا ہے

لیکن سماجی حالات اور دوسرے انسانوں کو امن و محبت کے پیغام نہیں دیتا۔ وہ انہیں صبر و شکر اور قناعت کی تلقین تو کرتا ہے لیکن اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑا ہونے کی ترغیب نہیں دیتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر آج کا ادیب اپنے سماج سے اتنا بیگانہ کیوں ہے؟ وہ آج کے ضروری پہلو سے قطع نظر اپنی ذات تک محدود ہو کر کیوں رہ گیا ہے؟ اس کا واضح جواب یہ ہے کہ سماج ادیب پر اثر انداز ہوتا ہے سماج کے رویوں سے ادیب کی شخصیت بھی متاثر ہوتی ہے۔ آج کا ادیب مکمل طور پر ذاتی مفادات میں اس لیے الجھا ہے کہ سماج میں یہ رویہ عام ہے۔ جہاں سماج میں موجود ہر شخص بیگانگی کے عمل سے دوچار کسی بھی طرح کا کردار ادا کرنے سے قاصر ہے۔ وہاں ادیب نہ چاہتے ہوئے بھی اسی بیگانگی کا شکار اپنے کردار سے لاپرواہ تخیل کی دنیا میں سکون تلاش کر رہا ہے۔ وہ حالات کے ستائے لوگوں کو اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑا ہونے کے بجائے چند فرعون نما لوگوں کی راہیں ہموار کرنے میں مصروف ہے۔ اب وہ مراعات لیتا ہے نام بناتا ہے مگر اسی نظام کے خلاف لکھنے اور بولنے سے قاصر ہے جس نے پورے سماج میں ہر ایک کو مفلوج بنا کر رکھ دیا ہے۔

ایک ادیب کے لیے ضروری ہے کہ وہ داخلی وارداتوں اور جذبات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی حالات کے بیان میں بھی خود کو پیش کرے وہ سماج سے کٹ کر کچھ بھی نہیں۔ اس کی پہچان سماج ہے اور جس کے یہاں سماج نہیں اس کی کوئی پہچان نہیں۔ سماجی خارجی حالات ہی اسے داخلیت کی طرف لے کر جاتے ہیں۔ اس لیے وہ خارجی حالات کو یکسر مسترد نہیں کر سکتا۔ وہ معاشرے کا نمایاں فرد ہوتا ہے جس نے سماج کے رخ کے تعین میں اپنا کردار ادا کرنا ہوتا ہے۔ ادیب کو اپنی بساط کے مطابق سماجی تبدیلی میں اپنا حصہ ڈالنا ہوتا ہے تبھی وہ سماج میں زندہ رہے گا ورنہ اس کا تخلیق کردہ ادب سطحیت کا شکار ہو کر کچھ ہی وقت میں اپنی حیثیت کھو بیٹھے گا اور اس کا کردار ایسا ہی ہو گا جیسے کوئی ساحل کے کنارے سے سمندر کی گہرائی کا تعین کرے۔

مارکسزم اور نظریہ ادب:

مارکس کے تصورات کو بیان کرتے ہوئے اگر ایک جملہ کہا جائے تو مارکسی تصور ادب واضح ہو جاتا ہے کہ ایسا ادب جو ادب برائے زندگی ہو۔ یوں تو ادب کے متعلق مختلف قسم کے نظریات گردش کرتے ہیں کہ ادب کو کیسا ہونا چاہیے؟ کون سے عناصر ادب سے خارج ہونے چاہیے؟ کن پہلوؤں پر زور دینا چاہیے؟ ان سے قطع نظر یہاں صرف مارکسزم اور ادب کو موضوع بنایا جائے گا۔ مارکسی نظریات خالصتاً معاشی و سماجی ہیں۔ یہی

وجہ ہے کہ مارکسزم کے تصور ادب کے حوالے سے جو تصورات پائے جاتے ہیں ان میں بعض اہل ادب الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ مارکسی تصور کے تحت ادب صرف پروپیگنڈا بن کر رہ جاتا ہے۔ ادیب کی آزادی متاثر ہوتی ہے اور اس کی داخلیت کا اظہار بھی نہیں ہو پاتا۔یوں ادب صرف ایک نظریے کے پرچار میں ادبی سطح سے گر جاتا ہے۔مارکسزم کیوں کہ خالص معاشی و سیاسی تصورات پر مبنی ہیں اور تاریخی جدلیاتی مادیت کے تحت سماج میں ہونے والی تبدیلی کو بیان کرتا ہے اس لئے اس کا ہو بہو اطلاق ادب پر نہیں ہو سکتا۔

یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادب کا مارکسزم سے کوئی رشتہ ہے بھی یا نہیں؟ کیا ادب میں مارکسی تصورات کو پرویا جاسکتا ہے؟ کیا مارکسی تصورات کے تحت تخلیق ادب ادب نہیں رہتا؟ جیسا کہ بعض نقادوں کے نزدیک ادب محض تجریدی، وجدانی اور روحانی عمل ہے یا پھر ادب اور سماج کا آپس میں کوئی تعلق ہے جس میں فنکار رہتا ہے؟ اگر تو تخلیقی عمل کا رشتہ محض روحانی و وجدانی عمل سے نہیں بلکہ سماج سے بھی ہے اور ہے تو پھر مارکسزم اور ادب کا رشتہ ایک بامعنی تعلق ہے۔ اسے کسی خاص بحث کی ضرورت نہیں۔مارکسزم جدید طبقاتی معاشرے کی تنقید ہے اور ادب تنقید حیات۔ ہر ادیب یا شاعر اپنے ماحول و موجودات سے متاثر ہوتا ہے اور مستقبل کے حوالے سے ایک نظریہ یا خاص تصور رکھتا ہے۔مارکسی نظریے کا حامی تخلیقات کو مستقبل کے ویژن کی کسوٹی پر تخلیق کرے گا اور پرکھنے کی کوشش کرے گا۔ یہیں سے ادب کا رشتہ مارکسزم سے جڑتا ہے۔ اصغر علی انجینئر "مارکسی جمالیات" میں لکھتے ہیں:

> یہاں یہ بات ہمیں ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ادب اور مارکسزم یا کسی اور نظریے میں بھی میکانکی رشتہ نہیں ہوتا۔ یہ رشتہ زندگی اور اس کی بدلتی ہوئی حقیقتوں کے توسط سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ کوئی بھی ادب یا فن زندگی سے بلا واسطہ اور سماجی، سائنسی یا معاشرتی نظریوں سے بالواسطہ تحریک حاصل کرتا ہے۔[۴۲]

مارکسزم کے ماننے والے ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کا نعرہ مستانہ بلند کرتے ہیں۔ان کے خیال میں ایسا ادب عظیم ادب ہو سکتا ہے جو کسی نظریے کے تحت تخلیق کیا گیا ہو۔ جس کا مقصد و مدعا سماج میں تبدیلی برپا کرنا ہو، جس میں سماج میں ہونے والے حالات و واقعات کا بیان ہو اور حقیقت اور سچائی کو بیان کرتا ہو۔ناں کہ ایسا ادب جو ادب برائے فن یا ادب برائے ادب میں الجھ کر اپنا وجود بھی برقرار نہ رکھ سکے۔ ایسا ادب محض تفریح فراہم کر سکتا ہے جس سے خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں ہو سکتے۔اسی لیے مارکسی نظریات کے مخالفین نے مارکسی نظریات کے تحت تخلیق ہونے والے ادب کی مخالفت کی۔ان کا ماننا یہ ہے کہ

اس طرح ادب محض مبلغ بن کر رہ جاتا ہے جس سے ادیب کے داخلی احساسات و جذبات کا اظہار نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ایسے ادب میں کوئی چاشنی ہوتی ہے۔مارکسی فلسفہ ادب کی جمالیات کی نفی کرتا ہے جب کہ ادب انسانی احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ جمالیاتی حس کے اظہار کا ذریعہ ہوتا ہے۔

یہ اعتراضات دراصل سرمایہ داری نظام کے پروردہ لوگوں کے ہیں کہ مارکسزم کے تحت تخلیق ہونے والا ادب فنی صلاحیتوں اور جمالیاتی حس سے مبرا ہوتا ہے۔باوجود یہ کہ نہ تو مارکس نے ایسا کچھ بیان کیا اور نہ ہی مارکسزم کے پیروکاروں نے جو مارکسزم کو ایک سماجی نظام کے طور پر سمجھتے ہیں۔سوائے چند معدودوں کے جنہوں نے مارکسزم کے تصور کو بیان کرنے میں سختی کا مظاہرہ کیا اور سابقہ تمام ادب کو یکسر مسترد کر دیا۔جبکہ مارکس اور اینگلز سمیت لینن جیسے مارکسیٹوں نے سابقہ ادوار کے ادب کو کہیں بھی مسترد نہیں کیا بلکہ اس سے فیض حاصل کرنے کی بات کی۔البتہ یہ واضح کیا کہ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ ہم ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو جائیں اور حال و مستقبل کو یکسر بھول جائیں۔ڈاکٹر عبدالحلیم "مارکسزم اور ادب" میں لکھتے ہیں:

> مارکسزم کے بڑے نمائندوں نے ہمیشہ انسانیت کے قدیم تہذیبی ورثے کو عزت کی نظر سے دیکھا ہے اور برابر اس کا ذکر کیا ہے۔یہ کوئی اتفاق امر نہیں ہے کہ مارکسزم کے معماروں نے قدیم ورثے کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھا ہے۔جمالیات میں قدیم ورثے کو عزت کی نظر سے دیکھنے کی وجہ یہ ہے کہ مارکسزم کے اصلی نمائندے تاریخ کی حقیقی شاہراوں کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں، ہر اتار چڑھاؤ پر نظر رکھتے ہیں اس لئے کہ وہ تاریخی ارتقاء کے اصولوں سے واقف ہیں۔ (۴۳)

مارکس، اینگلز اور لینن خود جمالیات اور فن کو اہمیت دینے کے ساتھ ساتھ ماضی کے ادب کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔لینن نے کہا تھا کہ ہم قدیم کو اس لیے نہیں چھوڑ سکتے کہ وہ قدیم ہے اور جدید کو اس لیے اپنا لیں کہ وہ جدید ہے بلکہ ہمیں حسین چیزوں کو قائم رکھنا ہے اور اپنے لئے مزید ترقی کا نقطہ آغاز بھی سمجھنا ہے۔

بعض ادب برائے ادب کے مبلغوں کا یہ ماننا تھا کہ مارکسزم کے تحت ادب اپنی جمالیاتی حس بھی کھو دیتا ہے اور فنی اعتبار سے بھی کمزور ہوتا ہے۔یہ بات اس حد تک تو درست ہے جس حد تک ابتدائی مراحل میں مارکسزم پر سخت اور کٹر انداز میں عمل پیرا ہونے کی کوشش کی گئی لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔مارکس اور اینگلز خود بھی جمالیات پرست تھے۔بعض شواہد کے مطابق وہ جوانی میں شاعر بھی بنانا چاہتے

تھے اور خود جمالیات کو پسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں جمالیات کا تعلق بھی سماجی و معاشرتی حالات سے ہی ہے۔ خارجی محرک ہی اس کا باعث بنتے ہیں اسی وجہ سے مارکس نے جانوروں سے انسان کو تخلیقی عمل میں برتری بھی دی۔ وہاب اشرفی "مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب" میں مارکس کا ایک اقتباس نقل کرتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں:

> Marx, When expounding this phenomenon draw attention to the fact that man in his labor is fundamentally different from animals engaged in various task reminiscent of work. The animal always creates only to meet the needs of his own species in accordance with its demands.(۴۴)

یعنی جانور صرف ضرورت پوری کرنے کے لیے تخلیق کرتے ہیں اور انسان اپنی نوع کے لیے۔

مارکسزم کا تصور ادب ادبی جمالیات اور فنی خصوصیات سے آزاد نہیں ہوتا اور نہ ہی وہ اس کا پرچار کرتے ہیں بلکہ وہ ادب میں حقائق و صداقت کے ساتھ فنی خوبیوں کے بھی متقاضی ہیں۔ ان کے نزدیک ادب سماج کی عکاسی کرے، حالات و واقعات کو اپنے اندر سموئے اور حقیقت نگاری کو فروغ دیتے ہوئے ادبی خصوصیات کو برقرار رکھے۔ ادب یا آرٹ ایسا ہو جو ان خوبیوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہو، وہ صرف خیالوں کی بھول بھلیوں میں ہی نہال نہ رہے بلکہ سماجی حقیقت کو بھی بیان کرے۔ ڈاکٹر عبدالحلیم اس حوالے سے لکھتے ہیں "مارکسزم کی رو سے اچھا آرٹ وہ ہے جو صداقت کے ساتھ حقیقت کی عکاسی کرے اور جس میں مثبت طور پر جمالیاتی عنصر موجود ہو۔"(۴۵)

مارکسزم کے اکثر مخالفین کا یہ خیال ہے کہ اس طرح کے فنکار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ہر طرح کی رومانیت سے گریز کرتے ہوئے صرف حقیقت پسندی کو اختیار کرے۔ جب کہ مارکسزم یہ بالکل بھی نہیں کہتا کہ رومانیت کو سراسر رد کر دینا چاہیے بلکہ وہ یہ مطالبہ کرتا ہے کہ رومانیت کو بھی انقلابی ہونا چاہیے۔ جو اسے خیالات کی دنیا سے نکال کر اس کے اندر انقلابی رومانیت کا جذبہ اور جوش پیدا کرے۔ یہ رومانیت فرضی یا خیالی نہیں ہوتی بلکہ سماج کی فلاح و بہبود کے لئے جذبات کو بھڑکانے کے لیے ہوتی ہے۔ مارکسزم کے تصور ادب میں رومانیت اور حقیقت پسندی دونوں کو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن مناسب طرز کی رومانیت اور حقیقت پسندی ہونی چاہیے۔ اسے ماضی کے بجائے حال اور مستقبل کے بارے میں ہونا چاہیے سماج میں جو کچھ ہو رہا ہو اسے ہو بہو

بیان کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مارکس نے بھی اپنے سے قبل کے ادب کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ حقیقت پسند ادب کو سراہا بھی ہے۔ اینگلز نے بھی مارکس کے تصور ادب سے اتفاق کیا ہے۔

نظریہ اشتراکیت حقیقت پسندی کے لیے بنیاد کا کام کرتا ہے یہ ذہن کی نشوونما اور تاریخی حقائق پر زور دیتا ہے۔ یہ رومانوی قدروں اور داخلی جذبات کا مخالف نہیں یہ تو صرف ماورائیت کا انکار کرتا ہے۔ مارکسزم میں مادی وجود کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے جس کے لئے عمل اہمیت کا حامل ہے اور زندگی تخلیقی کوششوں سے عبارت ہے۔ انسان کو انفرادی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے ساتھ ساتھ اجتماعی صلاحیتوں کی بہتری کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔ ایسا ادب ہی سچا اور زندہ رہنے والا ادب ہوتا ہے۔ وہی ادب صحیح ہوگا جو اپنے موضوع کے ساتھ فن سے بھی لبریز ہو۔ فن اور موضوع کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ان کو الگ کیا جائے تو یہ اپنا حسن کھو بیٹھیں گے اس لیے فنی لوازمات کو برقرار رکھتے ہوئے سماجی ادب تخلیق کرنا چاہیے یہی ادب سماج کا رہنما ہوگا۔

مارکسی ادب ایسا ہونا چاہیے جو معاشرے کے عام طبقے کے مسائل کو بیان کرتا ہو، جس میں طبقاتی کشمکش کی تصویر کشی ہو، جو مزدوروں کے حقوق اور جس میں طبقاتی تفریق کے خاتمے کو بنیاد بنایا گیا ہو۔ قدامت پرستی سے اجتناب ہو، جدت کا نہ صرف پرچار ہو بلکہ اس کا اظہار کرنے کے لیے جذبات کو ابھارا بھی جائے۔ معاشرے کے پسے ہوئے طبقے کو اپنا موضوع بناتے ہوئے سماج اور ماحول کی ترجمانی کرے۔ سماج کے بدلاؤ کے نظریے کا پرچار کرنا چاہیے۔ بالائی طبقے کی بجائے پرولتاریہ کے حق میں نعرہ مستانہ بلند کرے۔ یہی مارکسزم کا حقیقی تصور ادب ہے۔ پروفیسر ظہور الدین "جدید ادبی و تنقیدی نظریات" میں لکھتے ہیں:

> مارکس کے نزدیک ادب انسانیت پرست اور ترقی پسند رجحانات کا حامل ہونا چاہیے اس کی افادیت کسی ایک طبقہ کے لئے نہیں بلکہ عام انسانوں کے لئے ہونی چاہیے۔۔۔ ادیب کو انقلابی ہونا چاہیے تاکہ وہ ان طاقتوں کے خلاف جہاد کرے جو مادی مرکزیت کو جنم دے کر سرمایہ دارانہ طاقتوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ فنکار کی تخلیق میں بے لاگ خارجیت ہونی چاہیے۔ فن میں مواد اور ہیئت کا توازن اور امتزاج ہونا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے بڑا ادیب وہ ہے جو ہمارے ذوق حسن، ذوق عمل کو نہ صرف آسودہ کرے بلکہ حرکت میں بھی لائے۔ (۴۶)

مارکسی ادب اپنے ماحول اور سماج کا عکاس اور ماحول کو بدلنے کے مقصد سے لبریز ہوتا ہے یہ لوگ ادب کو سماجی ادارہ سمجھتے ہیں لیکن وہ ہرگز اس کی فنی خصوصیات کو رد نہیں کرتے اور جمالیاتی ذوق اور عمل کو ابھرنے والے اشتراکی ادب کو ہی اعلیٰ ادب تصور کرتے ہیں۔ مارکسی تصور کے مطابق وجدانی کیفیت جذبات حسن اور جمالیات انسان کی صرف داخلی وارداتیں نہیں ہیں بلکہ یہ خارجی محرکات کے نتیجے میں ہی انسان کے باطن میں پیدا ہوتی ہیں۔ جس طرح کا ماحول ہوتا ہے اس سے فنکار متاثر ہوتا ہے اور پھر اسے داخلی معاملات کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس لیے انہیں الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس ماحول اور خارجی حالات کے ساتھ جوڑ کر ہی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ خارجی مادی حالات ہی ہیں جو ہمارے شعور اور تخلیق کے عمل کو بناتے اور بگاڑتے ہیں لیکن آج کا سرمایہ دارانہ نظام فن کا بھی دشمن ہے۔ یہ نظام انسانی معاشرے کو مصنوعی احتیاجات کا غلام بنا دیتا ہے جس سے ادب اور ادیب دونوں ہی متاثر ہوتے ہیں اس لیے ادب کو اشتراکی بنیادوں پر تخلیق کرنا چاہیے جو ادیب کو انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف متوجہ کرے۔ مجنوں گورکھپوری لکھتے ہیں:

> ۔۔۔ لیکن اشتراکیت سنجیدگی کے ساتھ ادب کا جائزہ لے رہی ہے اور نئے اصول تنقید مرتب کر کے ایک بالکل نئے ادب کی تعمیر کرنا چاہتی ہے، اس کے خیال میں ادب کو صرف ایک منتخب اور مخصوص حمایت کی زندگی کا آئینہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ جمہوری ذہنیت کی تصویر اور جمہوری زندگی کا حامی ہونا چاہیے۔ (۴۷)

المختصر یہ کہ مارکسزم کا تصور ادب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ادب کو زندگی کے ایک شعبے کی حیثیت سے اپنے ماحول اور سماج کا ترجمان ہونا چاہیے۔ ادب ایک خاص مقصد کے تحت تخلیق کرنا چاہیے جس میں سماجی زندگی اور تفریح دونوں پہلو کارفرما ہوں۔ ایسا ادب جو انفرادیت کے بجائے اجتماعیت کو فروغ دے اور انسانی قدروں کی پامالی اور طبقاتی نظام کے خاتمے کے لیے اپنا کردار ادا کرے، جدت کو اپنائے قدامت اور رجعت پرستی کے بجائے ماضی سے سبق لیتے ہوئے حال کا بیان کرے اور مستقبل کے لیے جدوجہد کرنے کی ترغیب دے۔ یعنی موثر ادب وہ ہے جو انسانیت کے مقصد کی ترجمانی کرے، عام لوگوں میں ایکتا اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا کرے۔ قوم و ملت اور انسانیت کی وحدت کا پیغام دے، رنگ و نسل، قومیت و طنیت کی جگہ اخوت و مساوات کی حمایت کرے اور ظلم کے نظام کے خلاف علم بغاوت بلند کرے۔ ایسا ادب ہی انسانی سماج میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے۔ تخیل و خیال کی بلند پروازیوں کی جگہ خارجی محرکات سے اپنے خیالات و جذبات کو نیا رخ عطا کرے کیونکہ سماج سے نہ تو ادیب کٹ کر رہ سکتا ہے اور نہ اس کا تخلیق کردہ ادب۔ اس لئے ماحول اور سماج کو

ادب میں سمونا ہی اچھے اور ترقی پسند ادب اور ادیب کی خصوصیات تصور کی جاتی ہیں یہی مارکسی تصور ادب کہلاتا ہے۔

اردو ناول اور مارکسی بیگانگی:

مارکس کا فلسفہ ہمارے سماج کا فلسفہ ہے جو سائنسی بنیادوں پر سماج کے ارتقا، سماج میں ہونے والی تبدیلیوں مسائل اور ان کے حل کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ہمارے تمام مادی اور داخلی مسائل کو انسان کی مادی ضرورت یعنی معیشت سے منسلک تصور کرتا ہے۔ مارکسی فلسفے نے ڈیڑھ صدی میں دنیا بھر میں بطور معاشی و سماجی فلسفے کے مقبولیت حاصل کی۔ جہاں اس نے سماج کے معاشی اور سماجی نظام کو متاثر کیا وہیں ادب بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ اردو ادب بالخصوص ناول میں مارکسی عناصر کی پیشکش کی تصویر بڑی واضح ہے۔ اگرچہ مارکسی فلسفہ کو بنیاد بنا کر کوئی بہت بڑا ناول تخلیق نہیں کیا جا سکا تاہم مارکسی نظریات کا ٹوٹا پھوٹا اظہار ان تمام ناولوں میں موجود ہے جو سماجی حالات، جاگیر داریت اور سرمایہ داریت کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ مارکسی بیگانگی مارکس کے فلسفے کا اہم پہلو ہے جس کا اظہار آج کے معاشرے میں بخوبی دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح ہمارا معاشرہ اس کا شکار ہو رہا ہے۔

اردو ناول کی تاریخی حیثیت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ مارکسی بیگانگی کو بنیاد بنا کر ناول تخلیق نہیں ہوئے لیکن ابتدائی دور سے لے کر جدید ناولوں تک کسی نہ کسی پہلو سے مارکسی بیگانگی کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ بالخصوص جاگیر داریت، ترقی پسندی اور ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر بعد کے تحریر کردہ ناول اس پہلو کو اپنے ہاں جذب کیے ہوئے ہیں۔ یہاں تمام ناولوں کا ذکر کرنا ایک مشکل امر ہے تاہم چند ایسے ناولوں کو سرسری طور پر پیش نظر رکھا جائے گا جن میں ہمیں اس تصور کے پہلو نظر آتے ہیں۔

"گئودان" منشی پریم چند کا ایک بہترین شاہکار ہے جو ۱۹۳۴۔۳۵ء میں تخلیق ہوا۔ یہ ناول برِ صغیر کے کسانوں کی خستہ حالی، سرمایہ داروں اور جاگیر داروں کی لوٹ کھسوٹ اور ریاستی ہتھکنڈوں کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتا ہے۔ دیہاتی زندگی کی معاشی بدحالی، مہاجنوں اور ساہوکاروں کی چالاکیاں اور شہروں میں ہونے والی سیاسی ہیر پھیر اس ناول کے اہم موضوعات ہیں۔ "ہوری" اس کا مرکزی کردار ہے جو تمام برصغیر کے کسانوں کی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس کردار کے ذریعے پریم چند نے برصغیر میں کسانوں کے استحصال کو اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔

وہ کسان جو ساری ساری زندگی زمینوں پر محنت کرتا ہے لیکن اس کی حالت زار میں کوئی کمی نہیں ہوتی وہ فصل سے حاصل ہونے والی آمدنی سود قرض لگان اور ٹیکسوں کی صورت میں حکومت، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور مہاجروں کے حوالے کر دیتا ہے اور خود بھوک و افلاس میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ وہ احتجاج نہیں کرتا، آواز نہیں اٹھاتا، قسمت کا لکھا تصور کر کے اپنی محنت کو بیچ دیتا ہے اور بدلے میں فاقے مصیبتیں اور دکھ بھری زندگی گزارتا ہے۔ ہوری جو تمام کسانوں کا نمائندہ ہے وہ فصل سے آنے والی آمدنی بھی ان استحصالی ہاتھوں کے سپرد کر کے خود بھوکے پیٹ سونے پہ مجبور ہے اسے احساس ہی نہیں کہ وہ جو محنت کرتا ہے اس کے پھل کا حقدار بھی وہی ہے۔ اس کی محنت ہوس کے پجاری لوٹ کر زندگی کی عیاشیوں میں مصروف ہیں۔ ایک اقتباس دیکھیں جہاں حاصل ہونے والی آمدنی جرمانے اور سود کی مد میں دینے کے بعد ہوری اور اس کا خاندان فاقے کاٹنے پہ مجبور ہے:

> رات کا وقت تھا سردی خوب پڑ رہی تھی۔ ہوری کے گھر آج کچھ کھانے کو نہ تھا دن کو تھوڑا سا بنا ہوا مٹر مل گیا تھا مگر اس وقت جولاہا جلنے کا کوئی ڈول نہ تھا۔ روپا بھوک سے بے حال تھی۔ اور دروازے پر الاو کے آگے بیٹھی رو رہی تھی۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ بھی نہ تھا۔ (۴۸)

اس ناول میں پریم چند نے کسانوں کی اس بدحالی کی عکاسی کی ہے جس نے کسان کی رہی سہی کسر بھی نکال دی تھی۔ ایک طرف جاگیر دار اور سود خور تو دوسری طرف حکومتی ٹیکسز نے کسان کو جیتے جی مرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برصغیر کا پورا سماجی ڈھانچہ ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا ایسے میں ہر طرف سے کسانوں کی زندگی اجیرن بن چکی تھی۔

کسان جو کچھ زمینوں سے کماتا ہے وہ مہاجن، تھانے دار، ساہوکار اور حکومت مختلف حیلوں بہانوں سے لوٹ لیتے ہیں۔ وہ ظلم کی چکی میں پسنے پہ مجبور ہے لیکن آواز نہیں اٹھاتا اور اپنی ہی محنت کا استحصال کراتا رہتا ہے۔ پورے پورے سال کی محنت کے بعد خالی ہاتھ رہ جاتا ہے۔ ہوری اور اس کا خاندان سب مل کر محنت کرتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں کوئی بہتری نہیں ہوتی اور قرضوں کے تلے دبے دبے زندگی گزارنے پہ مجبور ہیں۔ یہی حال تمام کسانوں کا ہے جو سب کو کھلاتے ہیں لیکن خود بھوکے رہتے ہیں۔ وہ اخلاقی، معاشی، سماجی ہر سطح پہ ذلت کا شکار ہیں۔

"لندن کی ایک رات" سجاد ظہیر کا ناول ہے جو بنیادی طور پہ ترقی پسند تحریک کی نمائندگی کرتا ہے۔اس ناول کا مرکزی کردار نعیم ہے۔یہ کہانی چند نوجوانوں کی ذہنی کشمکش اور بحث مباحثے کو بیان کرتی ہے۔برصغیر کی آزادی اور معاشی صورت حال کو نوجوان اپنا موضوع بناتے ہیں۔وہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کے عوام غلامانہ زندگی گزارنے پہ مجبور ہیں جب کہ لندن میں تمام انسانوں کو برابر کے حقوق میسر ہیں۔وہ اسی تضاد کو بنیاد بناتے ہیں مگر ان میں سے اکثر انگریز سامراج کی مرہون منت لندن تعلیم حاصل کرنے گئے تھے تو اپنے ہی مربیوں کے خلاف کسی بھی عمل سے قاصر تھے۔وہ ترقی پسند خیالات اور اشتراکی خیالات تو رکھتے ہیں تاہم کسی عملی جدوجہد کو اپنانے سے یکسر محروم دکھائی دیتے ہیں۔بعض ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا چاہتے ہیں اور بعض انگریزوں کی حکمرانی کو تسلیم کر کے ان کے زیر سایہ جینے پہ آمادہ ہیں۔ہندوستان کے لوگوں کی معاشی حالت ابتر سے ابتر ہو رہی ہے، تعلیم یافتہ افراد کی کمی ہے اور سماجی سطح پہ حالت بدتر ہو چکی ہے۔خیالات کی حد تک تو آزادی کے خواہاں ہیں مگر عملی اور ذہنی طور پہ ناآسودگی اور نفسیاتی پریشانیوں کا شکار ہیں۔ایسے ہی حالات کی عکاسی اقتباس سے:

> جو قوم غلام ہو جس میں اسی فیصد انسانوں کو پیٹ بھر کر کھانہ نہ ملتا ہو۔جس میں مرض ،وبا، بیماری اس قدر پھیلی ہو کہ سارے ملک میں مشکل سے تندرست انسان نظر آتے ہوں۔جہاں علم گنتی کے لوگوں تک محدود ہو۔جہاں بچے تک کملائے ہوئے پھولوں کی طرح ہوں۔جہاں اکثر لوگوں کے چہرے پر بھوک،فاقہ ،مصیبت لکھی ہوئی ہو اور باقیوں کے چہرے سے سستی،حماقت،جہالت اور ایک مکر قسم کی خوشحالی نظر آتی ہو۔وہاں زندگی کے ان رنگین تحفوں کو تلاش کرنا سراسر حماقت ہے۔[۴۹]

ہندوستان جو انگریز سامراج کے تسلط سے قبل دنیا کی جی ڈی پی کا پچیس فیصد دیتا تھا۔آج اس کی حالت زار دیکھنے لائق ہے جہاں انسان کیڑے مکوڑوں کی طرح غلامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔جو اس شعور سے بھی عاری ہو چکے ہیں کہ ان کی محنت اور کاوش کا نتیجہ انگریز سامراج اور یہاں کے گماشتوں کی جھولی میں گرتا ہے اور وہ اس سے بے خبر استحصال کرانے پہ مجبور ہیں۔وہ جس دکھ بھری زندگی کو جی رہے ہیں وہ اس غلامی،سامراجی لوٹ کھسوٹ اور معاشی بدحالی کا نتیجہ ہے۔ان کی زمین اور دولت پہ جو لوگ قابض ہیں وہ ان کی محنت کو ذریعہ بنا کر استحصال کر رہے ہیں اور ان کی ہر قسم کی آزادی کو جابرانہ طور پہ غلامی میں بدل دیا ہے جس سے وہ ناآشنا ہیں۔غلامی کی اس زندگی نے انھیں اپنے جیسے انسانوں اور نوعی تقاضوں سے بیگانہ کر دیا

ہے۔اسی لیے مارکس نے کہا تھا کہ جب انسانوں کو معاشی طور پہ ناسودگی کی شکار کر دیا جاتا ہے تو وہ سماج سے لاتعلق ہو کر جانوروں کی سی زندگی گزارنے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔"لندن کی ایک رات" بھی اسی غلامی کے گرد چند نوجوانوں کی ذہنی ونفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتا ہے۔ جنھیں اپنے ہم وطنوں کو اس غلامی کی حالت سے چھٹکارا دلانا ہے۔

کرشن چندر کا ناول "شکست" یوں تو ترقی پسند تحریک کا نمائندہ ناول تصور کیا جاتا ہے۔یہ ۱۹۴۳ء میں شائع ہوا۔ جس میں رومان اور انقلاب کا ملا جلا رجحان ہے۔ کرشن چندر کے دیگر ناولوں میں بھی سماجی حقیقت اور طبقاتی کشمکش اور استحصال کو بیان کیا گیا ہے۔انھوں نے برصغیر کے عوام کی زبوں حالی کی جو تصاویر اپنے ناولوں میں کھینچی ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں "طوفان کی کلیاں" طبقاتی سماج میں جاری کشمکش اور ظلم واستحصال کی داستان رقم کرتا ہے۔کسانوں کا استحصال، جدوجہد اور حکومتی ہتھکنڈوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جہاں کسانوں کو نہ صرف استحصال اور سماجی پستی میں دھکیلا جاتا ہے بل کہ انھیں قتل بھی کیا جاتا ہے۔

جاگیرادری نظام میں سماج کے کرتا دھرتا اور حکومت نت نئی پالیسیوں اور ٹیکسوں کے ذریعے کسانوں کے خون پسینے (محنت) کو بھی کوڑیوں کے عوض کسان سے چھین کر ان کی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے۔ان کی ساری زندگی کھیتوں میں کام کرنے، دکھوں، پریشانیوں اور مصیبتوں میں گزر جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پہ انھیں سزائیں اور جرمانے کیے جاتے ہیں۔ان کی ماؤں بہنوں کی عصمت دری کیا جاتی ہے ۔کسان دن رات محنت کرتا ہے لیکن بدلے میں صرف بھوک اس کا مقدر بنتی ہے ۔اس حوالے سے ایک اقتباس:

> لیکن یہ مکئی کا دانہ جو سارے کا سارے کسان کی محنت کا پھل ہے کبھی اس کا نہیں ہوتا۔بیوی اس کے پاس رہتی ہے بیٹے اس کے پاس رہتے ہیں لیکن یہ دانہ اس سے چھین لیا جاتا ہے۔ کھلیان سمٹینے کے بعد جب دانے پک جاتے ہیں اور سنہرے انبار ہو جاتے ہیں تو گاوں کا نمبر دار علمدین آ پہنچتا ہے اور کہتا ہے اس دانے کے چار حصے کر ڈالو۔ایک حصہ مجھے دو۔ کیوں کہ زمین میری ہے۔ایک حصہ دانے کا سرکار کو دو کیوں کہ تلوار اس کی ہے،ایک حصہ میران شاہ لے لیتا ہے کہ بیج اس کا ہے اور ادھار کا سود۔۔۔اور پھر کسان کی نگاہوں میں سردیوں کی برف پھیل جاتی ہے۔اس کے سندر سپنے منجمد ہونے لگتے ہیں۔اور اس کے بچے کے ننگے پاؤں سے خون بہنے لگتا ہے۔ پھر

کسان دیکھتا ہے کہ اس کی امیدوں کا وہ پودا جس کی شاخوں سے محبتیں، مسرتیں اور
آرزوئیں جھڑ گئیں۔ اور وہ پورا اسی طرح ننگا کھڑا ہے اور کسان مٹھی بینچ لیتا ہے۔ (۵۰)

استحصال زدہ کسان ناواقف ہیں کہ یہ پیداوار اور اس سے حاصل ہونے والی مالیت ان کی محنت کا نتیجہ ہے بل کہ وہ اسے قسمت کا لکھا تصور کر کے استحصال در استحصال کرواتے چلے جاتے ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر کرشن چندر نے انقلابی تصور کے تحت سخت سزاوں اور ظلم کے خلاف کسانوں کی کشمکش کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ کسان زندگی کی رونقوں، زندگی کی سہولیات اور انسانی تقاضوں سے لاتعلق کھیتوں میں محنت کیے جاتے ہیں اور استحصال کراتے جاتے ہیں۔

۱۹۵۷ء میں ترقی پسند فکر کے حامل ناول نگار شوکت صدیقی کا ناول "خدا کی بستی" منظر عام پہ آیا جس نے وہ تمام راز افشا کیے جن پہ پردہ ڈالنے کی سعی کی جارہی تھی۔ وہ راز جو آزادی کے بعد پاکستانی معاشرت کا ناسور بن رہے تھے۔ افراد معاشرہ کی معاشی و معاشرتی بدحالی، جرائم، اخلاقی گراوٹ، چوری، زنا، کرپشن، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی لوٹ کھسوٹ اور نوجوانوں کی بے رہروی جیسے تمام عناصر کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ وہ لوگ جو خواب سجائے مملکت خداد میں اس امید سے آئے تھے کہ ان کی زندگی نئے رنگ وروپ کے ساتھ ایک بار پھر مسکرائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔

پاکستانی سماج اپنی ابتدا سے ہی مختلف طبقات، گروہوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں میں منقسم ہو گیا ہے۔ متوسط اور غریب افراد کے حالات زندگی سنورنے کے بجائے بدتر ہو گئے۔ یہ ناول اس معاشرے کی گندگی کا منھ بولتا ثبوت ہے جس کا قیام اس سرزمین پہ ہوا۔ کہانی چند بچوں کے گھر سے نکالے جانے سے شروع ہوتی ہے جو آگے چل کر چوری چکاری، ڈاکہ اور مختلف جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ وہ عادی مجرم نہیں تھے بل کہ زندگی کی آسائشوں اور سہولتوں کے فقدان نے انھیں مجرم بنادیا۔

مارکسی فلسفے کے تناظر میں جب سماج طبقات میں بٹ جاتا ہے تو اس کی اخلاقی قدریں کھوکھلی ہو جاتی ہیں اور معاشرہ سماجی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسانی قدروں کی پامالی ہوتی ہے اور افراد معاشرہ مختلف جرائم کرنے پہ مجبور ہوتے ہیں۔ دولت اور منافع کی دوڑ میں وہ معاشرتی اقدار سے ٹکراتے ہیں جس سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور جس سے بیگانگی جنم لیتی ہے۔ ڈاکٹر اسلم آزاد لکھتے ہیں:

شوکت صدیقی نے زندگی اور اس کی تمام تلخیوں کو وسیع تجربات و مشاہدات کے آئینے
میں دیکھا اور اپنے دور کی سماجی کشمکش و معاشی الجھنوں اخلاقی گمراہیوں اور پیچیدہ

> معاشرتی حقیقتوں کو تفصیل کے ساتھ پلاٹ میں سمونے کی کوشش کی ہے۔۔۔انہوں نے بے رہروی کو چھپانے کے بجائے بے نقاب کیا ہے۔ بے اعتدالیوں کی وضاحت کی ہے۔ سماجی گمراہیوں اور استحصالی رویوں کی پشت پناہی نہیں کی بل کہ ضرب لگائی ہے۔ ایک حسین خواب کی خوفناک تعبیر سے پیدا ہونے والے ماحول کی نہایت کامیاب عکاسی کی ہے۔[۵۱]

شوکت صدیقی نے مختلف جرائم، جرائم کے محرکات اور طبقاتی کشمکش کو اپنا موضوع بنایا ہے۔انھوں نے سماج کی اس اخلاقی گرواٹ کو سامنے لایا جو آزادی کے بعد ہمارے معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔یہی اخلاقی گرواٹ، جرائم، بے رہروی، چوری، ڈاکہ زنی انسانوں سے انسانوں اور نوعی تقاضوں سے بیگانگی کی مثال ہے۔جہاں انسان ذاتی مفادت کی خاطر اجتماعی معاشرے کی جڑیں کاٹ دیتا ہے۔ان کے دوسرے ناول "جانگلوس" میں بھی مارکسی بیگانگی کے عناصر موجود ہیں بل کہ "جانگلوس" خدا کی بستی کی اگلی صورت کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔

"اداس نسلیں" جیسے شاہکار کے خالق عبداللہ حسین کے ناول "نادار لوگ" میں بھی ہمیں بیگانگی کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔یہ ناول سکوت ڈھاکہ کے تناظر میں تحریر کیا ہے جس میں تقسیم کے محرکات، تقسیم سے پیدا ہونے والے حالات اور پاکستانی سماج پر اثرات اور نفسا نفسی کا بیان ہے۔عبداللہ حسین نے کسانوں اور مزدوروں کو بھی کرداروں کی صورت میں پیش کر کے ملک کے داخلی انتشار اور عدم استحکام کے پس پردہ عناصر کی نشاندہی کی ہے۔

"نادار لوگ" ایسی قوم کی کہانی ہے جو نسل در نسل غلامی کا طوق پہنے اپنے اوپر مسلط کیے جانے والے ڈکٹیٹرز، جاگیر دار سرمایہ دار اور سیاستدانوں کے سامنے اپنا سر مشیت ایزدی سمجھ کر خود ہی جھکا دیتی ہے۔ناول میں انہوں نے اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے مزدور مردوں، عورتوں اور بچوں کا ذکر کیا ہے جو نسل در نسل بھٹے پر کام کرتے ہیں اور خریدے و بیچے جاتے ہیں۔نسل انسانی کی تذلیل کس طرح سے ہوتی ہے اور افراد معاشرہ کس طرح سے اپنے ہی معاشرے سے کٹ کر زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں اس کا اثر ہمیں واضح طور پر "نادار لوگ" میں نظر آتا ہے۔اقتباس دیکھیے جس میں مزدوروں کی خرید و فروخت کے حوالے سے کردار آپس میں گفتگو کرتے ہیں:

اس پیشگی کی رقم سے ان کے سارے کنبے کی زندگی کا سوداطے پاتا ہے۔ پیشگی کی رقم کا تعین ہی اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ کنبے میں کتنے ہاتھ کام کرنے والے ہیں نہ عورت کا سوال نہ بچے کا پانچ سال سے لے کر اسی سال کی عمر تک صرف ہاتھ کی تعداد گنی جاتی ہے اور پیشگی طے پاتی ہے۔ اگر مزدور ایک مالک سے تنگ آکر دوسرے بھٹے پر جانا چاہے تو مالک اسے پیشگی کی پرچی بنا کر دیتا ہے دوسرا مالک پہلے کو پرچی کی رقم ادا کر کے مزدور کو بمعہ اہل وعیال خرید لیتا ہے۔ (۵۲)

مذکورہ بالا اقتباس انسانی تذلیل کی عکاسی کرتا ہے۔ بھٹے پر کام کرنے والے مزدور اپنے اہل و عیال سمیت ساری ساری زندگی محنت کرتے ہیں اور خریدے اور بیچے جاتے ہیں ان کا کردار ایک مشین کے جیسا ہے وہ کبھی ایک مالک اور کبھی دوسرے کے ہاتھوں فروخت ہوتے ہیں۔ وہ اس چیز سے بے خبر کہ وہ انسان ہیں اور بطور جنس چند ہاتھوں میں گردش کر کے ان کی آمدنی کا ذریعہ بنتے ہیں۔ ان کا سماج سے کوئی تعلق نہیں ہوتا جو صرف دو وقت کی روٹی کے لیے مشین کی طرح کام کرتے ہیں اور اپنے پیٹ کا جنم بھرتے ہیں۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے چاہے وہ بھٹے پر کام کرنے والے مزدور ہوں یا کسی جاگیر دار کے ہاں کام کرنے والا مزارع اور کسان۔

اس لئے مارکس نے کہا تھا کہ سرمایہ داری نظام آج کے دور کی وہ لعنت ہے جو انسانیت کو طبقات میں بانٹ کر اسے حیوانی سطح سے بھی نیچے گرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ انسان حیوانوں کی سطح پر چلے جاتے ہیں اور حیوان انسانی سطح پر آجاتے ہیں اس سے بڑی اور کیا تذلیل ہو گی کہ افراد معاشرہ خرید و فروخت کے ذریعے سے لوگوں کے بھٹوں پر محنت کر کے ان کے سرمائے میں اضافہ کریں اور اپنے پیٹ بھریں۔ ایسے انسانوں کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے جو محنت کے ساتھ خود کو بھی بیچنے پر مجبور ہیں اس سے زیادہ اور بیگانگی کیا ہو گی کہ افراد اپنی ذات تک سے بیگانے دولت پیدا کرنے والی مشین بن کر رہ جاتے ہیں۔

ان کا دوسرا ناول "اداس نسلیں" بھی اپنے پس منظر میں میں بیگانگی کی صورت لیے ہوئے ہے۔ کسان قحط، جاگیرداروں کے ظلم اور خشک سالی سے پریشان ہو کر کارخانے میں کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ وہ مشین کے ساتھ مشین بن جاتے ہیں اور گاؤں کی زندگی کو یاد کر کے دکھی ہوتے ہیں جہاں تازہ ہوا سے وہ اپنی روحوں کو تسکین فراہم کرتے تھے آج وہ کارخانے میں مشین کی طرح دن رات محنت میں مصروف اپنے آپ سے دور

ہو چکے ہیں۔ بالخصوص مرکزی کردار نعیم کا چھوٹا بھائی علی معاشی تنگی کی وجہ سے بد تمیز اور خود سر ہو جاتا ہے۔ شہر میں جا کر کپڑے کا کام کرتا ہے اور ایک ہی جگہ کام کر کر کے وہ خود کو قیدی تصور کرتا ہے۔

"خوشیوں کا باغ" انور سجاد کا ناول ہے یہ ناول تین حصوں پر مشتمل ہے اس کا تیسرا حصہ تیسری دنیا کی سماجی پستی، معاشی تباہی دولت کی عدم تقسیم، غلامانہ طرز زندگی، انتشار، اخلاقی زوال اور معاشرتی برائیوں کی داستان رقم کرتا ہے۔ تیسری دنیا کے افرادِ معاشرہ افلاس، بے توقیری، جبر و تشدد کی وجہ سے احتجاج کی قوت سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ پورا معاشرہ لالچ، بے حسی، ہوس جیسی بیماریوں میں مبتلا ہو کر آدم خوروں کی بستی بن چکا ہے۔ جہاں حقیقی سکون و راحت تو دور ناول کا ہیرو اپنی شناخت تک نہیں رکھتا۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک چیف اکاؤنٹنٹ ہے اس کردار پر گزرنے والی واردات تیسری دنیا کی تباہ حالی کا بیان ہے۔

یہ اس معاشرے کی کہانی ہے جس کے افراد استحصال کی چکی میں پس رہے ہیں عالمی طاقتیں انسانی خطوں کو دولت کے ترازو میں تول رہی ہیں۔ کبھی جنگ، کبھی دوستی، کبھی سود کی مد میں دوسری اقوام میں اپاہج پن پیدا کر کے ان کی آزادی کے پیروں میں بیڑیاں ڈالی جا رہی ہیں۔ قرض کی مد میں سود سے تیسری دنیا کی اقوام کی حالت بدتر سے بدتر ہو گئی ہے ان اقوام کے افراد اپنی ساری زندگی ان قرضوں کی ادائیگی میں گزار دیتے ہیں۔ ان کی محنت کو چند افراد استعمال کرتے ہیں جو نہ صرف قوم کو اپنا غلام بناتے ہیں بلکہ عالمی طاقتوں کی غلامی میں دھکیل دیتے ہیں۔ تیسری دنیا کے یہ افراد معاشرہ نہ صرف اپنے حکمرانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ظلم کا نشانہ بنتے ہیں بلکہ عالمی طاقتوں کی پالیسیوں کا بوجھ بھی ان پر ہی پڑتا ہے ان کی محنت پر مقامی اور عالمی طاقتیں مل کر عیش کرتی ہیں۔ مشتاق احمد وانی لکھتے ہیں:

> انور سجاد کے ناول خوشیوں کا باغ میں تیسری دنیا کا ایک باشعور شخص ہے جو اپنے حقوق کی حق تلفی کا ذمہ دار اور ایسے معاشرے کے افراد کو ٹھہراتا ہے جہاں سرمایہ کاری اور دوسری ناپاک طاقتیں اب انسان کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے اپنے مفاد کے لیے استعمال کر رہی ہیں۔ (۵۳) (۴)

تیسری دنیا کے یہ ممالک اس پہلو سے بے خبر اپنا استحصال کراتے ہیں کہ ان کی محنت کا نتیجہ کوئی اور لے جاتا ہے۔ یہاں اقوام دوسری اقوام کی خستہ حالی پہ اپنی عمارت تعمیر کرتی ہیں۔ "ٹیڑھی لکیر" عصمت چغتائی کا ناول ہے اس میں بھی مارکسی عناصر کے اثرات موجود ہیں۔ "ٹیڑھی لکیر" کا مرکزی کردار ایک متوسط گھرانے کی لڑکی ہے جو اپنے والدین کے ساتھ جس ماحول میں جیتی ہے اس کے رد عمل کے طور پر آنے والے

دنوں میں بے راہ روی اور گمراہی کا شکار ہو کر جنسیت کی طرف اس کا رجحان بڑھ جاتا ہے۔ خاندان کی مختلف پابندیوں، روک ٹوک اور سماجی روایات سے بغاوت کرتی ہے۔ اس کے اندر دوسروں کو دیکھ کر حسد پیدا ہوتا ہے اور اس طرح اس کے داخل میں اپنے ہی گھر والوں کے خلاف نفرت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس ناول میں عصمت نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سخت پابندیوں اور تہذیب و روایات کے ساتھ ساتھ متوسط خاندان میں والدین کی عدم توجہ بچوں کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عصمت اپنے اس ناول میں اپنے کرداروں کی نفسیاتی الجھنوں کا ذکر کرتی ہیں جن کے پس پردہ سماج کی خستہ حالی اور ٹوٹ پھوٹ کارفرما ہے۔ اسی لیے قمر رئیس نے ثمن کے کردار کو سامنے رکھتے ہوئے لکھا ہے:

> ہر لحظہ ارتقاء پذیر ثمن کے کردار کی عکاسی میں عظمت گرد و پیش کی آویزش اور سماجی اثرات کو نظر انداز نہیں کرتی۔ ثمن کا جذباتی اور ذہنی سفر متوسط طبقے کی جس گھناونی گھریلو فضا اور پیچیدہ راستوں سے ہوتا ہے عصمت اس کی طرف بلیغ اور معنی خیز اشارہ کرتی ہیں۔ (۵۴)

ثمن کے کردار کے علاوہ بھی اس ناول کے باقی کردار الجھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جس نفسیاتی پن کا اظہار اس ناول میں ہوا ہے اس نفسیاتی پن کی وجہ سماجی حالات ہیں جس کا اثر براہ راست معاشرے کے افراد پر ہوتا ہے اور وہ سماج کو خود سے علیحدہ تصور کرتے ہیں۔ اس طرح وہ ان کاموں کو بھی کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو اخلاقی اور سماجی سطح پر برے خیال کیے جاتے ہیں۔

غلام ثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں" بھی سماجی بیگانگی یعنی طبقاتیت کو اپنا موضوع بناتا ہے۔ اس ناول کا اہم کردار عبدالرحمان عرف "ماہنا" ہے اس کی شیماں کے ساتھ محبت میں ذات برادری اور طبقاتی نظام رکاوٹ بنتا ہے۔ سماجی نظام ان کی محبت میں ولن کے کردار کے طور پر اثر انداز ہوتا ہے۔ غلام ثقلین نقوی نے گاؤں کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ جاگیر داری نظام اور طبقات، مختلف گروہ، مذہبی اور لسانی اختلافات، محبت و نفرت اور غم و خوشی، حسد، کینہ اور منافرت اس ناول کے اہم موضوعات میں شامل ہیں شہزاد منظر اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> میرا گاؤں غلام ثقلین نقوی کا پاکستان کی دیہی زندگی کے بارے میں لکھا جانے والا ایک اہم ناول ہے جو دراصل چک مراد نامی گاؤں کی نہیں پورے پاکستان کے دیہات کی کہانی ہیں۔ جہاں جاگیر دارانہ نظام کی جڑیں گہرائی تک پیوست ہیں اور جاگیر دار طبقہ

پولیس اور پیروں کے اشتراک سے مظلوم کسانوں کو ظالمانہ انداز میں لوٹنے کھسوٹنے میں مصروف ہے۔ (۵۵)

غلام ثقلین نقوی نے اس ناول میں جاگیر داری نظام کے جو پہلو بیان کئے اور کسان کے استحصال کا ذکر کیا ہے یہی در حقیقت محنت کش کی محنت سے بیگانگی اور مجبوری کی مثال ہے۔ بلاشبہ طبقاتی نظام بذات خود مارکسی بیگانگی ہے جہاں طبقات ایک دوسرے سے بطور انسان بے گانے ہوتے ہیں۔ اس لیے مارکسی بیگانگی کی انسانوں کی انسانوں سے بیگانگی کی بہترین مثال "میرا گاوں" کی صورت میں موجود ہے۔

اردو ناول میں تنہائی اور بے گھری کے احساس کی ایک اور مثال وہ ناول بھی ہیں جن میں ہجرت کے واقعات کا بیان ہے۔ تقسیم ہندوستان کے وقت بڑی آبادی نے ہجرت کی۔ اس تقسیم کے دوران میں لاکھوں انسانوں کا قتل عام، اغوا، ظلم و بربریت کسی خوفناک جنگ کا منظر نامہ بیان کرتے ہیں جس سے انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ ہجرت کا عمل تو تکلیف دہ تھا ہی اس تکلیف کا احساس اس وقت مزید بڑھ گیا جب ہجرت کے بعد سارے خواب، نظریات اور تصورات بکھر گئے۔ لوٹ کھسوٹ، بے گھری اور بعد کے فسادات نے مہاجرین کو احساس زیاں کا شکار بنا دیا اور انہیں ماضی سہانا لگنے لگا۔

ہجرت کے تناظر میں لکھے گئے ناولوں میں ہمیں شدید قسم کی مغائرت، تنہائی اور اجنبیت کا احساس ملتا ہے۔ ناول نگاروں نے بے گھری اور اجنبیت کے احساس کو بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ انتظار حسین کا ناول "بستی" اس کی واضح مثال ہے جس میں تقسیم ہندوستان اور ہجرت کے نتیجے میں داخلی شکست و ریخت، مذہبی و لسانی اور گروہی لڑائیاں "بستی" کے کردار ذاکر کو ماضی کی یادوں کی طرف دھکیل دیتی ہیں۔ "بستی" میں جس ناسٹیجیا کا گہرا عکس دکھائی دیتا ہے دراصل یہ انھی خارجی محرکات کا نتیجہ ہے۔ یہ خارجی حالات ہی ہیں جو ذاکر کو حال سے بیگانہ کر کے ماضی میں جذباتی پناہ تلاش کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ انتظار حسین نے اپنے دوسرے ناولوں "تذکرہ" اور "دو گز زمین" کے کرداروں کے یہاں بھی اسی ہجرت کے احساس کو برتنے کی کوشش کی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ جب انسان اپنے ماحول اور گردوپیش سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ ماضی کے اچھے وقت کو یاد کر کے راحت محسوس کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں وہ موجودہ سماج سے خود کو الگ کسی اور دنیا میں تصور کر رہا ہوتا ہے۔ ہجرت کے مسائل، سقوط ڈھاکہ، پاکستان میں دولت کی لوٹ کھسوٹ، دولت کی بے جا نمائش، افراتفری اور مہاجرین کی اس بے گھری کا احساس قرۃ العین حیدر کے ناول "چاندنی بیگم" میں بھی نظر آتا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے یہ احساس پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنگلہ

دیش کے قیام کے بعد ہجرت کر کے آنے والوں پر کس طرح بیگانگی، بے گھری، تنہائی اور اجنبیت کے احساس نے وار کیے۔ ان کے دوسرے ناول "میرے صنم خانے" اور "سفینہ غم دل" کے علاوہ "آگ کا دریا" کے آخری حصے میں بھی کچھ ایسے پہلو موجود ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ افراد داخلی طور پر جس انتشار کا شکار ہوتے ہیں اس کی وجہ خارجی حالات ہیں۔

"خواب رو" جوگندر پال کا ناول ہے اس میں بھی ہجرت کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیگانگی اور تنہائی بھی ماحول کی پیداوار ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے ماحول میں سماجی حالات، معاشی ناہمواری، دولت، استحصال، قتل و غارت گری، ظلم و بربریت سے متاثر ہوتا ہے تو نفسیاتی پن کا شکار ہو کر ماضی کی طرف لوٹتا ہے اور خود کو سماج سے الگ تصور کرنے لگتا ہے۔ بلاشبہ ماحول ہی وہ محرکات فراہم کرتا ہے جو کسی بھی شخص کو سماج سے دوری اختیار کرنے، کام میں دلچسپی کے بجائے اکتاہٹ، اخلاقی قدروں پر عمل کرنے کے بجائے بغاوت پر اکساتے اور اسے سماج اور اپنی ذات سے بیگانہ کر کے نوعی تقاضوں سے بھی فرار کی راہ نکالنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جس سے سماج میں امن و امان کی جگہ دہشت، خوف، تنہائی اور مغائرت جیسے احساسات جنم لیتے ہیں۔

ان ناولوں کے علاوہ خدیجہ مستور کا ناول "آنگن" اور "زمین" ہوں یا فضل کریم فضلی کا قحط بنگال پر لکھا جانے والا ناول "خون جگر ہونے تک"، بیدی کا "ایک چادر میلی سی" ہو یا، عزیز احمد کا "آگ"، راما نند ساگر کا "اور انسان مر گیا" ہو یا صدیق سالک کا "پریشر ککر"، مستنصر حسین تارڑ کا "دیس ہوئے پردیس" ہو یا انیس ناگی کا "دیوار کے پیچھے" اطہر بیگ کا "غلام باغ" ہو یا حسن منظر کا "دھنی بخش کے بیٹے" کسی نہ کسی سطح پر خارجی محرکات کے زیر اثر افراد کو اپنی ذات میں جینے پر مجبور کر دیتے ہیں انھی خارجی اثرات کو مارکسی بیگانگی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس کی بہ نسبت اگر سماجی کشمکش، اونچ نیچ، لوٹ کھسوٹ، طبقاتی تفریق، مذہبی اور لسانی لڑائی، کرپشن، قتل و غارت گری کا خاتمہ ہو تو معاشرے میں امن اور راحت کا احساس پیدا ہو گا جو انسانوں کو انفرادی دوڑ دھوپ کے بجائے باہمی تعاون کے لئے آمادہ کرے گا۔ اس سے سماج میں شکست و ریخت کی جگہ تعمیری عناصر میں اضافہ ہو گا جو انسانیت کو اس کے نوعی تقاضوں کی طرف گامزن کریں گے۔

اگرچہ اردو ناول میں مارکسی بیگانگی کے تمام عناصر اور محرکات واضح طور پر ہمیں دکھائی نہیں دیتے تاہم اس کے باوجود اردو ناول اپنے اندر بیش بہا ایسا سرمایہ رکھتا ہے جو ہمیں یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ دکھ، کرب، مصیبتیں اور پریشانیاں، دہشت، خوف، افراتفری، ذاتی مفادات خارجی محرکات کی دین ہیں۔ یہ پہلو بھی زیر نظر رہے کہ آج کے جدید معاشرے میں انسان جن مسائل کا شکار ہے چاہے وہ ذاتی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی سرمایہ داریت اس کے پس پردہ ہمیشہ کارفرما رہتی ہے۔

اردوناولوں میں جن عوامی مسائل کا ذکر موجود ہے اس سے مارکس کی بیان کردہ بیگانگی کے دو عناصر بالخصوص اور چاروں عناصر بالعموم دکھائی دیتے ہیں انسانوں کی انسانوں سے بیگانگی اور نوعی تقاضوں سے بیگانگی کا اظہار تو اکثر ناولوں میں پایا جاتا ہے یہ مسائل تقریباہر ناول میں کسی نہ کسی انداز میں دکھائی دیتے ہیں۔ آج انسان اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے بیگانے ہو کر زندگی کی ٹھوکریں کھانے پہ مجبور، زندگی کے مسائل میں الجھ کر دکھ اور پریشانیوں میں مبتلا زندگی گزار رہا ہے۔ جدید انسان باہمی تعاون کے بجائے اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ جس انسان نے نوعی تقاضوں کو بروئے کار لاتے ہوئے انسانیت کے لیے نئے جہان تراشنے تھے اپنی ذات میں الجھ کر رہ گیا ہے۔ یہی مارکسی فلسفہ بیگانگی ہے۔

حوالہ جات

۱۔سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک،مکتبہ دانیال،کراچی،۲۰۱۸ء،ص۲۶۹

۲۔بحوالہ، جمیل اختر محبی،ڈاکٹر،فلسفۂ وجودیت اور جدید اردو افسانہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی، ۲۰۰۲ء،ص۱۸

۳۔ قاضی جاوید،(مترجم)وجودیت اور انسان دوستی از ژاں پال سارتر،مشعل بکس،لاہور،س ن،ص۱۴

۴۔ایضاً،ص۱۷

۵۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،مغرب میں نفسیاتی تنقید،سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء،ص۱۴۷

۶۔شاہین مفتی،جدید اردو نظم میں وجودیت،مقالہ پی ایچ۔ڈی اردو(غیر مطبوعہ)،بہاو الدین ذکریا یونی ورسٹی،ملتان،س ن،ص۰۵

۷۔ایضاً،ص۳۲

۸۔م۔م۔جوہر میر ٹھی،(مترجم) سرمایہ،از کارل مارکس،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۶ء،ص۴۲

۹۔صفدر میر،مارکسی بیگانگی،مکتبہ دانیال،کراچی،۱۹۸۵ء،ص ۲۰

۱۰۔ Karl Marx, Economic and Philosophic Manuscripts of 1844,Progress Publishers,Moscow,1977,p67

۱۱۔بحوالہ،سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک،ص۲۷۵

۱۲۔ Karl Marx, Economic and Philosophic Manuscripts of 1844,Progress Publishers,Moscow,1977,p71

۱۳۔ابحوالہ،سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک،ص۲۷۶

۱۴۔صفدر میر،مارکسی بیگانگی،ص۴۵

۱۵۔سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک،ص۲۷۶

۱۶۔ Karl Marx, Economic and Philosophic Manuscripts of 1844,Progress Publishers,Moscow,1977,p70

۱۷۔سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک،۲۷۸

۱۸۔ Karl Marx, Economic and Philosophic Manuscripts of 1844,Progress Publishers,Moscow,1977,p74

۱۹۔سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک، ۲۸۰

۲۰۔سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک،۲۸۰

۲۱۔ Karl Marx, Economic and Philosophic Manuscripts of 1844,Progress Publishers,Moscow,1977,p73

۲۲۔ Karl Marx, Economic and Philosophic Manuscripts of 1844,Progress Publishers,Moscow,1977,p73

۲۳۔سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک،۲۸۲

۲۴۔کارل مارکس / فریڈرک اینگلز،کیمونسٹ مینی فیسٹو،فکشن ہاوس،لاہو،۲۰۱۸ء،ص۴۵

۲۵۔بحوالہ سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک،ص۲۸۹

۲۶۔صفدر میر،مارکسی بیگانگی،ص۴۷

۲۷۔شاہین مفتی،جدید اردو نظم میں وجودیت،ص۲۲

۲۸۔بحوالہ،صفدرمیر، مارکسی بیگانگی، ص۲۳

۲۹۔کارل مارکس / فریڈرک اینگلز،کیمونسٹ مینی فیسٹو،ص۲۹-۳۰

۳۰۔ ایضاً،ص۳۸

۳۱۔ ایضاً،ص۴۴

۳۲۔ سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک،ص۲۸۹-۲۸۰

۳۳۔مشتاق علی شان،(مترجم) بالشویک پوائنٹ آف ویو از عاصم اخوند،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۱۴ءص۵۷

۳۴۔سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک،ص۴۱۸-۴۱۹

۳۵۔حسبات،فرد کی انفرادی اصلاح،www.hisbaat.wordpress.com، ۲۳ نومبر ۲۰۱۵ء، 09:10pm

۳۶۔سبط حسن،موسیٰ سے مارکس تک،ص۲۷۰

۳۷۔ پائند خان خروٹی، اشتراکی مفکر اعظم کا تصور بیگانگی،www.niazamana.pk، ۲۶نومبر ۲۰۱۶ء 10:23pm،

۳۸۔ کارل مارکس / فریڈرک اینگلز،کیمونسٹ مینی فیسٹو،ص۳۲

۳۹۔لال خان،ڈاکٹر،سماجی بیگانگی،www.dunya.com۱۷ستمبر ۲۰۱۸ء

۴۰۔سجاد ظہیر،ادب اور زندگی،(مضمون) مشمولہ،ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر،مرتبہ پروفیسر قمر رئیس/سید عاشور کاظمی،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی،۱۹۹۴ء،ص۱۵۶
۴۱۔اختر حسین رائے پوری،ادب اور زندگی،انجمن ترقی اردو،اورنگ آباد دکن،۱۹۳۵ء،ص۳۲
۴۲۔ اصغر علی،انجینئر،مارکسی جمالیات،نصرت پبلشرز،لکھنو،۱۹۸۴ء،ص۳۲
۴۳۔عبدالحلیم،ڈاکٹر،مارکسزم اور ادب،(مضمون) مشمولہ،ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر،مرتبہ پروفیسر قمر رئیس/سید عاشور کاظمی،ص۱۹۱
۴۴۔ بحوالہ وہاب اشرفی،پروفیسر،مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی، ۲۰۱۰ء،ص۱۲۶
۴۵۔ عبدالحلیم،ڈاکٹر،مارکسزم اور ادب،(مضمون)مشمولہ،ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر،مرتبہ پروفیسر قمر رئیس/سید عاشور کاظمی،ص۱۹۳
۴۶۔ظہور الدین،پروفیسر،جدید ادبی و تنقیدی نظریات،ادارہ فکر جدید،نئی دہلی،۲۰۰۵ء،ص۱۱۲
۴۷۔مجنوں گورکھپوری،ادب اور زندگی،ایوان اشاعت،گورکھپور،س ن،ص۱۵
۴۸۔ منشی پریم چند،گئودان،مکتبہ جامعہ،دہلی،۱۹۷۲ء،ص۲۲۶
۴۹۔ سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات،آزاد کتاب گھر کلاں محل،دہلی،۱۹۵۶ء،ص۱۱۹
۵۰۔ کرشن چندر،طوفان کی کلیاں،مکتبہ شاہرہ،دہلی،۱۹۵۶ء،ص۲۲-۲۳
۵۱۔ اسلم آزاد ڈاکٹر،اردو ناول آزادی کے بعد،سیمانت پرکاش،دہلی،۱۹۹۰ء،ص۱۵۶
۵۲۔عبداللہ حسین،نادار لوگ،سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،۱۹۹۷ء،ص۱۴۸
۵۳۔بحوالہ محمد ثقلین،اردو ناول میں سیاسی مباحث،پی ایچ۔ڈی اردو(غیر مطبوعہ)مملوکہ،جی سی یونیورسٹی،لاہور،س ن،ص۲۱۲
۵۴۔قمر رئیس،ڈاکٹر،تلاش وتوازن،ادارہ خرام پبلیکیشنز،۱۹۶۸ء ص۴۵
۵۵۔بحوالہ عدنان احمد،اردو ناول پر ادبی تحریکوں کے اثرات،پی ایچ۔ڈی اردو،(غیر مطبوعہ)مملوکہ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،فیصل آباد،۲۰۱۶ء،ص۱۵۹

باب دوم:

منتخب ناولوں میں محنت کار کی محنت اور محنت کی پیداوار سے بیگانگی

محنت کش کی محنت سے بیگانگی کا عام فہم مطلب اتنا ہے کہ افراد محنت میں اپنا اظہار نہیں کرتے۔ ہمارے آج کے سماج میں افراد معاشرہ ہر چیز سے تنگ اور لاتعلق دکھائی دیتے ہیں۔ ارد گرد جہاں بھی نظر دوڑائی جائے تو محنت کش کام کے بوجھ اور ریٹرن کے کم ہونے کا شکوہ کرتے ہیں اور اس کام میں جو انھیں سونپا گیا یا انھوں نے چنا ہے دلچسپی کا اظہار نہیں کرتے۔ مارکسی فلسفہ و فکر کے مطابق جب کوئی سماج طبقات پیدا کرتا ہے تو اس سماج میں یہ کیفیت جنم لیتی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ محنت کش کی محنت کے بدلے میں وجود میں آنے والی شے پر کسی اور کی ملکیت کا ہونا ہے۔ یعنی طبقاتی نظام میں تصور ملکیت ہوتا ہے اور جس کی ملکیت نہیں ہوتی وہ کسی دوسرے کے پاس محنت کرتا ہے۔ وہ محنت جو اس کے ذہن / جسم کی صورت میں اظہار کرتی ہے اس کی شخصیت کے بجائے کسی سرمایہ دار یا جاگیر دار کے نام سے پہچان کراتی ہے۔

یوں اس محنت کش کا محنت سے تعلق ختم ہو جاتا ہے۔ جس چیز پہ اس نے محنت کی وہ اس کی شخصیت کی نفی کرتی ہے اور اس کا پیداوار پہ کوئی حق نہیں رہتا تو وہ محنت سے جی چراتا ہے یا محنت اس سے الگ کوئی وجود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح وہ دوسروں کا غلام بن جاتا ہے اور اس کی اپنی ذات کی نفی ہوتی ہے۔ اسی کو مارکس نے محنت کش کی محنت سے بیگانگی کہا ہے۔

محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی جیسا کہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو محنت اس نے کی اور اس کے نتیجے میں جو شے وجود میں آئی اس سے لاتعلقی ہے۔ یہ پہلو دار صل سماج میں ہر طرح کی بیگانگی کی بنیاد بنتا ہے۔ ایک محنت کرنے والا شخص جب کوئی چیز تخلیق کرتا ہے تو اس چیز پر پہلا اور بنیادی حق اس کی ذات کا ہوتا ہے مگر سرمایہ داری اور جاگیر داری نظام نے ملکیت کے تصور سے اس سے یہ حق چھین لیا ہے۔ جاگیر داری سماج میں تو پھر کسی حد تک یہ تصور موجود رہا ہے کہ جو کوئی چیز پیدا کرتا تھا کسی نہ کسی حد تک اس پہ اس کا حق تسلیم کیا جاتا تھا مگر سرمایہ داریت نے اسے سرے سے ختم کر دیا۔ اب محنت کی پیداوار سرمایہ دار یا مالک کی ہوتی ہے اور محنت کش کو بدلے میں کچھ حصہ دیا جاتا ہے۔ یوں محنت کش جو محنت کرتا ہے اور کوئی چیز تخلیق کرتا ہے اس کی ذات کے اظہار کے بجائے کمپنی مالکان کے نام کا اظہار کرتی ہے۔ محنت کش صرف اجرت وصول کرتا ہے اور

اس چیز سے لاتعلقی اختیار کرتا ہے جو اس نے اپنی صلاحیتوں کے مطابق پیدا کی تھی۔مارکس نے اسے ہی محنت کی پیداوار سے بیگانگی کہا ہے اور اسی پہلو کو بیگانگی کی دیگر صورتوں کی وجہ گردانا ہے۔ محنت کش کو محنت کا برابر صلہ ملنے سے مراد بھی یہی ہے کہ اس تخلیق کو محنت کش کی ذات کے اظہار کا موقع اور پورا حق ملنا چاہیے۔جب یہ حق اسے نہیں ملتا تو وہ چیزیں پیدا تو کرتا ہے مگر دوسروں کی ملکیت کے لیے اور یوں وہ خود پیداوار سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

فائر ایریا:

"فائر ایریا"الیاس احمد گدی کا ناول ہے جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول کوئلے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی کی کہانی کو بیان کرتا ہے۔ ہزاروں سال سے طبقاتی واستحصالی نظام نے نچلے طبقے کی زندگی کو اجیرن بنا رکھا ہے۔ برصغیر کے عوام بھی پچھلی دو تین صدیوں سے اسی ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں ۔ناول کے ذریعے ہندوستان کے نچلے متوسط طبقے کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک اور مزدوروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔فائر ایریا بنیادی طور پر ایسی جگہ کو کہتے ہیں جہاں سے کوئلہ نکال لیا گیا ہو اور زمیں اندر سے خالی ہو ایسی جگہ خطرناک قسم کی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے اس لئے اس کو فائر ایریا کہا گیا ہے۔

"فائر ایریا"بنیادی طور پر مزدوروں کے استحصال ان کی کسمپرسی ، قتل و غارت گری ،دھاندلی، سودخوری، عیاشی، نشے کی لت، جنسی زیادتی اور ناانصافی پر مبنی ہے۔ یہ ایسے لوگوں کی کہانی ہے جن کی زندگی اندھیری کالی سرنگوں میں زمین کے اندر ہزاروں فٹ نیچے اندھیرے میں گزرتی ہے۔ان کے ساتھ سیکڑوں مسائل پیش آتے ہیں انھیں زندگی کے کے آثار سے دور کالی غاروں میں پیٹ کی پوجا کے لیے جینا پڑتا ہے۔

مزدوروں کی زندگی غربت، جہالت ،کم اجرت ،خود غرضی، لالچ ،چاپلوسی اور رشوت خوری کی بھینٹ چڑھ جاتی مقامی وغیر ملکی افسروں ٹھیکیداروں اور غنڈوں کے ذریعے سے مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے،عورتوں سے جنسی تعلقات قائم کئے جاتے ہیں، قتل وغارت گری ہوتی ہے،سود کے ذریعے ان غریبوں کو زندگی بھر کڑ کڑ کے جینے پر مجبور کیا جاتا ہے لیکن ان کے پیٹ کی بھوک کو کم کرنے اور ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں ہوتے وہ دن رات اندھیری غاروں میں کام کرتے ہیں اور بدلے میں ان کو چند روپے دیئے جاتے ہیں جو ان سے یونین اور فنڈ کے نام پر لوٹ لئے جاتے ہیں۔

ناول بنیادی طور پر تین حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں ۱۹۴۷ء تک کے حالات کا تذکرہ ہے دوسرے حصے میں آزادی کے بعد سے ۱۹۷۱ء کے حالات کا بیان ہے اور آخری حصے میں کوئلوں کی کانوں کو قومیانے ۱۹۷۱ء کے بعد کا حصہ ہے۔ تینوں حصوں میں مزدوروں کے استحصال، ان کی غربت، سیاسی مفادات اور لیڈروں کی یونین کے ذریعے چالاکیوں کا بیان ہے۔ یوں تو ناول کے کئی موضوعات ہیں جو مارکسی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں اور آخری مرحلے میں مارکسی سوچ کو غالب کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ناول کے کئی کردار ہے جن کے گرد کہانی گھومتی ہے تاہم مرکزی کردار سہدیو کا ہے جو چھوٹے ناگپور کی ایک سرسا کولیری میں کام کرنے کے لیے گاؤں سے آتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کرداروں میں رحمت میاں، ننکو، جگشیر، کالاچند، جوالا مصر، کپل سنگھ، حاضری بابو، مدنا، اصغر خان، سمال صاحب، وائٹ صاحب، انعام الخان، پی این ورما، مزدور سنگھ، پرتی بالا، خنتونیا، عرفان، مجمدار وغیرہ شامل ہے اور ان کے علاوہ کئی کردار اس کہانی کو بڑھانے میں اہم ہیں۔

یہ ناول استحصالی طبقے کی مکاریوں اور غریب مزدوروں کے خوابوں کی کہانی ہے۔ جو اپنی آنکھوں میں خواب سجائے اس کالی دنیا میں پیسے کمانے آتے ہیں لیکن یہاں ان کا صرف استحصال کیا جاتا ہے۔ ارشاد احمد کوچھے اپنے ایک مضمون میں اس ناول کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> فائر ایریا الیاس احمد گدی کا شہکار ناول ہے جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے کول فیلڈ میں کام کرنے والے مزدور طبقے کی بے کسی و بے بسی کو موضوع بنایا ہے جو اپنے خوابوں کی تکمیل کی خاطر اپنی پوری زندگی محنت شاقہ میں صرف کرتے ہیں لیکن پھر بھی ان کے خواب ادھورے رہ جاتے ہیں اور انہیں پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔۔۔ وہ ایک طرف کمپنیوں کے ملاکان، یونین لیڈروں اور ان کے کارندوں کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں تو دوسری طرف سود خواروں کے چنگل میں گرفتار ہو چکے ہوتے ہیں جو ان کے جسم سے طرح خون چوستے ہیں کے وہ چاہا کر بھی اپنے پیروں پر کھڑے نہیں ہو پاتے بلکہ ہر وقت ان کی امداد کے محتاج رہتے ہیں اور خاموش تماشائی کی طرح اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا تماشا دیکھتے ہیں۔ (۱)

یہ ایک ایسا ناول ہے جس نے پہلی مرتبہ اندھیری کوٹھڑی کے اندر ہزاروں فٹ نیچے کام کرنے والوں کی زندگی کا احاطہ کیا۔ یہ ناول خالصتا مارکسی سوچ کی عکاسی کرتا ہے یہاں اس کا جائزہ مارکسی بیگانگی کے تناظر میں لیا جاے گا۔

ا۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی:

جب کسی سماج میں رہنے والے افراد معاشرہ زندگی گزارنے کے لیے سماج میں محنت کرتے ہیں تو سماج ان کی اس محنت کے نتیجے میں ترقی کرتے ہوے آگے بڑھتا ہے۔ سماج کے قیام اور ترقی کی یہ شرط ہے کہ افراد معاشرہ آپس میں مل جل کر امداد باہمی کے تحت محنت کریں۔ ان کی اس محنت اور تعاون میں ان کے مسائل کا حل چھپا ہوتا ہے وہ اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں ۔ طرح طرح کے کاموں کے نتیجے میں سب ایک دوسرے کی ضروریات کو پورا کرتے اور آگے بڑھتے ہیں۔

انسان کسی بھی سماج میں قدرتی وسائل کو محنت کے ذریعے سے تصرف میں لاتا ہے قدرتی وسائل خام مال کی صورت میں موجود ہوتے ہیں جن پر انسانی محنت ہوتی ہے اور وہ قابل استعمال بنتے ہیں۔ مختلف افراد مختلف انداز یا نوعیت کی محنت کرتے ہیں لیکن طبقاتی سماج میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ اس معاشرے میں چند افراد طاقت اور سرمائے کے زور پر ملکیت کے دعوے دار بن جاتے ہیں باقی افراد ان کی مالکیت پر کام کر کے روٹی حاصل کرتے ہیں۔ چونکہ ذرائع پیداوار طبقاتی سماج میں کثیر طبقے کے پاس نہیں ہوتے اس لئے یہ کثیر طبقہ اپنی محنت کے ذریعے سے زندگی کی چند ضروریات حاصل کرتا ہے اور باقی کی اس کی محنت مالک لے لیتے ہیں یعنی محنت کش کی محنت کا پھل ذرائع پیداوار کے مالکوں کے پاس چلا جاتا ہے۔ محنت کسی اور کی ہوتی ہے وہ کسی اور کی ملکیت بن جاتی ہے یوں کسی مزدور کی محنت کا اس کے پاس نہ رہنا مزدور کو محنت نہ کرنے کی طرف غیر شعوری طور پر راغب کرتا ہے۔

جب مزدور کی محنت کسی اور کی ملکیت بن جاتی ہے تو وہ اپنی محنت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ اس کا محنت کرنے میں جی نہیں لگتا وہ محنت تو کر لیتا ہے مگر اس میں اس کی ذات کی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ اس کی مجبوری ہوتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مزدور اپنی صلاحیت کے مطابق کام سرانجام دیتا جس سے اس کی صلاحیت کا اظہار ہوتا لیکن سرمایہ داری سماج میں مزدور کی محنت اس کی نہیں رہتی یوں اس کا محنت کرنے سے اور اپنی صلاحیتوں کو عمل میں لانے سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے اور وہ پیٹ بھرنے اور زندہ رہنے کے لیے خود کو پیش کرتا ہے۔

"فائر ایریا" کی کہانی بھی کچھ ایسی ہے جہاں محنت کش اپنی خوشی اور دلچسپی سے کام نہیں کرتے بلکہ مجبوری کی وجہ سے کام کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سہدیو جب رحمت میاں کی مدد اور ہلکے کام دینے کے لیے مائننگ سردار سے بات کرتا ہے تو مائننگ سردار بد دلی سے راضی ہوتے ہوئے کچھ یوں اظہار کرتا ہے جس سے لگتا ہے ان کولیریوں میں کوئی بھی دلچسپی سے کام نہیں کرتا" نئی بات تھی، سردار کو عجیب لگی کیونکہ یہاں کوئی آدمی اپنے حصے کا کام بھی صحیح نہیں کرنا چاہتا۔۔۔"(۲)

یعنی یہاں کولیریوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو کام کرنے میں کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ انہیں ان کے حصے کا جو کام ملتا وہ اس کو بھی پورا نہیں کرتے بلکہ حیلے بہانوں سے وقت گزارنے کی سعی میں لگے رہتے ہیں۔ جب کام میں مزدور کی ذاتی دلچسپی نہ ہو تو وہ کام کام نہیں بلکہ مجبوری اور بے گار بن کے رہ جاتا ہے۔ کوئلے کی ان کانوں میں رہنے والے جب محنت کا معاوضہ لیتے ہیں تو ان کے پاس اتنا ہی بچتا ہے جس سے روٹی خریدی جاسکے ایسے میں وہ کام کرنے سے جی چرانے لگتے ہیں اور کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں۔

رحمت میاں جو گاؤں میں خاں صاحب جیسے جاگیرداروں کے یہاں کھیتوں میں کام کرتا تھا اس کام کے بدلے میں وہ جاگیر دار اتنا ہی دیتے تھے جس سے وہ دوبارہ کام کرنے کے قابل ہو۔ ایسے میں اس کا دل بھر گیا اور وہ کولیری میں کام کرنے چلا آیا جہاں اسے اپنی ذات سے بھروسہ ہی اٹھ چکا تھا آیا کہ وہ محنت کر بھی سکے گا یا نہیں:

> "زندہ رہنے کے لیے کون سی چیز ضروری ہے ایک چیز ہوتی ہے حق المحنت، یعنی آدمی جو محنت مشقت کرے، جسکے لیے دھوپ میں جلے، پانی میں بھیگے، اس کا کچھ بدل بھی ملنا چاہیے۔ جب یہی بدل نہیں ملتا تو آدمی آئستہ آئستہ اندر سے مرنے لگتا ہے۔ رحمت گاؤں کے بڑے کاشتکاروں، خان صاحبوں کی بیگار کرتے کرتے اتنا ٹوٹ چکا تھا کہ اس کو یقین بھی نہیں آتا کہ وہ یہاں کام بھی کر سکے گا۔ چنانچہ وہ بار بار سہدیو سے پوچھتا مجھ سے ہو جائے گا اتنا محنت کا کام؟(۳)

انسان فطرت کے اعتبار سے تخلیقی صلاحیتیں رکھتا ہے اور مشکل سے مشکل کام کرنے کی بھی صلاحیت اس میں موجود ہوتی ہے لیکن جب اس کو اس کی محنت کا صلہ نہیں ملتا تو وہ محنت سے گھبراتا ہے۔ اس کی محنت محنت نہیں رہتی بلکہ وہ جانوروں کی طرح پیٹ پالنے کی مجبوری بن جاتی ہے۔ رحمت میاں گاؤں سے آیا تھا وہ کان کے اندر کسی حادثے میں مر جاتا ہے۔ اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا جاتا ہے تا کہ کسی معاوضے اور انکوائری

سے بچا جا سکے۔اس طرح اس کے حوالے سے یہ خبر پھیلائی جاتی ہے کہ وہ کسی عورت کے ساتھ بھاگ گیا۔سہدیو کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ یہ سوچ کر پریشان ہوتا کہ رحمت میاں آخر کہاں گیا ہو گا۔اس کے ساتھ رہنے والے بھی کچھ ایسا ہی خیال کرتے ہیں کیوں کہ کئی مزدور اس طرح سے بھاگ جاتے ہیں رحمت میاں بھی بھاگ گیا ہو گا:

> زیادہ تر لوگوں کی رائے یہی تھی کہ وہ گھر چلا گیا ہے۔چاہے تو گھر سے کوئی خبر آئی ہو۔چاہے خوف کی وجہ سے اکثر ایسے ہی مزدور کام کرتے کرتے نکل کر رفو چکر ہو جاتے تھے۔
>
> یہ عام سی بات تھی بہت۔(۴)

کئی مزدور یہاں سے کام کے خوف اور موت کے خوف وغیرہ سے ڈر کر بھاگ جاتے تھے۔انھیں بھوک کھینچ کر اس کولیری تک لے آتی ہے لیکن اس کولیری کی سخت تابڑ توڑ محنت سے جب وہ تھک جاتے اور بدلے میں ملتے بھی انہیں چار روپیہ فی دن ہوتے ہے تو ان کی زندگی سخت دشوار ہو جاتی ہے ایسے میں ان کے پاس دوسرا حل نہیں ہوتا ہے اور وہ محنت سے بھاگ جاتے ہیں۔

رحمت میاں کے قصے کو دبانے کے لیے طرح طرح کی خبریں پھیلائی جاتی ہیں۔ان خبروں کو سن کر سہدیو کا دل نہیں مانتا کہ رحمت میاں بھاگ گیا ہو گا۔وہ اپنی طرف سے ہر طرح کی کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح وہ اسے ڈھونڈے۔ایسے ہی وہ حاضری بابو کے پاس جب جاتا ہے ۔ حاضری بابو جو خود بھی سارے معاملے میں ملوث ہوتا ہے رحمت کے بارے یہی کہتا ہے کہ وہ بھاگ گیا ہو گا اس کی تاویل وہ کچھ یوں دیتا ہے:

> بات سیدھے یا بد معاش کی نہیں ہے ،بہت سے لیبر کولیری کی ہاڑ توڑ محنت برداشت نہیں کرتے اکثر بھاگ جاتے ہیں۔یہ بات سب لوگ جانتے ہیں اچھا ہے تم اپنا دماغ خراب مت کرو۔(۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب مزدور کی صلاحیتوں کے مطابق اس کو کام میسر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی محنت کے برابر اسے حق ملتا ہے تو وہ محنت کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ وہ کسی طریقے سے اپنی جان بچائے۔وہ کام کے دوران خود کو ایک قیدی کی طرح تصور کرتا ہے اور اس طرح بھاگنا چاہتا ہے۔آخر وہ اس سے تھک ہار کر منہ موڑ لیتا ہے۔جب اس کی صلاحیتیں آزادانہ کام نہ کریں تو وہ بھاگنے میں عافیت

ڈھونڈتا ہے۔ الیاس احمد گدی نے بھی ایسے ہی پس منظر کو یہاں واضح کیا ہے کہ زبردستی کی محنت اسے ایک وقت میں کام کرنے سے بددل کر دیتی ہے۔

"فائر ایریا" کے کولیری مزدور اس سخت محنت سے عاری آ چکے ہوتے ہیں۔ وہ جو محنت کرتے ہیں وہ یونین لیڈروں، ٹھکیداروں کے پاس فنڈز اور سود کی مد میں چلی جاتی ہے اور وہ اوور ٹائم بھی کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انہیں زبردستی کام کرنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تاکہ اس سے اضافی فائدہ حاصل کیا جا سکے ۔اس کے لیے ٹھکیدار اپنے کچھ غنڈے اور پہلوان تیار رکھتے ہیں جو مزدروں سے زبردستی کام کروانے کے فرائض سرانجام دیتے ہیں۔ مزدور اپنی اپنی جگہوں اور رہائش پر بھاگ جاتے تاکہ کام سے بچ جائیں لیکن انہیں زبردستی کانوں میں کام کرنے کے لئے دھکیل کر اضافی کام لیا جاتا ہے۔ کسی غلطی کوتاہی کی صورت میں مارا پیٹا جاتا ہے اور جرمانے کیے جاتے ہیں۔ یہ پہلو اس ناول کا اہم حصہ ہے جس میں اس کا اظہار کیا گیا کہ کس طرح سے مزدوروں سے زبردستی کام کے ذریعے ان کا ذہنی وجسمانی استحصال کیا جاتا ہے۔

"فائر ایریا" میں ذکر کردہ کولیریوں کے مزدوروں کو نہ صرف زبردستی کام کرنے اور کم اجرت لینے پر مجبور کیا جاتا ہے بلکہ ان سے سخت محنت کے کام لیتے ہوئے انہیں بھاگنے پر بھی مجبور کیا جاتا ہے۔ انہیں مارا جاتا ہے، ایسے مزدور مار کھاتے کھاتے بھگا دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی مزدور اس کے خلاف احتجاج کرے یا سر اٹھائے اسے کچل دیا جاتا ہے۔ ایسے میں وہ محنت سے جی چراتے ہیں، ان کے محنت سے جی چرانا مارکسی بیگانگی کے نظریے میں آتا ہے کہ کیسے مزدور محنت کا اصل صلہ / حق نہ ملنے پر محنت سے دور ہو جاتا ہے۔ ان کا محنت سے یہ دور ہونا کوئی فطری نہیں بل کہ ان کی محنت کے استحصال پر منحصر ہے۔

"فائر ایریا" ایک ایسا ناول ہے جس میں محنت کی پیداوار سے بیگانگی کے تمام نتائج کا ذکر کسی نہ کسی پس منظر میں موجود ہے بالخصوص استحصالی ہتھکنڈوں اور مزدوروں کی خاموشی جو سماجی اور نوعی تقاضا ہے ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یاد رہے کہ محنت صرف جسمانی نہیں ذہنی بھی ہوتی ہے اور کسی بھی شعبہ ہائے زندگی کو محنت سے یکسر خالی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ناول میں قتل وغارت گری اور بدمعاشی کے ساتھ ساتھ پولیس کا بھی ذکر ہے جو جرائم کے خاتمے کے لیے دن رات کام کرتی ہے لیکن چونکہ بڑے بڑے لیڈروں اور بدمعاشوں کے گروہوں اور مزدوروں کی خاموشی انھیں کام کرنے نہیں دیتی تو وہ بھی بددل ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی مجرم کو پکڑتے ہیں تو وہ اعلی افراد کے حکم یا گواہی نہ ہونے کی وجہ سے چھوٹ جاتے ہیں اور حتمی نتائج کے طور پر ان کو خاموشی اختیار کرنا پڑتی ہے:

انسپکٹر بینج کچھ تلخ بول جاتا مگر آج دن بھر کی بے نیل دمرام دوڑ دھوپ نے اسے کسی قدر بد دل کر دیا تھا۔ اس لیے چپ رہ گیا۔ دوبے بولتا گیا۔ یہاں کے لوگ ہم لوگوں سے ذرا تعاون نہیں کرتے پھر ہمیں کیا ضرورت ہے خطرہ اٹھانیکی۔ ہم بھی چھوڑ دیتے ہیں کہ جاؤ سالو مرو، ہمیں کیا۔۔۔ (۶)

یعنی جب ان کی اس محنت / عمل کے بدلے میں صلہ نہیں ملتا تو وہ کسی بھی عمل کو کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔ یہی عمل انھیں آہستہ آہستہ اپنی ذات سے بیگانہ کر دیتا ہے اور وہ اپنے نوعی و سماجی تقاضے بھی بھول جاتے ہیں اور رشوت خوری کی لت میں پڑ جاتے ہیں۔

۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی:

محنت کی پیداوار سے بیگانگی کا مطلب ہے کہ محنت کی پیداوار محنت کش کی ملکیت نہیں رہتی ہے بلکہ کسی سرمایہ دار کی ملکیت بن جاتی ہے۔ جب وہ محنت جس کو عمل میں لا کر اس نے کوئی شے پیدا کی وہ شے اس کی ذات سے الگ کسی وجود کی صورت میں کسی دوسرے شخص کے پاس چلی جائے اور اس کا اختیار اس پر نہ رہے تو ایسے میں محنت کی اس پیداوار سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتا ہے۔ وہ پیداوار جو اس نے پیدا کی وہ اس کی نہیں رہتی ،اس کی قیمت کا تعین نہیں کر سکتا بل کہ وہ اب اس کی حریف بن جاتی ہے۔ جو چیز اس نے خود پیدا کی اب وہ اسے خریدنے کی استعداد نہیں رکھتا۔ اس شے کی قدر اور قیمت اس کی پہنچ سے کہیں باہر ہو جاتی ہے۔ ایسے میں وہ شے اس کے لیے اجنبی بن جاتی ہے۔ اس سے اس شے کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اب وہ کسی کمپنی کے نام سے موسوم ہو جاتی ہے۔ یہ کفیت کسی محنت کش کو اپنی پیدا کردہ اشیا کے سامنے بے بس و مجبور بنا کر کھڑا کر دیتی ہے۔

"فائر ایریا" میں بھی کچھ ایسی صورتحال ہے جہاں محنت کش محنت کرتے ہیں لیکن ان کی یہ محنت انھیں نہیں ملتی بلکہ وہ دوسرے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔ ادب پارے میں نوعیت ہو بہو وہی نہیں لیکن اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ کس طرح محنت کش پیداوار سے لا تعلق ہو جاتا ہے۔ اسے صرف اور صرف اپنی محنت بیچنی ہوتی ہے۔ وہ چند روپے لے کر اپنی ذہنی اور جسمانی قوت کو بیچ دیتا ہے۔ کوئلے کی کان میں مزدور جو محنت کرتے ہیں وہ محنت ان کی نہیں رہتی بلکہ کمپنی کی ہو جاتی ہے اور اس کے بدلے میں انہیں اجرت ملتی ہے۔ وہ بھی اتنی کے جس سے وہ اپنا اور گھر والوں کا پیٹ بھر سکیں اور پھر سے کام کرنے کے لئے تیار ہو سکیں۔

کالا چند مزدوروں کو ڈرا دھمکا کر روپے نکلواتا تھا اور انھیں منہ بند رکھنے پر مجبور کرتا تھا۔ ساری زندگی لگا کر مالکوں اور یونین لیڈروں کے لیے کام کیے مگر بدلے میں اسے کچھ بھی ہاتھ نہ آیا بلکہ اس کی محنت بھی سود کی مد میں کاٹ لی جاتی تھی۔ اس بات سے وہ تنگ آ کر اپنے روزمرہ کے کام کی حاضری بھی رجسٹر پہ نہیں کرتا تھا اور جو کماتا تھا وہ سود کے عوض دے دیتا تھا۔ وہ بنا محنت اس رقم کے مالک بن جاتے جنھوں نے کوئی محنت ان روپیوں پہ نہ کی ہوتی تھی۔ یہ کالا چند کی محنت تھی اس جیسے کئی مزدوروں کی محنت تھی جس سے وہ ایک عرصے تک خود بھی بے خبر رہا اور جب احساس ہوا تو لڑائی جھگڑے اور نفرت کے بیج پیدا ہوئے۔

کالا چند ہی کی طرح کے ہزاروں سیکڑوں مزدور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے یونین کو پیسے دیتے ہیں تا کہ مشکل وقت میں مدد مل سکے۔ لیکن یہ بے خبر ہوتے ہیں کہ یہ یونینز حقوق کے تحفظ کے بجائے ان کا استحصال کرتی ہیں۔ چھوٹے موٹے لیڈروں اور یونینز کو مزدوروں کی محنت کا لاکھوں روپیہ بنا کسی عمل کے مل جاتا ہے اور مزدور بھی دیتے رہتے ہیں۔ وہ بیانگی کا شکار نہیں جانتے کہ یہ لیڈرز، یونینز اور مالک ان کی محنت کا صلہ ہڑپ کر کے ان کے اوپر مسلط ہوئے ہیں:

> یہ ایک روپیہ سال میں لاکھوں روپیہ بن جاتا ہے۔ اس میں کمپنی کی طرف سے بندھی رقم بھی ہوتی ہیں۔ اور ٹھیکداروں سے ملنے والی نذرانے کی رقم بھی، مزدوروں کے چھوٹے چھوٹے مسائل کی فیس اور بے ضرر خطاؤں کی رشوت وغیرہ تو چھوٹے لیڈر وصول کرتے ہیں۔ اسی لاکھوں روپیہ سالانہ کی رقم ہی کی بنا پر بڑے بڑے لیڈر بنگلوں میں رہتے ہیں، کاروں پر گھومتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں۔ اور بڑے بڑے پشتنی زمینداروں کی طرح حکم چلاتے ہیں۔ حکم بجالانے کے لیے پہلوان رکھتے ہیں۔ (۷)

مزدور جہاں اجتماعی محنت کرتے ہیں وہاں ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے تنظیمیں اور یونینز بنتی ہیں۔ یہی لوگ ان سے فنڈ اور تحفظ کے نام پر پیسے لے کر خود زندگی کی ہر سہولت حاصل کرتے ہیں لیکن مزدور لاتعلق و بے خبر ہوتے ہیں۔ انھیں ان کے مالک اور لیڈروں کی یہ چکاچوند نظر تو آتی ہے لیکن یہ سمجھنے سے عاری ہوتے ہیں کہ یہ چکاچوند انھی کی محنت کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی ان میں سے جانتا بھی ہے تو وہ اس ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی بھی جرات نہیں کر پاتا۔ یوں ان کی محنت پہ چند اقلیتی افراد عیاشی کرتے ہیں اور وہ دو وقت پیٹ بھرنے کے لیے بھی مجبور ہوتے ہیں۔ اس محنت کش کے خیال میں یہ سب اس کی صلاحیتوں اور محنت کی وجہ سے ہوتا ہے۔

ایسے کئی کردار ہمارے معاشرے میں چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں جو محنت کرتے ہیں اور بدلے میں ایک حقیر سی اجرت ملتی ہے جس سے وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ ایسے کردار "فائر ایریا" میں بھی بھرے پڑے ہیں جو ہفتے بعد جب اپنی محنت وصول کرتے ہیں تو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ رقم ان کی محنت کا دسواں حصہ بھی نہیں ہے۔ رحمت میاں جب سرسا کولیری میں کام کرتا ہے تو اسے حاصل ہونے والی اجرت پہ بھی یقین نہیں ہوتا کہ یہ روپے اسی کی محنت کا ایک چھوٹا سا حصہ ہیں۔ وہ گزشتہ زندگی زمینداروں کے ساتھ کام کرنے میں لگا چکا تھا جہاں اسے سوائے روٹی کے کچھ بھی نہیں ملتا تھا۔ اس لیے اسے احساس نہیں ہوتا کہ یہ اجرت اس کی ہے جو اسے کام کرنے اور گھر والوں کو زندہ رکھنے کے لیے اس کی جسمانی محنت کے بدلے میں اسے دی جارہی ہے:

> رحمت کو جس دن پہلا ہفتہ ملا تھا اس دن لگتا تھا وہ خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ پہلے تو وہ نوٹ ہاتھ میں تھامے کھڑا رہ گیا تھا جیسے اس کو یقین نہ آرہا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ لہو کی یلغار اسکے چہرے پر ہوئی چہرہ اور آنکھیں دونوں روشن ہوتی گئیں۔ ایک ناقابل یقین خوشی سے جیسے وہ سرشار ہو گیا۔ پھر بھی اس نے سہدیو سے تصدیق چاہی۔
>
> یہ روپیہ میرا ہے نا۔۔۔؟
>
> سہدیو ہنس دیا۔ ہاں تمھارا۔۔۔[۸]

اس اقتباس سے بظاہر تو رحمت میاں کی خوشی دکھائی دیتی ہے لیکن حقیقت میں یہ اس مظہر کی عکاسی کرتا ہے کہ وہ کس قدر بیگانگی کا شکار تھا۔ اسے ملنے والی اجرت سے بھی یقین نہیں ہوتا کہ یہ اسی کی محنت ہے۔ حالاں کہ اس کی محنت کا اصل پھل جو کئی گنا زیادہ تھا کمپنی کے پاس چلا جاتا ہے۔ یعنی مزدور کی بیگانگی اپنی محنت کی پیداوار سے اس قدر پیچیدہ ہے کہ اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ خون پسینہ بہاتا ہے تو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اشیاء اس کی ہونے کے بجائے کسی اور کی ملکیت بن جاتی ہیں۔ یہ حال صرف رحمت میاں کا نہیں بل کولیروں میں کام کرنے والے ہر مزدور کا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام میں ہر محنت کش کا جس کی عکاسی اور الیاس احمد گدی نے کی ہے۔

سہدیو جو ناول کا مرکزی کردار ہے جب گاوں سے آتا ہے تو اسے زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ اس کے خیال میں سماج میں یہ طبقاتی تفریق فطری ہے اور بھگوان نے ہی اسے بنایا ہے۔ کسی کو امیر کسی کو غریب، کسی کو آقا کسی کو غلام، کوئی مالک تو کوئی مزدور یہ سب بھگوان کی تقسیم ہے۔ وہ مجمدار سے گفتگو کرتے ہوئے کہتا ہے:

> امیر غریب چھوٹا بڑا۔ اونچ نیچ تو بھگوان بناتا ہے۔

نہیں بھگوان نہیں ہم بناتے ہیں۔

ہم_؟

مجمدار نے اسکو آگے بولنے نہیں دیا۔

غریب، چھوٹا اور نیچ انھیں بھگوان نے نہیں بنایا۔ان کو نیچے گرایا گیا ہے۔ان کا استحصال کیا گیا ہے۔ان کو بھوکا اور ننگا رکھا کر، سود میں جکڑ کر، بیگار لے کر، مار پیٹ کر، اس حد تک پہنچادیا کہ وہ کیڑے بھرے آم کھانے پر آمادہ ہو گئے۔(۹)

سہدیو ہی کی طرح عام طور پہ اس تقسیم و تفریق کو بھگوان / خدا سے منسلک کر دیا جاتا ہے۔اسی تصور کی وجہ سے مزدور استحصال کا شکار ہوتا ہے اور محنت کی پیداوار سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔وہ سمجھتا ہے کہ یہ اس کی قسمت میں تھا حالاں کہ خدا نے سب کے لیے یکساں ہر چیز تخلیق کی اور یہ اونچ نیچ، غربت، امارت تو سب دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، قبضے اور محنت کا برابر صلہ نہ ملنے کی وجہ سے ہے۔یہیں سے طبقاتی سماج کی بنیاد پڑتی ہے اور یہی تاریخ میں ہوتا رہا ہے۔

مجمدار جو کہ ایک سوشلسٹ ذہنیت کا کردار ہے اور اسی فکر کو عمل میں لانے کے لیے اپنی یونین بناتا ہے۔ناول کا اختتام بھی اسی کی اس مثبت سوچ اور تصورات کی کامیابی پر ہوا ہے۔وہ ناول کی ابتدا میں سہدیو اور آخر میں عرفان کو ان سرمایہ داروں اور لیڈروں کی چالاکیوں سے آگاہی فراہم کرتا ہے۔وہ سہدیو کو سمجھاتا ہے کہ گاڑی میں لوڈ ہونے والا اکثر کوئلہ قدر زائد ہی ہوتا ہے لیکن یہ قدر زائد جو مزدور کی محنت ہے وہ اسے نہیں ملتی بلکہ مالک لے جاتے ہیں۔جس پر نہ تو کوئی پیداواری لاگت آتی ہے اور نہ ہی مالک کی کوئی عمل داری اس میں شامل ہوتی ہے بلکہ یہ خالصتا مزدور کی محنت کا نتیجہ ہوتی ہے جسے مزدوروں کے بجائے سرمایہ دار اڑالے جاتے ہیں:

جانتے ہو ایک ٹن کتنے سی ایف ٹی CFT ایک ٹن ہوتا ہے ۳۶ سی ایف ٹی میں اور کول ٹب جو بنائے جاتے ہیں جسے تم لوگ گاڑی کہتے ہو وہ چالیس CFT کا ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہر کول ٹب میں چار CFT کوئلہ ایسا کٹتا ہے جسکی اجرت لیبر کو نہیں ملتی اور مالک کو جس پر کوئی لاگت نہیں آتی۔(۱۰)

محنت کش سرمایہ داری نظام میں بنیادی طور پر محنت کی پیداوار سے بیگانہ ہوتا ہے۔وہ جس خام مال کو محنت کے بعد قابل استعمال بناتا ہے وہ فطری ہوتا ہے کسی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں۔سرمایہ داری نظام ذرائع

پیداوار پہ تسلط اور ذاتی ملکیت کے تصور پر کھڑا ہے اس لیے ذرائع پیداوار پر قابض افراد اجرت کے عوض محنت کش سے محنت لیتے ہیں اور حاصل ہونے والی پیداوار کو قبضے میں کر لیتے ہیں۔ ایسے حالات میں جہاں محنت کش طے کردہ اجرت پر ہی اکتفا کرتا ہے کیسے معلوم ہو گا یہ قدر زائد در حقیقت اسی کی محنت کا پھل ہے جس پر سرمایہ دار / جاگیر دار اپنی امیری کی عمارت تعمیر کرتے ہیں اور انھیں مزدور بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی قدر زائد کا ناجائز فائدہ اٹھا کر سرمایہ دار دن دگنی رات چگنی ترقی کر کے اپنے اور محنت کش کے درمیان زمین آسمان کا فرق پیدا کر دیتے ہیں۔

قدر زائد در حقیقت محنت کش کی وہ محنت ہے جس کو سرمایہ داری نظام میں سرمایہ دار استعمال میں لا کر مزدور کا استحصال کرتا ہے۔ محنت کش کسی کام کو کرنے میں جتنا وقت صرف کرتا ہے اس کا تین تہائی حصہ قدر زائد کی صورت میں نکلتا ہے جس پر اس کا کوئی حق نہیں ہوتا، جو اس کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ کسی سرمایہ دار کی جھولی میں منافع کی صورت میں جا گرتی ہے۔ وہ قوت محنت جسے استعمال میں لا کر محنت کش چیز کو قابل استعمال بناتا ہے وہ اس کی ذات سے الگ اپنا وجود بنا کر اس کے لیے حریف بن جاتی ہے جسے خریدنے کے لیے بھی اس کی صلاحیت نہیں بچتی حالاں کہ یہ اسی کی صلاحیتوں کا مظہر ہوتی ہے۔ الیاس احمد گدی نے مجمدار کے کردار کے ذریعے سے سرمایہ دارنہ نظام کی ان بنیادوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جن پر اس کی عمارت کھڑی ہے استحصال کی ہر شکل کا تصور اسی کردار کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔

سہدیو ایک ایسا کردار ہے جس کو محنت کی پیداوار کا احساس بطور تخلیق کار کے نہیں بل کہ محنت کو بیچنے والے کا ہے اس کو یہ معلوم نہیں کہ کانوں میں سے نکلنے والا کوئلہ ان کی محنت کا پھل ہے جسے وہ ہزاروں فٹ نیچے اندھیری غاروں سے تلاش کر لاتے ہیں۔ تاہم اس کو یہ احساس ضرور ہے کہ وہ اپنی محنت کے بدلے میں کچھ اجرت حاصل کرے گا اس لیے کئی مواقعوں پر وہ یہ کہتا ہے اسے اس سے کوئی فرق نہیں کہ وہ کون سا کام اور کہاں کام کرے، بلکہ کوئی بھی کام مل جائے جس کو کرنے کے عوض اسے اتنی اجرت مل سکے جس سے اس کا گھر اور خاندان چل سکے۔ ہمارے مزدور کی بیگانگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ مجبوری کا مارا صرف اجرت پر قائل ہو جاتا ہے۔ ناول کے آخری حصے میں جب وہ ایک کولیری میں نوکری کرتا ہے تو اس کو دو سو روپے ملتے ہیں جب کہ اس کو چار سو روپے کی وصولی پر دستخط کرنے پڑتے ہیں یہی حال مجمدار کا بھی ہے جو اڑھائی سو کی تنخواہ کا دستخط کر کے دو سو روپے لینے پر مجبور ہوتا ہے اور اس کے خلاف بول نہیں سکتے احتجاج نہیں کر سکتے اور اگر وہ ایسا کریں تو ان کو روزگار سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا محنت کش جس کی "فائر ایریا"

میں تصویر کشی کی گئی ہے محنت کی پیداوار سے بیگانہ اپنا استحصال در استحصال کراتا رہتا ہے اور پیداوار سے بیگانہ ہو کر اپنا وجود کھو بیٹھتا ہے۔

جہنمی لوگ:

"جہنمی لوگ" شیراز زیدی کا ناول ہے جو ۲۰۰۲ء میں فکشن ہاوس لاہور سے شائع ہوا۔ یہ مارکسی فکر سے سے متاثر ہو کر تخلیق کیا گیا ہے۔ اکیسویں صدی میں ترقی پسند تحریک / فکر کے تناظر میں لکھا جانے والا ابتدائی ناول ہے جو ناول نگار نے کم عمری میں لکھ کر اپنی فکری گہرائی کا ثبوت دیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ناول مزدور طبقے کی زندگیوں کے گرد گھومتا ہے۔ وہ طبقہ جس کی زندگی غربت، افلاس، سماجی و تہذیبی گراوٹ، جہالت میں بسر ہو رہی ہوتی ہے۔ ناول میں راجگیروں کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی اور ان کے مسائل کا بیان ہے۔ اردو ناول میں یہ ناول گم نام ہے جس کی طرف ہمارے نقادوں کی نظر نہیں گئی اور نہ ہی پاکستانی معاشرے میں رہنے والے ادیبوں کی نظر اس موضوع کی طرف گئی۔ پاکستان میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم مزدور طبقے کے حالات اطمینان بخش نہیں ہیں۔

ہماری آج کی سوسائٹی طبقاتی سوسائٹی ہے جس میں نچلے طبقے کے مسائل نے اسے زندگی جینے کے ہنر سے بھی ناواقف کر دیا ہے۔ ان نچلے طبقوں سے میں مزدور کے طبقے کی طرف قیام پاکستان سے تاحال کوئی پیش رفت نہیں ہوئی۔ بھٹو دور میں کچھ اقدامات کئے گئے لیکن حالات میں کوئی واضح فرق نہیں پڑا۔ آئے روز مزدور طبقے کی زندگی اجیرن بنتی چلی آ رہی ہے۔ مزدور طبقے کے تحفظ کے لیے نہ تو کوئی خاص آئین و قانون بنے اور اگر کچھ موجود بھی ہیں تو ان پر عمل درآمد نہیں ہوتا ہے۔ ایسے ہی مزدوروں کی کہانی "جہنمی لوگ" کی ہے جو زندگی کی مصیبتیں کاٹتے کاٹتے دم توڑ جاتے ہیں۔ اردو ناول میں تاحال تین چار ناولوں کے علاوہ مزدور طبقے سے ہمارا ناول نگار بیگانہ ہے۔ وہ کوٹھی، بنگلہ اور گاڑی کے حصار سے باہر نہیں نکل پایا۔ ایسے میں وہ لوگ جنھوں نے ان مسائل کو اجاگر کرنے کی سعی کی اور ہماری معاشرت کے اس نقاب کو اتارنے کی کوشش کی قابل ستائش ہیں۔ قیصر آفتاب احمد لکھتے ہیں:

> ناول نگار نے بہت خوب صورت انداز اور دلچسپ پیرایہ میں راجگیروں کے ساتھ کام کرنے والے مزدوروں کے حالات اور مشکلات کا احاطہ کرتے ہوئے موضوع کے لحاظ سے منفرد ناول لکھ کر ناول نگاروں کی فہرست میں اپنی جگہ بنائی ہے۔[۱۱]

ناول "جہنمی لوگ" دس ابواب پر مشتمل ہے جس میں جنت، نعت، نواز، چھیما، فضلا، بسنتی، بشیر اں جیسے کردار ہیں جن کے ذریعے طبقاتی تقسیم کے ذریعے پیدا ہونے والی سماجی، معاشی، تہذیبی و ثقافتی گراوٹ کو بیان کیا گیا ہے۔ کہانی کا آغاز شہر میں ایک عمارت کی تعمیر سے ہوتا ہے جہاں کھانے کے وقفے کے دوران میں مزدور طبقے کا احوال دکھایا جاتا ہے۔ ان مزدوروں میں ایک مزدور نواز ہے جس کے گھر کی کہانی کے ذریعے ان مزدوروں کے حالات سے نقاب کشائی کی گئی ہے۔ آہستہ آہستہ گھر کے حالات، مزدوروں کی مجبوریوں، صحت کے مسائل، اخلاقی گراوٹ، بھیک مانگنے کی لعنت، عورتوں کی عزت کے ساتھ کھلواڑ، ان غریبوں کی اموات کے گرد گھومتی ہوئی کہانی نواز کی بیوی جنت کے مرنے پر ختم ہو جاتی ہے۔

ا۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی:

مارکسی تصورات کے تحت سماج میں چاروں اور پھیلی ہوئی آج کی یہ بیماری طبقاتی نظام کی دین ہے۔ آج کی صدی کا انسان اپنے جیسے انسانوں سے خوف کھاتا ہے، اسے اپنی ہی نوع سے اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ اس کی وجہ جدید سرمایہ دارانہ نظام ہے جس میں افراد معاشرہ کو ان کی محنت کے بدلے میں برابر صلانہ ملنے کی بناء پر ذہنی پریشانیوں سماجی و معاشی بدحالی اور اخلاقی انتشار کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ جب معاشرے میں کسی محنت کش کو اس کی محنت کا برابر صلہ نہیں ملتا تو وہ رفتہ رفتہ بیگانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی کا مطلب ہے کہ جب کوئی محنت کار کسی شے پر محنت کرتا ہے اور اس کی وہ محنت جو اب پیداوار میں تبدیل ہو چکی ہے، اسے نہیں ملتی بلکہ کسی اور کے پاس چلی جاتی ہے تو وہ کسی کام کو کرنے میں دلچسپی اور اپنی پوری قوت عمل کا استعمال نہیں کرتا۔ وہ جو بھی کام کرتا ہے وہ زبردستی کسی مجبوری کی بنا پر کرتا ہے۔ اس کا محنت کرنے میں جی نہیں لگتا ہے کہ اسے اکتاہٹ ہو جاتی ہے وہ خوشی محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کام کے دوران میں وہ اپنی ذات کی نفی کرتا ہے۔ مارکس کہتا ہے:

> محنت، محنت کار کی ذات سے خارج ہو جاتی ہے یعنی وہ اس کے بنیادی وجود کی ملکیت نہیں ہوتی (بلکہ سرمائے کی ملکیت ہوتی ہے) لہذا وہ کام کے دوران میں اپنی ذات کا اقرار نہیں کرتا بلکہ اس کی نفی کرتا ہے وہ آسودگی نہیں بلکہ اداسی محسوس کرتا ہے۔[۱۲]

محنت کے اس عمل سے بیگانگی کو ہی مارکس بیگانگی ذات سے تعبیر کرتا ہے کیونکہ اس کے نتائج خطرناک صورتحال اختیار کر لیتے ہیں۔ انسان انسانیت سے محروم ہو کر صرف حیوانی منصب میں ہی آزاد ہوتا ہے۔

ناول "جہنمی لوگ" میں بھی ہمیں محنت سے بیگانگی کے عناصر واضح طور پر ملتے ہیں تاہم ان کی نوعیت ناول کے موضوع کے پیش نظر اور اثرات کے حوالے سے دیکھی جائے گی تاکہ واضح ہو سکے کہ محنت سے بیگانگی کے کیا نتائج اور اثرات ہوتے ہیں۔ کہانی کی ابتداء میں مزدوروں کی مجبوری کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ کس طرح سے مزدور حالات زندگی سے مجبور ہو کر کر زبردستی محنت کرنے پر مجبور ہیں اس کام میں ان کی ذات نہیں بولتی بلکہ مجبوری بولتی ہے۔ مزدور محنت کرتے ہیں لیکن اس کے بدلے میں انہیں مزدوری پوری نہیں ادا نہیں کی جاتی۔ ان کی محنت کے پیسے سے ٹھیکے دار زبردستی رکھ لیتا ہے تاکہ کسی بھی مزدور کو کام سے بھاگنے کی ہمت نہ ہو۔ وہ انہیں نہ صرف پوری مزدوری ادا نہیں کرتا بلکہ ان پر زبردستی کر کے کام بھی لیتا ہے، جرمانے بھی کرتا ہے۔ انہیں پانی پینے کا بھی موقع نہیں دیتا کہ اس طرح وقت کا زیاں ہوتا ہے۔ ایسے میں مزدور پھنس جاتا اور مادی مجبوریاں زبردستی محنت کراتی ہیں تاکہ اس کے گھر کا چولہا جلتا رہے:

> مزدور ٹھیکیدار کے زیادہ کام لینے اور کم اجرت ادا کرنے کی وجہ سے اس کے ساتھ کام کرنے پر خوش نہ تھے لیکن اس طرح انہیں دوسرے مزدوروں کی طرح فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر دیہاڑی لگنے کے انتظار سے نجات مل جاتی تھی اور ٹھیکیدار ان کی کمزوری سے پوری طرح واقف تھا۔ (۱۳)

ٹھیکے دار مزدوروں سے انسانی ہمدردی کے بجائے ان سے سختی سے کام لیتا اور انہیں مجبور کرتا تھا کہ وہ کم اجرت پر بھی اسی کے ساتھ کام کریں وہ اپنے خاندان کے پیٹ پالنے کی مجبوری سے اپنے استحصال پر خاموش ہیں۔ بے روزگاری ان کے لیے زہر قاتل ہے۔ وہ بے روزگاری سے بچنے کے لیے کسی بھی کام کو کسی بھی انداز اور کسی بھی قیمت پر کرنے کو تیار ہو جاتے تھے کیوں کہ اس سے وہ زندہ رہنے کا سامان مہیا کرتے۔ اس بھیانک ناسور کے حوالے سے "مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس" میں تحریر ہے:

> کسی شخص کو کام کرنے کے حق سے محروم کرنا محض اسے ایک کم از کم معیار زندگی سے محروم کرنا ہی نہیں ہے اس کا مطلب ایک شخص کو انسانی تعظیم سے محروم کرنا، مہذب

معاشرے سے علیحدہ کرنا اور اس کی زندگی کو بے کار اور بے معنی بنانا ہے۔ بیروزگاری انسانیت کے خلاف جرم ہے۔[۱۴]

وہ اس محنت کے استحصال سے بیگانے ظلم کی چکی میں پستے چلے جارہے ہیں۔ انہیں اس کا احساس ہو بھی کہ ان کی یہ محنت ان کی اپنی نہیں بلکہ کسی اور مالک کی ہے تو وہ کام تو کرتے ہیں لیکن اس کام میں ان کی شخصیت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔ ان کی محنت سے بیگانگی کا یہ عالم ہے کہ وہ جانوروں کی طرح کام کیے جاتے ہیں لیکن انہیں اس کام کے کرنے میں ذرہ برابر بھی خوشی نہیں ہوتی۔ اگر وہ اس کے بر خلاف کوئی قدم اٹھاتے ہیں تو وہ اس تھوڑی بہت اجرت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔ ایسے ہی جب "جہنمی لوگ" کے مزدور کام کرتے ہیں تو وہ اپنی دلچسپی سے نہیں بلکہ مجبوری سے کام کو سر سے اتارنے کی کوشش کرتے ہیں:

> انھیں کھانا کھائے تھوڑی دیر گزر چکی تو کرموں نے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے چونک کر کہا "چلو بھئی جوانو! تیاری پکڑ لو، ٹائم ہونے والا ہے ورنہ کمبخت ٹھیکیدار آ کے، ابھی ماں بہن ایک کر دے گا"۔ اللہ دتہ سستانے لگا۔ "ابے یار گھنٹی تو ہونے دے۔[۱۵]

ہمارے ملک میں چونکہ انگریزی دور حکومت کا قائم کردہ نظام ہے یہ ٹھیکیداری نظام مزدوروں پر ظلم کرنے کی کھلی اجازت دیتا ہے۔ یہاں ٹھیکدار اچھی خاصی رقم بٹور لیتا ہے۔ وہ رقم جس میں اس کی محنت کہیں بھی نہیں۔ وہ مزدوروں سے ان کی محنت میں کمی بیشی پر پیسے کاٹ لیتا ہے۔ پوری دیہاڑی کی اتنی رقم ادا نہیں کی جاتی جتنی کسی جرمانے یا کچھ وقت کام نہ کرنے کی کاٹ لی جاتی ہے۔ ایسے میں مزدور مجبور و لاچار اپنی رگوں کا خون پسینہ کام میں نچوڑتے ہیں لیکن انہیں اس کام میں ذرہ برابر بھی آسودگی نہیں ملتی۔ ان کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور یہی ناجائز فائدہ انھیں کام میں ذات کو شامل کرنے سے متنفر کرتا ہے۔

"جہنمی لوگ" کے مزدوروں کی ہفتہ وار چھٹی بھی بند کر دی گئی تھی۔ ٹھیکیدار کی طرف سے ہفتہ بھر کام کرنے کے لیے مزدوروں کو مجبور کیا جاتا تھا۔ ایسے میں نواز جس کی بیوی بیمار ہے اسے ہسپتال دکھانے سے بھی قاصر ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے نواز اپنی بیمار بیوی کی کہانی سناتا ہے کہ اسے کھانسی ہے پہلے ہسپتال دکھایا لیکن پیسے نہ ہونے کی وجہ سے دوائیں بھی پوری نہیں لے سکا اور اس وجہ سے تھوڑے افاقے کے بعد دوائی بند کر دی۔ اب دوبارہ سے اسے کھانسی کی شکایت ہے جو روز بروز بگڑتی جارہی ہے۔ ایسے میں چھٹی بھی نہیں ملتی اور چھٹی کر لے تو جورو کا علاج کیسے کرائے اور بچوں کو کھانا کیسے کھلائے؟ سردار / حاکم / سرمایہ دار ان کی اسی

مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور بدلے میں انہیں کسی بھی طرح کی سہولت نہیں ملتی۔ ان پر جرمانے، ٹیکس اور مزدوروں کی فلاح و بہبود کے نام پر پیسے بھی لیتے ہیں لیکن عملی نتیجہ نہیں نکلتا۔ یہاں ٹھیکیدار ایک طبقے کی حیثیت سے سے اپنے نیچے کام کرنے والے مزدوروں کی محنت کا استحصال کرتا ہے۔ مشتاق احمد امتیاز اپنے تحقیقی مقالے "پاکستانی اردو ناول میں پسماندہ طبقے کے مسائل" میں لکھتے ہیں:

> ٹھیکیدار اپنے ساتھ کام کرنے والے مستری مزدوروں کا خوب استحصال کرتے ہیں۔ ان کے معاوضے کی کچھ رقم اپنے نیچے رکھتے ہیں تاکہ وہ انہیں چھوڑ کر کسی دوسری جگہ نہ جا سکیں اور جب رقم ٹھیکیدار کے پاس جمع ہو جائے تو وہ اپنا رعب جماتا ہے، اپنا حکم چلاتا ہے۔ بیچارے مزدور مجبور ہو کر سب کچھ سہتے رہتے ہیں۔ ناول نگار نے مزدور طبقہ کے اس دکھ کو بہت عمدہ طریقے سے بیان کیا ہے۔ ایک مزدور نواز کی بیوی بیمار ہوتی ہے تو وہ اسے ڈاکٹر سے چیک کروانا چاہتا ہے مگر چھٹی بھی نہیں کر سکتا۔ (۱۶)

نواز جس کے کافی سارے پیسے ٹھیکے دار کی طرف ادائیگی کے باقی ہیں نہ تو اسے وہ مل رہے اور نہ ہی چھٹی۔ جس کے نتیجے میں وہ اپنی ہی بیوی کو سرکاری ہسپتال میں دکھانے کے لیے بھی مجبور ہے۔ یہ طبقاتیت کا وہ روپ ہے جو انسان کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اپنے پیٹ کا جہنم پالنے کے لیے دن رات محنت کرے۔ باوجود اس کے کہ وہ محنت کا نتیجہ حاصل نہیں کر پاتا۔ یوں اس کی زندگی روٹین میں کام کرنے والی مشین کی زندگی بن کر رہ جاتی ہے اور وہ مشین کا کل پرزہ۔

مارکس نے کہا تھا کہ مزدور کو محنت کا حق نہ ملنے کی وجہ سے نہ صرف اس کی کام میں دلچسپی ختم ہوتی ہے بلکہ وہ خود کو گھسیٹتا رہتا ہے۔ وہ من سے کام نہیں کرتا بلکہ اسے کام کرنا وبال جان لگتا ہے۔ یوں وہ کام نہ کرنے کے دوران میں خود کو آزاد تصور کرتا ہے ورنہ اسے خوشی نہیں ہوتی۔ ایسا ہی حال "جہنمی لوگ" کے کردار نواز کا ہے جسے یوم مئی کی چھٹی پر خوشی ہوتی ہے۔ حالاں کہ وہ یوم مئی سے بھی ناواقف ہے کہ یہ دن انہیں کی محنت کی یادگار ہے۔ اسے تو بس خوشی ہوتی ہے کہ کسی طرح کام کرنے سے فرصت میسر آئی:

> جنت ہنستی رہی۔۔ اچھا یہ تو بتا کل تیری چھٹی کس وجہ سے ہے؟ پہلے تو کہتا تھا کہ ٹھیکیدار نے جمعہ کی چھٹی بند کر دی ہے اور کل تو ہفتہ ہے۔ کیوں۔" نواز بولا۔ جنتے مجھ اکیلے کو تھوڑی سب کو ہوئی ہے کل کی چھٹی۔ کل در اصل ایک مئی ہے ناں، مزدوروں کا دن ہوتا ہے، ٹھیکیدار تو چاہتا تھا کہ کام چلتا رہے مگر مزدوروں کا لیڈر آ گیا تھا کہنے لگا کہ۔۔

یکم مئی مزدوروں کی عید ہے اگر کل کام جاری رکھا تو ایسی کی تیسی کر دوں گا تیری۔" وہ
تو ٹھیکیدار نے چھٹی کو کام بند کروایا ہے، ورنہ ایک نمبر کا پاجی ہے۔۔ اور کیا۔[۱۷]

مندرجہ بالا اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مزدور اپنی ہفتہ وار چھٹی بھی نہیں کر پاتے تھے لیکن جب یکم مئی کی چھٹی ہوئی تو وہ سب اس پر خوش تھے کہ اپنے گھر والوں کے ساتھ دن گزاریں گے۔ کام سے کسی طرح فرصت ملی اسی لیے نواز دوسرے دن کھانے میں گوشت کا سالن بننے کی خوشی میں سو بھی نہیں پا رہا تھا۔ اور پھر چھٹی والے دن پورا دن خوشی خوشی اپنے بچوں کے ساتھ گزارا۔ ان کا جسم تو کام کرتا ہے لیکن وہ خود اپنی ذات اور دلچسپی کو کام میں پیوست نہیں کر پاتے۔ انہیں جس خوشی سے کام کرنا چاہیے تھا وہ محض وبال بن جاتی ہے اور وہی حیوانی ضرورت اور کھانے کے وقت ہی خود کو آزاد تصور کرتے ہیں۔

محنت سے بیگانگی انسان کو اپنی ذات سے بھی بیگانہ کر دیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بھی بھول جاتا ہے اس کی ذات محض ایک مشین کا کل پرزہ بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کی روح کی قوت اور ذہنی ہم آہنگی دم توڑ جاتی ہے۔ محنت کی اس بیگانگی کے اثرات انتہائی تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ نواز جو ایک غریب مزدور کے کردار کے طور پر مجموعی رویوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس کی بیوی پیسے نہ ہونے کی وجہ سے اپنا علاج نہیں کراتی۔ اسے ڈاکٹر ٹی بی بتاتا ہے ہے مگر وہ اسے چھپا لیتی ہے اور تکلیف سہتے سہتے صحت دم توڑ جاتی ہے۔ وہ خاوند کی وفات کے بعد جب ایک کوٹھی میں کام کرنے جاتی ہے اور واپسی پر جب اپنے علاقے میں پہنچتی ہے تو اسے لگتا ہے کہ وہ سب گندگی کا ڈھیر ہیں اور جانوروں کے فضلے سے بھی زیادہ ناپاک اور گندے ہیں جن کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ وہ کام کرنے والے محض کیڑے مکوڑے ہیں جن کی محنت کا رس کوئی اور نچوڑ لیتا ہے۔

محنت سے بیگانگی کے نتیجے میں معاشرہ مختلف طرح کے مسائل میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ طرح طرح کی برائیاں جنم لیتی ہیں۔ کام محض پیٹ پالنے کا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے وہ محنت جس کے ذریعہ سے محنت کش اپنی صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اظہار کی بجائے خود کو زبردستی کام میں جھونک دیتا ہے جس سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اس طرح نہ صرف محنت کش بلکہ اس سے جڑے افراد بھی متاثر ہوتے ہیں اور ان کی صلاحیتیں اور خوبیاں جنہوں نے سماج کی بہتری میں کردار ادا کرنا تھا غارت ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ جہالت و پسماندگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں نواز کا خاندان اس عنصر کی بھرپور عکاسی کرتا ہے کہ کس طرح سے محنت کا یہ استحصال ان کی زندگیوں کا استحصال بن کر رہ جاتا ہے۔

۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی:

محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی سے مراد مزدور کی محنت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی شے اس کے بجائے کسی دوسرے کی ملکیت بن جائے تو وہ چیز جو اس نے پیدا کی اس کے لیے اس کی ذات سے الگ کوئی اجنبی چیز بن جاتی ہے۔ وہ اس کے حریف کے طور پر اس کے سامنے آ جاتی ہے۔ ناول "جہنمی لوگ" سچ میں ایک ایسے ہی طبقے کی کہانی ہے جن کو زندگی میں ہی جہنم کے درشن کرنے پڑے۔ وہ طبقہ جو تمام تر سہولیات زندگی سے دور رہ کر زمینی کیڑوں کی طرح دوسروں کا شکار بنتے ہیں اور انہیں زندگی کی عیش و عشرت میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

یہ استحصالی نظام ہر طرح سے ہمارے سماج کی رگوں میں رچ بس چکا ہے اور محنت کش کی اس محنت کا پھل ایک اقلیت اڑا لے جاتی ہے۔ محنت کش کام کرتا ہے تو کام میں اس کی ذات شامل نہیں ہوتی اس کی بنیادی وجہ محنت کا صلہ یعنی پیداوار کی ملکیت کا نہ ہونا ہے۔ یہ دیہاڑی دار مزدوروں کی کہانی ہے جو دن بھر کام کرتے ہیں اور نتیجے کے طور پر دو وقت کا کھانا بھی بہ مشکل امر مہیا کرتے ہیں۔ ان کی زندگی افلاس غربت میں گزر جاتی ہے صحت اور تعلیم کے مسائل ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ سرمایہ دارانہ سماج میں کام کرنے والے محنت کش سخت محنت کرتے ہیں اور اس محنت پر ان کا پہلا حق ملکیت تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ وہ حق کسی سرمایہ دار کی گھر کی رکھیل بن کر رہ جاتا ہے۔

جس سماج میں طبقاتی استحصالی نظام موجود ہو اس سماج میں کام کرنے کے عوض صرف چند روپے ملتے ہیں جن سے صرف اتنا کھانا ملتا ہے کہ دوبارہ کام کے لئے پھر سے تیار ہوا جا سکے۔ طبقاتی نظام واضح طور پر حدیں کھینچ دیتا ہے جس کے ایک طرف اکثریتی طبقہ ہوتا ہے اور دوسری طرف ذرائع پیداوار پر قابض چند جاگیر دار سرمایہ دار جو اس اکثریتی طبقے کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنی محنت کو چند کوڑیوں کے عوض ان کے حوالے کر دے:

> محمد نواز بھی ان مزدوروں کی صف میں شامل تھا جو صبح سے شام تک اپنا لہو اور محنت بیک وقت بیچنے کے بعد صرف چند قطرے پسینے کی قیمت وصول کر کے خوشی خوشی گھر لوٹ جاتے ہیں۔ وہ آنکھیں بند کیے ایک کونے میں لیٹا تھا مگر اس کا ذہن اپنے گھر کی طرف اٹکا ہوا تھا۔[۱۸]

سرمایہ داری نظام میں محنت کش کو محنت کی پیداوار سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ وہ تو محض محنت کے عوض چند پیسوں کا خواہاں ہوتا ہے تاکہ ان پیسوں سے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھر سکے۔ وہ نہیں جانتا کہ

یہ میں نے دراصل اس نے کی ہے اور اس کے نتیجے میں جو پیداوار ہوئی ہے یہ بھی اسی کی ہے۔ بلکہ وہ اس سے خود کو علیحدہ تصور کرتا ہے اور اپنی ذات کو پیداوار سے کمتر اور ہیچ تصور کرتا ہے۔ جن مزدوروں کی زندگی کی تصویر کشی ناول میں کی گئی ہے وہ ایک عمارت کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ وہ اجتماعی طور پر یہاں محنت کے عمل میں کار فرما ہیں لیکن یہ عمارت ان کی زندگی اور محنت سے کئی گنا مہنگی ہے۔ انہیں اپنی اس محنت سے کوئی سروکار نہیں جس کے نتیجے میں ایک بلند و بانگ عمارت وجود میں آئی ہے بلکہ وہ اپنے گھروں کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں۔ ان کی اپنی ذات انہیں کمتر محسوس ہوتی ہے۔ وہ خود کو محض رینگنے والے کیڑے کی حیثیت میں رکھتے ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام جس نے تمام انسانوں کی ترقی کے بلند و بانگ نعرے بلند کیے اپنی تمام تر ترقی کے باوجود بری طرح سے ناکام ہو چکا ہے۔ جس نے سماج میں طبقاتی تفریق پیدا کر کے اکثریتی آبادی کو صرف دو وقت کی روٹی کے لئے زندہ رکھا ہے تاکہ اس کے نتیجے میں اس کے منافع میں مزید اضافہ ہو سکے۔ بستی کے محنت کشوں کی زندگیاں اجیرن بن چکی ہیں، وہ روز روز کی ایک ہی روٹین سے اکتاہٹ کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس اکتاہٹ نے ان کے اندر بیگانگی کو جنم دیا ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنی ثقافتوں، اقدار اور سماجی رویے سے بھی یکسر محروم ہو چکے ہیں۔

نواز اور اس جیسے کئی محنت کش جو اپنے ہاتھوں، رگوں اور پٹھوں کو حرکت میں لا کر کسی شے کو بناتے ہیں وہ ان کی نہیں ہوتی بلکہ ان کے اوپر قابض ایک اقلیتی گروہ کی ہوتی ہے، جس کا اس شے میں یا تو کردار زیرو ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو محض دکھاوے کا۔ "جہنمی لوگ" کے محنت کش دن بھر کی گرمی میں چنائی، کھدائی، پلستر اور ملمع کاری کرتے ہیں، اینٹیں ڈھوتے ہیں، ریت و بجری میں بیلچہ لگاتے ہیں، بجری کوٹتے ہیں، مشینوں کی گڑگڑاہٹ ہوتی ہے اور اس گڑگڑاہٹ میں وہ اپنا خون پسینہ ایک کرتے ہیں:

> جب بیڈ پر اینٹوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہو چکا تو نواز کچھ لمحے کو سانس درست کرنے کے لئے کھڑا ہو گیا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا عمارت روز بروز بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ چند ہی دن پہلے اس جگہ صرف میدان تھا۔ نواز نے خود اس عمارت کی بنیادیں کھودی تھیں۔ ان میں ریت اور روڑی بھری تھی۔ اب کچھ ہی عرصہ میں اس کی تعمیر مکمل ہو جانی تھی اور کسی کو ان ہاتھوں کی مشقت کا دھیان تک نہیں آنا تھا جنہوں نے اسے شاہکار بنانے کے لیے اپنی مختصر زندگیوں میں سے کئی دنوں کی بیگار کا دان دیا تھا۔[۱۹]

یعنی وہ بلند و بانگ عمارت جس میں محنت کشوں کا خون پسینہ بہا وہ ان کے ہاتھوں سے شاہکار کا روپ دھار رہی تھی، وہ اب ان کی نہیں تھی بلکہ کسی اور کی ملکیت تھی جبکہ وہ خود ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں نہر کنارے گندگی کے ڈھیر میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ جن کے گھروں میں واش روم تک نہیں، کسی کی چھت نہیں، کسی کے ہاں پانی نہیں، کسی کے گھر چولہے کی جگہ نہیں۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں کی اس کارگری سے جو شاہکار بنایا وہ اب ان کا نہیں بلکہ وہ شاہکار جس محنت کا نتیجہ تھا وہ محنت چند پیسوں کے عوض اب ان کے کسی مالک، سرمایہ دار، حاکم کی ذاتی ملکیت بننا تھی۔

یوم مئی کے حوالے سے نواز اور اس کی بیوی جنت کے درمیان ہونے والی گفتگو میں جہاں جنت کے خیالات سے جھلکتا ہے کہ وہ طبقاتی شعور رکھتی ہے۔ وہیں نواز کا یکم مئی کے جلوس میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ یہ باور کراتا ہے کہ وہ استحصال کی جس چکی میں پستے ہیں اس کے نتیجے میں وہ اپنے حقوق کے لیے اٹھ کھڑا ہونے سے بھی قاصر ہیں۔ اسے ڈر ہوتا ہے کہ کہیں اس کی اس سوچ سے اس کا کام بند ہو جائے گا اور انہیں فاقے کاٹنے پڑیں گے۔ ان کا اپنی محنت سے بیگانہ ہونا سرمایہ داروں اور امرا کے طبقے کو مزید مضبوط کرتا ہے۔ وہ ان کی اس محنت پر محلات تعمیر کرتا ہے اور انہیں بدلے میں بچے ہوئے نوالے سے بہلاتا رہتا ہے۔

> ۔۔۔البتہ یہ تو ضرور بتانا کہ اب بھی ہم کون سا پیٹ بھر کر کھا لیتے ہیں۔۔۔اور پھر ہمیں تو فاقے کرنے کی عادت ہوتی ہی ہے، یہ تو امیر آدمی ہے کہ ایک وقت کی بھوک برداشت نہیں کر سکتا، میں تو سمجھتی ہوں کہ غریبوں کی محنت کھاتا ہے غریبوں کو تو وہ ملتا ہے جو کھاتے ہوئے امیروں کے منہ سے گر جاتا ہے۔ (۲۰)

ایک طرف جنت کا طبقاتی شعور اس اقتباس کی عکاسی کرتا ہے تو دوسری طرف نواز کی بے بسی اور بیگانگی۔ وہ بیگانگی جس کے نتیجے میں اس جیسے کئی کردار چند گروہوں کا پیٹ بھرتے ہیں اور اس ڈر سے کہ کہیں وہ یہ روٹی بھی نا چھین لیں کسی طرح کا عمل کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وہ محنت کی بیگانگی ہے جس میں آج کا یہ معاشرہ پوری طرح سے گرفت میں آ چکا ہے۔

ناول کے محنت کشوں میں مرد و خواتین شامل ہیں جو محنت کر کے عمدہ شاہکار بناتے ہیں لیکن وہ شاہکار ان کی ذات سے بہت بلند ہوتے ہیں۔ نواز کی موت کے بعد جب جنت ایک کوٹھی میں کام کرنے کے لیے جاتی ہے تو اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کو حقیر و کمتر تصور کرتی ہے۔ وہ نقش و نگار، سجاوٹ، آرائش و

زیبائش جو اس کے جیسے کسی محنت کش نے بنائے اب اس کو ٹھی کے سامنے حقیر بن کر رہ گئی۔ وہ خود کو عمارت کی خوبصورتی پر بد نما داغ تصور کرنے لگتی ہے۔ شیراز زیدی لکھتے ہیں:

> جنت کے دماغ میں تمام باتیں گھوم رہی تھیں۔ وہ جتنی دیر وہاں رکی تھی اسے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے اس کا وجود اس خوبصورت عمارت کو میلہ اور بد نما کیے جا رہا ہے اور تمام وقت یہی احساس اس کے ذہن پر چھایا رہا۔ حالانکہ اسے کمروں میں جھانکنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ تو بس شیدے کے ساتھ کمروں سے ملحقہ بر آمد نما ایک طویل گلی سے گزر کر اندرونی صحن تک اور پھر غسل خانے تک آئی تھی۔ (۲۱)

جنت نے محض غسل خانے کی نفاست کے سامنے ہی خود کو نیچ پایا جبکہ عمارت کا باقی حصہ جو محنت کشوں کی نفاست اور کاری گری کی عمدہ مثال تھا اس کے ذہن میں دیکھنے کی خواہش کو مردہ کر گیا۔

جنت جب گھر واپس لوٹتی ہے تو چھیما جس نے اسے وہاں کام دلوایا تھا اس سے عمارت کی خوبصورتی کی بات کرتی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عمارت پر خرچ کی گئی رقم لوٹ مار سے بنائی گئی ہے ورنہ اتنی رقم کہاں محنت کی حلال کمائی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایک طرف چھیما کا طبقاتی شعور اور دوسری طرف جنت ہے جو اسے تقدیر اور قسمت کا لیکھ سمجھتی ہے۔ محنت کش جب طبقاتی شعور سے عاری ہوتا ہے تو وہ اپنے اس استحصال اور سرمایہ داروں کی اس امارت کو تقدیر اور قسمت سے جوڑ کر گوشہ پناہ ڈھونڈنے پر عافیت سمجھتا ہے۔ یہ محنت کی پیداوار سے بیگانگی کی واضح شکل ہوتی ہے کہ جب محنت کش اپنے ہاتھوں سے پیدا کردہ اشیاء کو کسی اور کی ملکیت بنا کر اسے قسمت سے جوڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے مارکس نے کہا تھا کہ مذہب ہمارے سماج میں افیون کا کردار ادا کرتا ہے جس میں محنت کش پناہ ڈھونڈتا ہے وہ جب اپنی محنت کے صلے سے استحصال کا شکار ہوتا ہے تو مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے۔

> جنت اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی۔۔۔ بچے بھی دیکھے میں نے۔۔۔ واہ کیا خوبصورت، اتنے اچھے لگتے تھے سکول کی وردی میں۔۔۔ میرے ہوتے ہوئے بڑی گاڑی میں آئے تھے۔۔۔ نعمت اور فضلا بھی کتنے اچھے لگتے اگر سکول جاتے۔ ہمارے پاس تو مرتوں کے لیے دوا تک نہیں ہوتی۔۔۔ شیدا بتاتا تھا کہ سو دو سو کا تو پستا بادام موروں کو روز کھلا دیتے ہیں بچے اپنے جیب خرچ سے۔۔۔ اور کتے بھی تو خوب بڑھیا چیزیں کھاتے ہوں

گے۔۔۔ اور نعمت کے زرد چہرے پر نظریں جمائی ہوئی بولی۔" اچھا خدا! تو جسے چاہے بے حساب دے دے۔ (۲۲)

طبقاتی سماج میں مزدور اور محنت کش کی محنت پر چند افراد معاشرہ قابض ہو جاتے ہیں جس سے اکثریتی طبقہ زندگی کی روز مرہ اور بنیادی مسائل میں الجھ کر رہ جاتا ہے، جب کہ خود سرمایہ دار منافع در منافع کما کر خود کو الگ ہی مخلوق تصور کرتے ہی اور عام طبقہ زندگی کی مشکلات سے لڑتا مر جاتا ہے۔" جہنمی لوگ" اس کی جیتی جاگتی مثال ہے جہاں بیماروں کو صحت کی سہولت میسر نہیں۔ان کے لیے جو سرکاری ہسپتال بنائے جاتے ہیں۔سہولیات دینے کے دعوے کیے جاتے ہیں وہ محض باتیں بن کر رہ جاتی ہیں۔ ہسپتالوں میں ڈاکٹرز مریضوں کو صحیح سے دیکھتے نہیں، ادویات ملتی نہیں، بلکہ سرکاری ادویات کو بھی کلینک پر لے جا کر بیچ دیا جاتا ہے اور غریب تکلیف جھیل جھیل کر زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں، بچوں کو پڑھانے کے لئے پیسے میسر نہیں، پہننے کو کپڑے نہیں اور رہنے کو چھت نہیں۔ سرمایہ داروں کے کتے اور پالتو جانور بھی پستہ و بادام جیسی عمدہ غذاؤں سے لطف اٹھاتے ہیں۔

جہاں اس حد تک طبقاتیت و استحصال ہو اس معاشرے میں محنت کش کا بیگانگی کا شکار ہونا کوئی انہونی بات بھی نہیں۔ جن کی محنت کتے اور مور کھائیں ان کا سماج میں جینا محال نہ ہو تو کیا ہو؟ وہ مذہب و قسمت کا راگ نہ الاپیں تو کیا کریں؟ وہ اخلاقیات و اقدار سے کٹے جانوروں سے بدتر جیون نہ جئیں تو کیا کریں؟ ایسے میں بیگانگی کی کیفیت کا پیدا ہونا عام سی بات ہے۔ اور یہ ساری کیفیات طبقاتی نظام اور ذاتی ملکیت کے تصور سے جنم لیتی ہیں جن کو شیرازی زیدی نے بھرپور انداز میں برتنے کی سعی کی ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد احمد قادری لکھتے ہیں:

> جہنمی لوگ کے بہت سے پہلوؤں پر بات ہو سکتی ہے اس میں کچی بستی میں رہنے والوں کے بہت سے مسائل کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ شکم کی آگ بجھانے سے لے کر کے جنس میں حاویے میں جھلسنے تک، گنواروں کی زبان، ماحول، نفسیات، کیفیات، روز مرہ زندگی کے واقعات، ان کی مذہبیت، توہم پرستی، جہالت، نادانی، خوشی، غمی، موسم کے اثرات، بچوں کے کھیل کود، نفرت، غصہ، عصبیت ان سب کا یہ ناول احاطہ کیے ہوئے ہے۔ (۲۳)

جب سماج میں محنت کی پیداوار سے بیگانگی کا عمل ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں لامحالہ مختلف سماجی مسائل جنم لیتے ہیں مارکس نے بیگانگی کے اس تصور کو اسی نکتے کے گرد بیان کیا ہے۔جب ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو اس سے سماج میں دیگر کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔جو انسان سے اس کی انسانیت چھین لیتے ہیں۔اور آہستہ آہستہ سماج تباہی و بربادی کی طرف گامزن ہو جاتا ہے۔جن مسائل سے سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا ہے یا جو مسائل کسی سماج میں طبقاتیت کے نظام سے جنم لیتے ہیں ان کا ذکر "جہنمی لوگ" میں بہ خوبی ہوا ہے۔

خس و خاشاک زمانے:

"خس و خاشاک زمانے" مستنصر حسین تارڑ کا ناول ہے جو ۲۰۱۰ء میں طباعت کے مرحلے سے گزرا۔"خس و خاشاک زمانے" کو کسی ایک موضوع تک محدود نہیں کیا جاسکتا۔اس ناول میں ۱۹۳۰ء سے لے کر ۲۰۰۱ء تک کے عرصے کو تین نسلوں کے ذریعے سے پیش کیا گیا ہے۔تقریباً ساڑھے سات سو صفحات پر مشتمل یہ ناول تقسیم سے قبل اور بعد کے حالات کو باخوبی بیان کرتا ہے۔تقسیم سے قبل مسلمانوں اور سکھوں کے آپسی تعلقات ہوں، آزادی کے خون ریز فسادات، پاکستان میں بننے والی حکومتیں ۱۹۷۱ء کا سانحہ، ضیاء الحق کا دور، نائن الیون سمیت سیاست کے اتار چڑھاؤ، مذہبی، معاشی اور ذات پات کے سماجی نظام کو اس ناول کے پلاٹ میں خوبصورتی سے سمویا گیا ہے۔کئی کرداروں کی مدد سے یہ ناول آگے بڑھتا ہے اور قاری کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

ناول کا آغاز بخت جہاں سے ہوتا ہے جو اپنی بھتیجی سے بیمار ہو کر مرنے والے مرغ کی بھیک مانگ رہا ہے۔اس ناول میں فلیش بیک کی تکنیک استعمال کر کے مختلف ادوار کو مختلف کرداروں کے ذریعے سے بیان کیا گیا ہے۔ناول کو آسانی کی خاطر اگر تین حصوں میں تقسیم کر لیا جائے تو سمجھنے میں مدد ملے گی۔پہلے حصے کا لوکیل دنیا پور ہے جو پنجاب کے ضلع گجرات کا گاؤں ہے۔یہاں جاٹ برادری دیگر برادریوں کے ہمراہ زندگی گزار رہی ہے۔بنیادی طور پر جاٹ برادری سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان برائے نام / مذہب کی بنیاد پر تقسیم ہے لیکن بطور جاٹ یہ سب ایک ہی ہیں۔بخت جہان کی طرح یہ جاٹ برادری متکبرانہ زینت کی حامل ہے،بخت جہان کے دو بھائی الف جہان اور محمد جہان ہیں۔الف جہان ایک خاموش طبیعت کا شخص تھا جو تیس سال کی ہی عمر میں مر جاتا ہے۔محمد جہان گاؤں کا نمبر دار اور شریف النفس و محنتی انسان ہے۔اس کی پانچ بیٹیاں

تھیں جن میں سے دو بچپن میں ہی فوت ہو جاتی ہیں۔ ماہلو ایک خوب صورت رومانوی کردار ہے جسے اس کی سوتن زہر دے کر مار دیتی ہے نور بیگم آخر تک زندہ رہتی ہے۔

بخت جہان ایک خود پسند اور عیاش پرست زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنے دوست لہناں سنگھ کی بیوی امرت کور کو پسند آجاتا ہے جو اپنے دو بچوں سمیت اس کے گھر چلی آتی ہے اور کنیز فاطمہ بن کر زندگی گزارتی ہے۔ گوبند سنگھ (فتح محمد) اور نونہال سنگھ (غلام محمد) بن جاتے ہیں۔ فتح محمد فوج میں چلا جاتا ہے اور ۱۹۷۱ء کے واقعے میں ہتھیار ڈالنے کے بعد مر جاتا ہے۔ غلام محمد چور بن جاتا ہے اور چوری کے دوران میں زخموں کی تاب نہ لا کر مر جاتا ہے۔ بخت جہان کی بیوی بھاگ بھری سے بھی ایک بیٹا اکبر جہان ہوتا ہے جو ناول کے تیسرے حصے میں بھی زندہ رہتا ہے۔

بخت جہان ۱۹۷۱ء کے سانحے کو برداشت نہیں کر سکتا اور مر جاتا ہے۔ وہ ایک سخت ذہنیت کا حامل شخص ہے جو اپنے بھائی کی بیٹیوں کی ڈولیاں بھی نہیں اٹھنے دیتا اور بھتیجے عزیز جہان کو بھی گاؤں چھوڑنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ امیر بخش کوٹ مراد کے ایک کسان کا بیٹا ہے جو میٹرک کے بعد نوکری کی تلاش میں خوشی محمد گوندل کے کتوں کا شکار ہوتا ہے۔ وہ، عزیز جہان اور سروسانسی آگے چل کر ایک کمپنی کھولتے ہیں جس سے وہ معاشی لحاظ سے آسودہ ہوتے ہیں۔ اس کا یک بیٹا روشن ہوتا ہے۔

ناول کا دوسرا حصہ لاہور کے لوکیل پر مشتمل ہے جہاں گاؤں سے آئے تینوں مذکورہ کردار در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور یہیں لاہور میں رہائش اختیار کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ کوٹ مراد کا سوہن سنگھ بھی ہوتا ہے جنہیں آزادی کے دوران میں ایک گوردوارے میں جلا دیا جاتا ہے۔ لاہور میں سروسانسی جو ایک مردار کھانے والا شخص ہے اور دنیا پور کا رہنے والا ہے ایک روز مسجد سے ایک بچے کو اٹھالاتا ہے جو بعد میں ایک صحافی و لکھاری انعام اللہ بنتا ہے۔ امیر بخش عزیز جہان کی بہن نور بیگم سے شادی کر لیتا ہے جس سے ایک بیٹا روشن ہوتا ہے جو ناموس رسالت کے نام پر مار دیا جاتا ہے۔ عزیز جہاں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والی پشپی سے شادی کرتا ہے۔ سروسانسی کے دو بیٹے موتی اور موجو (سلیمان شاہ) ہوتے ہیں سلیمان شاہ سیدوؤں کا روپ دھار لیتا ہے۔

ناول کا تیسرا حصہ امریکہ اور کینیڈا کے لوکیل کو لیے ہوئے ہے۔ انعام اللہ مذہبی شدت پسندی سے تنگ آکر امریکہ میں رہائش اختیار کرتا ہے۔ اکبر جہاں جو بخت جہان کا بیٹا ہے وہ کینیڈا میں رہنے لگتا ہے اور موتی بھی وہیں ہجرت کر جاتا ہے۔ موتی کی ایک بیٹی شباہت ہے جو ناول کے اختتام تک رہتی ہے اور انعام اللہ

کے ساتھ مل کر ایک نئی سوچ نئے خواب کے آغاز کا عہد کرتی ہے۔ اکبر جہاں کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوتی ہے۔ بیٹا بخت جہاں شباہت سے پیار کرتا ہے لیکن وہ انعام اللہ کو چاہنے لگتی ہے جو امریکہ سے کینیڈا منتقل ہوا ہوتا ہے۔ سروسانسی موتی، امیر بخش، روشن، نور بیگم، سید سلیمان شاہ، فتح محمد سب کردار کسی نہ کسی سانحے کا شکار ہو کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ بخت جہان عرصہ دراز کے بعد امرت کور کے پاس آتا ہے تو وہ اسے فتح محمد سمجھتی ہے اور وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ شباہت اور انعام ایک نئی زندگی کے آغاز کے لیے نکل پڑتے ہیں۔

بنیادی طور پر "خس وخاشاک زمانے "ایک تاریخی، سیاسی، مذہبی، ذات پات، سرمایہ دارانہ نظام، نائن الیون کے واقعے، اقتصادی مسائل اور تہذیبی ٹکراؤ کو بڑی خوب صورتی سے بیان کرتا ہے۔ منشا یاد لکھتے ہیں:

> اس ناول کا کوئی ایک موضوع متعین نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ ہر اچھے ناول کی طرح یہ بھی اپنے اندر زندگی کے سارے ہی رنگ اور ذائقے لیے ہوئے ہے اور رات کسی ایک جگہ، ملک اور زمانے تک محدود نہیں کیا سکتا کہ اس میں کئی زمانے اور برصغیر پاک وہند اور دنیا کے بہت سے اہم واقعات وسانحات اور تاریخی حوالے ملتے ہیں تاہم آسانی کے لیے اسے ایک سماجی، سیاسی اور فکری ناول کہہ سکتے ہیں۔ (۲۴)

مستنصر حسین تارڑ نے ناول کی کہانی کو واقعات کے ذریعے آگے بڑھانے کے بجائے کرداروں کے ذریعے سے آگے بڑھایا ہے۔ ناول نگار نے متنوع کرداروں کا ایک انمٹ نقش قارئین کے ذہنوں پر مرتسم کیا ہے۔ ناول نگار نے ایک طویل دورانیے پر مشتمل زندگی کے چکر کو نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے۔ سماجی، معاشی، تاریخی، سیاسی، تہذیبی ہر لحاظ سے ناول کو مکمل کہا جاسکتا ہے۔ حرام وحلال کا تصور ہو یا جنسیت، نائن الیون کا واقعہ ہو یا سقوط ڈھاکہ اور عراق کی سماجی صورت حال اپنی پوری وسعت کے ساتھ ان کا اظہار ہوتا ہے۔ غفور شاہ قاسم لکھتے ہیں:

> قیام پاکستان سے قبل مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان تعلقات ہوں یا ۱۹۴۷ کے خونیں فسادات، صدر ایوب خان، یحیٰی خان، ضیاء الحق اور پرویز مشرف کے شرمناک ادوار حکومت ہوں یا ۱۹۷۱ میں سقوط ڈھاکہ کا المیہ۔ یحیٰی خان کی مذموم حرکات ہوں یا جنرل نیازی کا بزدلانہ رویہ، یہ ان سب واقعات کو ناول کے پلاٹ میں فنی مہارت سے سمو دیا گیا ہے۔ گجرات، لاہور، نیویارک، کینیڈا، افغانستان اور عراق کی سماجی صورت

حال کا گرافک بیان ناول نگار کے وسیع مطالعے گہرے اور باریک مشاہدے کی دلیل ہے۔[۲۵]

"خس وخاشاک زمانے" میں ذات پات کے نظام کو بھی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ آج کا سماج ذات پات اور عقائد میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ بلاشبہ یہ تقسیم تاریخی اعتبار سے ایک طویل عرصے پر محیط ہے لیکن یہ دن پر دن بڑھتی جارہی ہے۔ آج اس جدید سماج میں جہاں ہر نسل، ہر رنگ، ہر مذہب، ہر علاقے کے افراد ایک دوسرے کے اتنے قریب آچکے ہیں کہ ان کے درمیان فرق کرنا مشکل ہوتا ہے اس کے باوجود نسلی برتری آج بھی موجود ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے جاٹ نسل کے خدوخال بیان کر کے جاٹ برادری کی فکری سوچ سے آگاہی مہیا کی ہے۔ بلاشبہ ناول میں ذات پات کے نظام سے کسی سماجی مسئلے کو بہ ظاہر بیان نہیں کیا گیا لیکن واضح کیا ہے کہ کس طرح برادری اور ذات کی وجہ سے تقسیم ہو کر معاشی لحاظ سے افراد معاشرہ قلاش ہو جاتے ہیں۔ ایک طرف کشمیری لوگوں کا تذکرہ ہے جو ہر کام کرنے کو تیار ہیں تو دوسری طرف جاٹ برادری کے تفاخر کے نتیجے میں معاشی ناہمواری کا شکار افراد۔

مذہبی تقسیم نے بھی ہمارے آج کے سماج کو تقسیم کا شکار بنا رکھا ہے۔ عقائد کے اس اختلاف نے سماجی گھٹن اور تقسیم کو پروان چڑھایا ہے۔ ایک طرف برصغیر کی تقسیم ہے تو دوسری طرف نائن الیون کے واقعے کے بعد مذہبی نفرت اس ناول میں بہ خوبی اپنا اظہار کرتی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے خون ریز فسادات کی بنیاد بھی عقیدہ بنا اور پھر افغانستان اور پاکستان میں ضیاء الحق کی پالیسیاں ہوں یا تیار کردہ مذہبی جنونی دہشت گردی سب نے انسانیت کو استحصال اور ظلم سے دوچار کیا۔ مذہب کے نام پر برصغیر کے خطے کو تین حصوں میں تقسیم کر کے جس شدت پسندی کا بیج بویا گیا ہے وہ اس وقت ایک ناسور بن گیا ہے۔ یہاں کے حکمرانوں کا سامراجی نظام کے آلہ کار کے طور پر استعمال ہونا شدت پسندی و بنیاد پرستی کو ہوا دینے میں اہم رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مستنصر نے اس نکتے کو تفصیل سے ناول میں بیان کر کے یہ ثابت کیا کہ ریاستیں مذہب کے نام پر قائم نہیں رہ سکتیں۔ مذہبی بنیادیں ریاست کی ساکھ کو متاثر کرتی ہیں اور اسے مسائل کے انبار میں پھنسا دیتی ہیں۔ ملک پاکستان میں جس طرح اس بیج کو بویا گیا اس سے انتہائی خطرناک صورت حال نے جنم لیا۔ ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں:

> دوسری جانب جنرل ضیاء کے دور کی پالیسز خاص کر بھٹو کی پھانسی اور مذہبی حوالے سے انتہا پسندانہ پالیسیز اور افغان روس جنگ میں امریکوں کے آلہ کار کے طور پر استعمال

ہونے والی شدت اور انتہا پسندی نے اس قوم کو جس راستے کا مسافر بنا دیا ہے وہاں تباہی
اور بربادی کی ایک تاریخ ہی رقم ہو سکتی تھی جو کہ ہو کر رہی۔ (۲۶)

پاکستان بطور ریاست مذہبی انتہا پسندی کا گڑ جس طرح بنا اس کی تصویریں چلتی پھرتی اس ناول میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں مذہب کے نام پر بھائی بھائی کا دشمن ہے اور سامراجی طاقتیں اسی بنیاد پرستی کا استعمال کر کے مذہب اسلام کے نام پر بنی ریاستوں کو کمزور کرنے کی کوشش میں لگی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ نے مذہبی مزاحمت کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ریاست کو مذہب کے نام پر قائم کرنے اور چلانے سے کس طرح استحصال اور ظلم و ستم کی داستانیں رقم ہوئی ہیں۔ چاہے ۱۹۴۷ء کے واقعات ہوں یا ضیا دور کی پالیسی، افغانستان جنگ ہو یا نائن الیون اور عراق کی تباہی مذہب انسانیت کو تقسیم کرنے میں بطور آلہ کار استعمال ہوا ہے۔ یہاں "خس و خاشاک زمانے" کی تعبیر مارکسی بیگانگی کے تناظر میں کی جائے گی اور پس پردہ وجوہات سے بھی آگاہی حاصل کی جائے گی۔

ا۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی:

مارکس کے خیال میں جب سماج میں کسی محنت کش کو اُس کی محنت کا برابر صلہ نہیں ملتا تو وہ محنت سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ محنت میں دلچسپی نہیں لیتا اور اُس کی ذات اس عمل میں دکھائی نہیں دیتی۔ "خس و خاشاک زمانے" بھی ایک ایسا ناول ہے جس میں ہمیں محنت کش / تخلیق کار کی محنت سے بیگانگی کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ناول کئی موضوعات لیے ہوئے ہے اور مارکسی عناصر کی بھی اس میں کمی نہیں۔ مستنصر نے جس مذہبی مغائرت کا ذکر کیا ہے دراصل مذہبی مغائرت بھی معاشی بنیادوں پر کھڑی ہے۔

انعام اللہ جو سروسانسی کو مسجد کی سیڑھیوں سے ملا تھا۔ جہاں اُسے ایک نعت خواہاں جان سے مارنے اور حرام قرار دینے کی دلیلیں دے رہا تھا۔ سروسانسی نے اُسے اپنا بیٹا بنا کر اٹھالیا۔ اُس کی پرورش سروسانسی، عزیز جہاں اور امیر بخش کے ہاتھوں ہوئی اور وہ امیر بخش کے نام سے پہچانا جانے لگا۔ اُس نے صحافت کے شعبے کو اپنایا۔ سماج میں پھیلی ہوئی مذہبی انتہا پسندی اور آمریت کی پالیسیوں کو در غور اعتنا نہ سمجھا اور کھل کر اس پر تنقید کی۔ اس تنقید کے نتیجے میں اُسے سخت سزا دی گئی، مارا پیٹا گیا۔ وہ جس منصب سے اپنا فریضہ ادا کرنا چاہتا تھا اُس فریضے کے ادا کرنے میں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کی محنت کا جو صلہ اُسے ملنا چاہیے تھا اُس کے بدلے میں اُسے کوڑے پڑے جس سے اُس نے اس راہ کو ترک کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جس شعبے سے وہ وابستہ ہے وہ اُس کی شخصیت کا اظہار کبھی نہیں ہونے دے گا اس لیے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔

لوگ انعام اللہ کے حرف پر اعتماد کرتے تھے کہ وہ جو کچھ لکھتا ہے کسی بھی ستائش یا تمنا سے ماورا ہو کر اپنے وطن کے ضمیر کی آواز پر کان دھر کر لکھتا ہے۔ اور نہ ہی اُس نے اپنی پشت پر ثبت دروں کے نشانوں کو کیش کروایا ہے اور اس کے باوجود وہ صحافت کے پیشے سے مکمل طور پر جڑ نہ سکا۔ زندگی بھر کے لیے ایک صحافی رہنے کے امکان سے مفاہمت نہ کر سکا۔[۲۷]

انعام اللہ ایک نڈر اور بے باک صحافی تھا جو اپنے ملک کے حکمرانوں کی پالیسیوں کو ہدف تنقید بناتا تھا لیکن اُس کی اس تنقید کو قابل قبول تصور نہیں کیا گیا اور جس محنت اور شوق سے وہ اپنا فریضہ انجام دے رہا تھا اُس سے اُسے مایوسی ہوئی۔ جب کسی محنت کرنے والے شخص کو محنت کا صلہ نہ ملے وہ جس پھل کا حقدار ہے وہ اُسے نصیب نہ ہو تو وہ اُس عمل سے خود کو علیحدہ کر لیتا ہے۔ یہی انعام اللہ کے ساتھ ہوا جو منظور نظر جیسے سوشلسٹ ذہنیت کے حامل استاد کا تربیت یافتہ تھا۔ جب اپنے لیے حالات کو نامساعد پاتا ہے تو اپنی تخلیق سے لاپرواہ ہو جاتا ہے یہی وجہ ہوتی ہے کہ اُسے مذہبی پہلوؤں میں الجھا کر ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ نے "خس و خاشاک زمانے" میں سانسی نسل کے انسان دوست اور عقائد سے بالا تر خیالات اور سوچ کے حامل لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ سروسانسی اور اُس کا قبیلہ صدیوں سے ایسے ہی جیتا چلا آرہا ہے۔ وہ کسی عقیدے کو نہیں مانتے اور حلال و حرام کی تمیز بھی نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک ہر چیز انسان کے استعمال کی ہے محض عقائد کے نام پر تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ طبقہ سماج میں پست ترین اہمیت کا حامل دکھایا گیا ہے۔ ایسے قبیلوں کی سماج میں عزت و وقار نہیں ہوتا وہ جو کماتے کھاتے ہیں وہ ایک ذلیل طبقے کی حیثیت سے ۔ انھیں کسی اعلیٰ مقام اور رتبے کا خیال نہیں ہوتا۔ اُن کا یہی طرز زندگی انھیں سماج میں کمزور بنا دیتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ہی اس مقام پر گر گئے ہیں بل کہ تاریخی تسلسل میں انھیں معاشی اعتبار سے کمزور طبقہ تسلیم کر کے گروہوں میں بانٹ دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے نچلے طبقات صدیوں سے دوسروں کے لیے محنت کرتے آئے ہیں۔ سروسانسی کا بیٹا موتی جو کسی عقیدے کو نہیں مانتا اس بنا پر اُسے اُس کی محنت کا پھل بھی نہیں میسر آتا وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتا ہے لیکن اُسے اُس تعلیم کے بدلے میں محض رسوائی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ در در پھرتا ہے لیکن اسے عقیدے کی بنا پر کوئی اچھی ملازمت میسر نہیں آتی۔

موتی نے اپنے پاوں پر کھڑا ہونے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے لیکن ہر موقع پر ہر انٹرویو میں اُس کا سانسی ہونا آڑے آجاتا اور لوگ بدک جاتے۔۔۔ وہ بڑے دھڑلے سے مذہب

کے خانے میں "لامذہب سانسی" درج کرتا اور پھر اس کا خمیازہ بھگتتا۔اس نے چند معمولی نوکریاں کیں، کچھ عرصہ ایک بینک میں کام کیا اور پھر یکدم منظر سے غائب ہو گیا۔(۲۸)

مذکورہ اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مذہب اُس کے آڑے آتا رہا۔ بلاشبہ مذہب بطور ایک ٹول کے ہی اُس کے خلاف استعمال ہوا۔ لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ مذہب بھی بذات خود سماج میں معاشی تقسیم سے پیدا ہونے والے مسائل اور طبقاتی نظام کے خاتمے کے لیے آتا ہے۔ تقسیم کے نتیجے میں لوگ غلط روایات اور عقائد کو اپناتے ہیں اُن کے اوپر معاشی طور پر بالادست طبقہ حکمرانی کرتا ہے۔ مذہب صرف عقائد نہیں سماجی و اقتصادی مسائل کے حل کا ذریعہ ہوتا ہے۔ موتی ایک ایسا کردار ہے جو عقیدے کو تسلیم نہیں کرتا بل کہ سماج کے فرد کے طور پر محنت کرتا ہے۔ اُس کی محنت کو محض مذہب کے نام پر روند دیا جاتا ہے۔ جس کا حتمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ملک چھوڑ کر کینیڈا چلا جاتا ہے جہاں بلا تفریق اُسے زندگی کا روزگار میسر آتا ہے یہاں اُسے روزگار کے لیے در در بھٹکنا پڑا۔ اُسے اُس کی محنت و عمل کا پھل میسر نہ آیا تو اُس نے خود کو اس سماج سے علیحدہ کر لیا۔ فیوئر باخ نے سماج میں موجود تقسیم اور مغائرت کو مذہب سے جوڑا لیکن مارکس نے اسے معاشی بنیادیں فراہم کیں کہ کس طرح مذہب بھی ایک ٹول بن جاتا ہے اور اصل مسئلہ جس سے یہ مسائل جنم لیتے ہیں اُسے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو اُس کی محنت کا صلہ ملنا چاہیے نہ کہ کسی تقسیم کی بنیاد پر۔

پاکستان میں قائم سیاسی، معاشی و سماجی نظام کے خلاف کئی لحاظ سے جدوجہد نظر آتی ہے۔ انسانیت کے پرچارکروں نے ہمیشہ ان بنیادوں کو ہدف تنقید بنایا جن پر ہمارا سماج قائم ہے اور دن پر دن پستی کی طرف جا رہا ہے۔ سیاسی اعتبار سے ابتداء میں ہی ترقی پسند تحریک سے متاثر افراد نے جدوجہد شروع کی لیکن جلد ہی مذہب کو بنیاد بنا کر اُن کی ان کاوشوں کو روند دیا گیا۔ بالا آخر بھٹو کے سیاسی اسٹنٹ نے ہل چل مچائی لیکن یہ بھی دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ جن افراد نے اس تحریک سے خود کو وابستہ کیا وہ وجود میں آنے والی پالیسیوں کو دیکھ کر خود ہی علیحدہ ہو گئے۔

منظور نظر "خس و خاشاک زمانے" میں ایک ایسا کردار ہے جو بطور معلم سرمایہ داری نظام کے خلاف سیاسی جدوجہد کرنے کے لیے تربیت کرتا ہے۔ بھٹو کے دور میں وہ ایک نئے نظام کے قیام کا خواہشمند ہے لیکن جب اُس کی مرضی اور جدوجہد کے نتیجے میں نظام کی تشکیل نہیں ہوتی تو وہ ملک چھوڑ کر امریکہ جا بستا ہے۔ انعام اللہ جب اُسے یوں بھاگ آنے کی وجوہات پوچھتا ہے تو وہ کہتا ہے:

منظور نظر نے اُس کا فقرہ مکمل نہ ہونے دیا کہ وہ اس اعتراض کا عادی ہو چکا تھا" میں نے کیوں اس سرمایہ دارانہ نظام کے تحت زندگی کرنے کو قبول کر لیا۔۔۔اس لیے کہ میں ایک کمزور شخص تھا۔ انقلاب برپا کرنے کے لیے مسلح جدوجہد کا پرچارک تو تھا لیکن میں کبھی بندوق تھام کر اپنے مقصد کے حصول کے لیے میدان میں نہیں اتر سکتا تھا۔۔۔میرا ذہن ہر نوعیت کے دباؤ کو سہہ سکتا تھا لیکن میرا بدن اُس پیلے درے کی زد سے ذرا سا ادھڑا تو مجھ میں اس اذیت کو برداشت کرنے کی سکت نہ تھی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ جب ایک سوچنے سمجھنے والے بہتر مستقبل کے خواب دیکھنے والے یونی ورسٹی میں لیکچر دینے والے کی پشت پر درے برستے ہیں تو اس پر کیا گزرتی ہے۔وہ فوراً ایک معافی نامے پر دستخط ثبت کر کے شکاری کتوں کے جبڑوں سے نکل جاتا ہے۔[۲۹]

یعنی ایک ایسا فرد جو ذہنی یا جسمانی کسی بھی عمل / محنت سے گزرتا ہے اور اُس کے نتیجے میں اُس کی پیداوار / نتیجے کا صلہ اُسے نہیں ملتا تو وہ اس محنت سے خود کو علیحدہ کر لیتا ہے جیسے منظور نظر۔اسی طرح کے کئی افراد نے جنھوں نے خالصتاً پاکستان میں انقلابی جدوجہد کی جب انھیں اُس جدوجہد کے بدلے میں سزائیں دی گئیں یا انھیں قید کیا گیا تو انھوں نے اس راہ سے خود کو علیحدہ کر لیا۔یہی محنت کی بیگانگی ہے۔

چوں کہ محنت کا تعلق جسمانی اور ذہنی دونوں پہلوؤں سے ہے اس لیے اس عمل سے دونوں طرح کے عمل کرنے والے متاثر ہوتے ہیں۔ایسا نہیں کہ فیکٹریوں میں کام کرنے والے افراد ہی محنت کے عمل سے گزرتے ہیں بل کہ ہر شخص جو ذہنی عمل کرتا ہے وہ محنت کر رہا ہوتا ہے۔اس لیے وہ اگر بھرپور نتیجے سے فیض یاب نہیں ہوتا تو وہ آہستہ آہستہ اُس محنت سے کترانے لگتا ہے۔ایسا ہی ایک کردار "خس و خاشاک زمانے" میں بھی دکھایا گیا ہے جو پاکستان تھیٹر اور ٹیلی وژن کے لیے ڈراموں میں اداکاری کرتا تھا لیکن اُسے اُس کی صلاحیت کے مطابق مقام نہ ملا۔اس لیے وہ پاکستان چھوڑ کر امریکہ میں روزگار کی تلاش میں بھٹکنے لگا:

روزگار کی تلاش میں لٹل پاکستان، لٹل انڈیا کے علاقے جکیسن ہائٹ میں بھٹکتے ایک شب ایک ایسے مخمور بوڑھے سے ملاقات ہو گئی جو کسی زمانے میں پاکستان ٹیلی وژن کے ڈراموں میں چھوٹے موٹے کردار ادا کیا کرتا تھا اور مناسب اہلیت کا اداکار تھا۔وہ اپنے تئیں ایک عظیم اداکار تھا جس کی صلاحیت کی نہ پاکستان نے اور نہ ہی پاکستان ٹیلی ویژن نے کچھ قدر کی۔[۳۰]

ایک تخلیق کار کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُس کی تخلیق کو سراہا جائے لیکن جس سماج میں اُس کی تخلیق کی قدر نہیں کی جاتی لامحالہ وہ وہ اُس عمل سے خود کو الگ کر لیتا ہے۔ اس لیے سماج میں چاہے محنت کسی بھی نوعیت کی ہو اگر اُسے اُس کا برابر صلہ دے دیا جائے تو ایک ہموار اور متوازن سماج کی بنیادیں قائم ہو سکتی ہیں لیکن اگر ایسا نہ ہو تو افراد معاشرہ ایسے عمل میں شریک نہیں ہوتے اور سماج میں خود کو اکیلا سمجھتے ہوئے سماجی عمل سے لاتعلق ہو جاتے ہیں۔

۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی:

محنت کی پیداوار سے بیگانگی کا مطلب ہے کہ جو شخص محنت کرتا ہے اس محنت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی چیز اُس کی نہ رہے بل کہ کسی اور کی ملکیت میں چلی جائے۔ اس طرح ایک محنت کش کی محنت کی پیداوار جو اُس کی ذات کا حصہ ہونی چاہیے تھی کسی اور کی ملکیت بن کر محنت کش کے لیے حریف کے طور پر سامنے آتی ہے۔ تارڑ نے جاٹ برادری کی متکبرانہ ذہنیت کو بیان کرتے ہوئے موازنے کے طور پر دوسری طرف کشمیریوں کا ذکر کیا ہے۔ کشمیر کے لوگ روزگار کے سلسلے میں برصغیر پاک و ہند کے علاقے لاہور کی طرف عموماً رخ کرتے تھے۔ یہاں وطن سے دور روٹی کی مجبوری کے باعث ہر طرح کے کام کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیتے تھے۔ وہ قلی بن جاتے، ریڑھے کھینچتے، منڈیوں میں مزدوروں کا کام کرتے اور دو وقت کی روٹی حاصل کرتے تھے۔ امیر بخش جو دسویں تک پڑھائی کر چکا تھا جب خوشی محمد گوندل نے اس کے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کرنے کے بجائے اس کو کتوں سے کٹوایا تو وہ بھی لاہور کی طرف چل پڑا جہاں اُس نے کشمیریوں کو محنت کرتے ہوئے دیکھا اور اپنی ذات پر اُسے قلق بھی ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھا کہ کس طرح اُن مزدوروں سے رقم ہتھیائی جاتی ہے اور وہ خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں:

> ایک روز شہر کی سبزی منڈی میں گیا تاکہ ایک پانڈی کے طور پر سبزیوں کے ٹوکرے اٹھا کر ریڑھوں میں رکھ سکے پر وہاں کشمیر سے آئے ہوئے ہاتو لوگوں کا راج تھا جو اتنے مسکین تھے کہ صرف چند آلوؤں کے عوض سارا دن گدھوں کی مانند مشقت کرتے رہتے اور شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر نہ لاتے۔۔۔ بلکہ کئی آڑھتی اُن کی مجبوری کا فائدہ اٹھا کر اُن سے مفت کی بیگار لیتے اور پھر بھی وہ ہنستے مسکراتے رہتے اُف تک نہ کرتے۔[۳۱]

یعنی ان مزدوروں کو اپنی محنت کی پیداوار سے بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ دن بھر بوجھ اٹھاتے اور بدلے میں حاصل ہونے والی آمدنی اُن سے اوپر بیٹھے آڑھتی اُن سے مختلف حیلے بہانوں سے ہتھیا لیتے تھے۔ چوں کہ کثیر مزدوروں کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ وہ جو محنت کرتے ہیں اُس محنت کو کرنے کے لیے ان بالائی افراد نے انھیں موقع فراہم کیا ہے ورنہ انھیں روزگار ہی حاصل نہ ہوتا۔ اس طرح وہ جو کچھ اس عمل سے حاصل کرتے ہیں اُس میں سے بالائی طبقہ جو رقم ہتھیاتا ہے اُن کے نزدیک اُن کی نہیں ہوتی بل کہ اُن کی قسمت میں بس وہی تھا جو انھیں مل گیا۔ یوں وہ اپنی محنت کا استحصال کراتے ہیں اور باقی طبقے اس سے فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ یہی محنت کی پیداوار سے بیگانگی کا عمل ہے کہ جب محنت کش اپنی ہی محنت کو اپنا تصور کرنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔

"خس و خاشاک زمانے" میں تارڑ نے سروسانسی جیسے ناقابل فراموش کردار کو تخلیق کیا۔ وہ ایک حقیر ذات کا نمائندہ کردار ہے۔ وہ عزیز جہاں کے ساتھ دینا پور سے اس کا خیال رکھنے کے لیے لاہور آتا ہے۔ لاہور میں اُن دونوں کی ملاقات امیر بخش سے ہوتی ہے۔ وہ تینوں مل کر رہنے لگتے ہیں اور آگے چل کر ایک کمپنی بھی بنا لیتے ہیں۔ شروع میں جب وہ محنت مزدوری کے لیے نکلتے تھے تو انھیں ان کی جسامت دیکھ کر کام دیا جاتا تھا۔ سروسانسی چوں کہ مضبوط جسامت کا حامل تھا اس لیے اُسے کام مل جاتا تھا اور اُس کے مالک عزیز جہاں اور امیر بخش کو کام نہ ملتا۔ وہ دن بھر جو کچھ کماتا تھا شام کو لا کر امیر بخش کو دے دیتا۔ اگرچہ امیر بخش اُسے منع بھی کرتا لیکن وہ کمتر ذات کا ہونے کی وجہ سے اُس کمائی کو اپنا تصور کرنے کے بجائے اُن کی تصور کرتا تھا۔

سروسانسیوں کا طبقہ صدیوں سے حقیر تصور کیا جاتا رہا ہے۔ وہ لوگوں کے گھروں سے مانگ تانگ کر گزارا کرتے، کچی بستیوں میں اُن کے ڈھیرے ہوتے تھے جہاں گندگی کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ اُن کا روزگار جونکوں سے خون چوسوا کر روٹی حاصل کرنا اور نشے والی اشیاء تیار کرنا تھا۔ اُن کی ذہنیت بھی اسی طرح کی تھی کہ وہ خود کو کمتر و ذلیل تصور کرتے اور عقائد و ذات پات میں بٹے ہوئے افراد کو اعلیٰ۔ امیر بخش نے اُسے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا تو وہ سانسی اسے اپنا مالک تصور کرنے لگا اور دن بھر کی محنت مزدوری سے حاصل ہونے والی رقم اُسے تھما دیتا تھا:

> ایک ایسی ہی شب جب وہ دونوں سروسانسی کے طفیل بھوکے نہ سوئے تھے۔ وہ کچے فرش پر پھنیر کی مانند سرکتا امیر بخش کے قریب آگیا "چوہدری"، امیر بخش نے بڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں، وہ اندھیرے میں اندھیرا ہو کر نظر تو نہ آتا تھا پر اُس کی آواز اُس کا

پتا دیتی تھی۔ چوہدری۔۔۔نہ میں نے بہت دن سے کوئی نیولا نہیں کھایا ہے اور نہ ہی سلفے کا سوٹا لگایا ہے۔۔۔میرا جثہ ادھڑنے لگا ہے تو مجھے دو چار آنے دے تاکہ میں میں اُسے جوڑ سکوں۔ تو مان نہ مان میں تیرا کتا ہوں۔۔۔"

وہ اپنی کمائی میں سے ہی کیسے اتنی لجاجت سے بھیک مانگتا تھا۔ (۳۲)

سماج میں جب طبقاتی تفریق ہوتی، عقائد، ذات پات کے تصورات قائم ہوتے ہیں تو کچھ اعلیٰ اور کچھ ادنیٰ درجے پر فائز ہوتے ہیں۔ جو معاشی لحاظ سے کسی طرح کمزور ہوتے ہیں وہ ادنیٰ اور جو متوازن حالات میں جی رہے ہوں اعلیٰ درجے کی سطح پر آجاتے ہیں۔ یوں اس ذات پات اور عقائد کے فرق میں بھی معاشی پہلو بنیادی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ آج ہم جب سماج کا بغور تجزیہ کرتے ہیں تو بالکل واضح ہوتا ہے کہ طبقات، ذات پات وغیرہ کی بنیاد بھی یہی رہی۔ یوں ذات پات کا یہ نظام بھی مضبوط ہوا اور صدیوں سے چلتا آرہا ہے۔ یہی حال سروسانسی کا بھی ہے۔ اُس کی سوچ اور خیال میں عزیز جہاں اور امیر بخش اُس کے مالک ہیں اور یہ حاصل ہونے والی کمائی انھی کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے جب وہ اپنی ہی محنت کی کمائی سے کچھ حصہ مانگتا ہے تو خود کو مالکوں کا کتا تصور کرتا ہے۔ اوپر کے یہ طبقے آہستہ آہستہ مضبوط ہو جاتے ہیں اور نچلے کمزور تو نظام میں خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔

بخت جہان ناول کا اور جاٹ برادری کا ایک متکبر اور عیاش پرست کردار ہے جو اپنے بھائی کی جائیداد پر بھی قبضہ کر لیتا ہے اور بھتیجوں کی زندگی بھی خراب کرنے پر تل جاتا ہے۔ وہ گیت و شراب کی محفلیں سجاتا ہے اُسے شراب مہیا کرنے والے اسی کی بستی کے سامنے رہنے والے سانسی ہیں۔ ایک دن وہ شراب کے لیے لنگڑ سانسی کے پاس جاتا ہے وہ اپنی شراب کی تعریف کرتا ہے اور ایک مٹکا بخت جہاں کو دے دیتا ہے۔ بخت جہاں جب اُسے روپے دینے کے لیے جیب ٹٹولتا ہے تو وہ روپے لینے سے انکار کر دیتا ہے کہ تم ایک اعلیٰ ذات کے مالک چودھری ہو میں تم سے رقم کیسے لیے سکتا ہوں۔ یوں یہاں اُس کی ذات اُس کی محنت کی پیداوار سے اُسے بیگانہ کر دیتی ہے۔ وہ جسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے تیار کیا اُس کی قیمت وصول کرنے سے قاصر ہے:

بخت جہان نے اپنے کرتے کی خالی جیب کو ٹٹولا تو لنگڑ سانسی نے ہاتھ جوڑ دیئے۔۔۔"راجے کا کھٹیا۔۔۔چوہدری بخت جہان کا کھٹیا۔۔۔چوہدری ساری حیاتی تمھارا کھایا ہے۔۔۔مجھے شرمسار نہ کر۔۔۔ (۳۳)

بخت جہان کی بیوی بھاگ بھری سے اکبر جہان کی پیدائش ہوتی ہے جب امرت کور کنیز فاطمہ بن کر بخت جہان سے آملتی ہے تو بھاگ بھری بچوں سمیت گھر چھوڑ کر اپنے بھائیوں کے گھر چلی جاتی ہے، جہاں اکبر جہان محنت کر کے اپنی ماں اور بہنوں کا پیٹ پالتا ہے۔ وہ ماموں زاد بھائیوں کے کھیتوں پر دن بھر کام کرتا ہے جس کے بدلے میں اُسے اور ماں سمیت بہنوں کو وہاں رہنے کی اجازت ملتی ہے۔ لیکن جب اُس کے ماموں فوت ہوتے ہیں تو ماموں زاد اُس سے سوتیلوں والا سلوک شروع کر دیتے ہیں۔ اکبر جہان کی محنت سے پیدا ہونے والی فصل میں سے اکبر جہان کو کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا۔ اُس کی ماں اُسے یہ جگہ چھوڑ کر کہیں چلے جانے کے لیے کہتی ہے بعد میں وہ کینیڈا شفٹ ہو جاتا ہے اور اس سرزمین سے اپنا رشتہ کاٹ لیتا ہے۔ جب وہ ایک کھیت میں لہلہاتی فصل کو دیکھ کر ماموں زاد سے کہتا ہے کہ اس مرتبہ ہماری فصل بہت اعلیٰ ہوئی ہے تو اُسے ناقابل یقین رد عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

> وہ اسی الجھن کا شکار رہا اور پھر ایک روز کماد کے ایک گھنے کھیت کے کناروں پر کھڑے ہو کر نہایت پر تفاخر ہو کر اُس نے اپنے بڑے ماموں زاد سے کہا" بھائی مراد علی ۔۔۔اس بار تو ہماری گنے کی فصل بے بہا ہوئی ہے۔۔۔"تو اس نے ایک پر تحقیر بے رخی سے اُسے ٹوک دیا تھا۔۔۔"اکبر جہاں۔۔۔ تمھاری نہیں۔۔۔۔ ہماری گنے کی فصل بے بہا ہوئی ہے۔۔۔اگر کبھی اس میں سے ایک گنا توڑنا ہوا تو مالکوں سے اجازت لے لینا۔" اس کے پاس ہجرت کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا۔[۳۴]

اکبر جہان جس نے ان کھیتوں میں کام کیا، محنت کی جب اُس کی فصل پھل دینے لگی تو اسے اُس پھل سے لاتعلق قرار دے دیا گیا جس کا حتمی نتیجہ یہ ٹھہرا کہ اُسے وطن سے ہی دور ہونا پڑا۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کے گرد مارکسی فلسفۂ بیگانگی گھومتا ہے کہ جب کسی عمل کے نتیجے میں عمل کرنے والے کو اُس کے عمل کا نتیجہ نہ ملے بل کہ وہ کسی اور کی ملکیت میں چلا جائے تو ایسے میں وہ بھی کھوکھلے ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہی کچھ "خس و خاشاک زمانے" کے اکبر جہاں کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

نیلی بار:

"نیلی بار" طاہرہ اقبال کا پہلا ناول ہے جو ۲۰۱۷ء میں اشاعت کے مرحلے سے گزرا۔ اس سے پہلے "نیلی بار" سہ ماہی رسالہ "اجراء" میں چار قسطوں میں شائع ہو چکا تھا۔ نیلی بار کے مطالعے سے راوی اور ستلج کے درمیان علاقوں کی زندگی کی تصویر کے ساتھ پاکستان کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، مذہبی، تہذیبی و ثقافتی حالات

کی عکاسی بھی جرات مندانہ انداز میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اکیسویں صدی کے چند قابل مطالعہ ناولوں میں "نیلی بار" بھی شامل ہے۔ یہ پنجاب اور پاکستان کی تاریخ کا مہابیانیہ ہے جس نے ہر ہر پہلو کو اپنے اندر سمو رکھا ہے۔ ناول دس ابواب پر مشتمل ہے اور دو جاگیر دار خاندانوں کی زندگی کے توسط سے پاکستانی تاریخ سے پردہ چاک کرتا ہے۔

طاہرہ اقبال ایک نڈر اور بے باک خاتون ہونے کے ناطے جن پہلوؤں کو اس ناول کا حصہ بناتی ہیں وہ ہمیں ہماری تاریخ کے حقائق سے آشنا کراتا ہے۔ "نیلی بار" مختلف کرداروں کے توسط سے پاکستان میں موجود جاگیر داریت، سرمایہ داریت اور مذہبی جنونیت کے کریہہ پہلوؤں سے آگاہی فراہم کرتا ہے۔ تقسیم سے لے کر عہد حاضر تک جن سماجی و سیاسی تبدیلیوں اور خوشنما نعروں نے یہاں کے عوام کا سماجی، سیاسی، اقتصادی اور مذہبی استحصال کیا ہے اُس کے بیان میں طاہرہ اقبال نے جرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسی لیے مستنصر حسین تارڑ کو یہ کہنا پڑا: "نیلی بار" پنجاب کا مہابیانیہ ہے، وہ مہابھارت کے یدھ کی ہمسری کرتا، ہیومر کے "ایلیڈ" کو چیلنج کرتا ہے۔ وارث شاہ کے بیانیے کی قربت میں چلا جاتا ہے۔"[۳۵]

"نیلی بار" پاکستان کا ایک ایسا ناول ہے جس نے چھے دہائیوں کی تاریخ کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔ ناول میں پنجاب کی دیہی معاشرت، جاگیر داروں اور وڈیروں کا طرز زندگی، سادہ لوح دیہاتیوں، تقسیم کے بعد ہجرت کر کے آنے والے مہاجروں، مشرقی پاکستان میں ہونے والی تباہیوں، نائن الیون کے واقعات، جہاد کے ذریعے ہونے والے قتال اور انسانی حقوق کے استحصال کو کھل کر بیان گیا گیا ہے ڈاکٹر بی بی امینہ لکھتی ہیں:

> اس میں پنجاب کے دیہی نظام کی منظر کشی کرتے ہوئے حاکموں اور وڈیروں کے ہاتھوں انسانی معاشرے کے سب سے کمزور طبقے یعنی غریبوں کی بے بس بیٹیوں کے سفلی خواہشات کے بھینٹ چڑھنے کو موضوع بنایا ہے۔ یہ ساٹھ اور ستر کی دہائی کا المیہ ہے جس میں غریبوں کے معاشی استحصال، بنیادی سہولیات کے فقدان، خوراک کی کمی، بھوک کی انتہا اور ان سب کے سبب مظلوموں کے مرنے کے خلاف احتجاج کیا گیا ہے۔ جب کہ مذہب اور جہاد کے نام پر کمزوروں کو جنت کے پروانے پکڑانے اور ان جنتیوں کے پیچھے رہ جانے والوں کو فاقوں پر مجبور کرنے والے ظالموں اور موقعہ پرستوں کا بیان اسی سے ہوا ہے۔ دراصل اپنے ناول کے ذریعے طاہرہ اقبال نے طبقاتی، معاشی اور سماجی ناانصافی کا بڑا واضح تصور پیش کیا ہے۔[۳۶]

طاہرہ اقبال نے پنجاب کی جاگیر داریت میں عام طبقے کے استحصال، جاگیر داروں کی طرز

زندگی، غریب عوام کی بچیوں کی عزت کے ساتھ کھلواڑ، اپنی بیٹیوں کو غیرت کے نام پر چار دیواری میں قید کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنا، سیاسی چال بازیوں اور مذہب کے ذریعے سے عوام کے جذبات اور خواہشات کا استحصال کا بیان ہے۔

ا۔ محنت کش کی محنت سے بیگانگی:

جب سماجی سطح پر کسی فرد کو اُس کی محنت / عمل کا نتیجہ میسر نہیں آتا تو وہ محنت کے عمل سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ سماج میں طبقات جنم لیتے ہیں اور طرح طرح کے مسائل میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔ محنت کش ہر طرح کے عمل سے مایوس ہو جاتا ہے اور غیر پیداواری کاموں میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر دیتا ہے یا پھر معاشرے کے لیے غیر مفید کاموں میں شریک ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ سماج سے اُس کی شخصیت کٹتی چلی جاتی ہے۔ یوں وہ اپنی ذات کی دلچسپی اور صلاحیت کے مطابق عمل کرنے کے بجائے الٹ کرتا ہے اور پیٹ پوجا کی خاطر محض زندہ رہنے کے لیے ہی کسی عمل کا حصہ بنتا ہے۔

طاہرہ اقبال کا ناول سیاسی و سماجی اور معاشی عدم استحکام کی تاریخ ہے۔ جاگیر داریت اور سیاست و مذہب کے غلط استعمال کے ہاتھوں ہونے والے مظالم کی داستان ہے۔ عورتوں کو صنف نازک کہنے والے اور اُسے الگ طبقے کی حیثیت سے ٹریٹ کرنے والوں کی داستان ہے۔ جب تقسیم کے بعد ایک نئی معاشرت کا قیام عمل میں آیا تو جن بنیادوں پر تقسیم کی گئی تھی اُسی کے برعکس ہوس ولالچ اور لوٹ کھسوٹ کے بازار نے عوام کا جینا محال کر دیا۔ ابتدا سے ہی جاگیر دار اور سرمایہ دار طاقت کے مرکز ٹھہرے یوں غریب طبقہ پستی کی دلدل میں دھستا ہی چلا گیا اور اس کے خلاف احتجاج سے بھی محروم ہو گیا۔ سیاسی لوٹ کھسوٹ نے عوام کے جذبات کو کچل کر رکھ دیا۔ ان کے جذبات اور خام سیاسی شعور کا ناجائز فائدہ اٹھا کر انھیں مزید پستی میں دھکیلا جاتا ہے۔

جاگیر داریت پاکستان کے معاشی و سماجی اور سیاسی عدم استحکام کی ایک بڑی وجہ ہے جس نے ملک کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ چند افراد معاشرہ نے زرعی زمینوں کو قبضے میں رکھ کر ایک بڑے طبقے کو زرعی مک میں مسائل کے انبار سے دوچار کر دیا۔ مزارعے جاگیر داروں کی زمینوں پر کام کرتے ہیں، فصل اگاتے ہیں، مویشی پالتے ہیں اور بدلے میں روٹی حاصل کرتے ہیں۔ یہی جاگیر دار انھیں اپنے سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ کرن ریاض چودھری لکھتی ہیں:

طاہرہ اقبال اس نظام کے خاتمے کی بات کرتی ہیں کیونکہ اس نظام کی وجہ سے انسانوں کے حقوق غصب کیے جارہے ہیں۔ طاہرہ اقبال ان جاگیر داروں کے خلاف آواز اٹھاتی نظر آتی ہیں جو غریبوں کی زندگی پر چیلوں اور عقابوں کی طرح قابض ہو جاتے ہیں اور غریب طبقہ ان کے شکنجے میں پھڑ پھڑانے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی طاقت سے غریبوں کو دبائے رکھنا ہی اُن کی کامیابی ہے۔[۳۷]

جاگیر داری سماج میں سیاسی نظام کے قیام کے لیے جاگیر دار اپنی مرضی سے اپنے مزارعوں سے ووٹ کا حق استعمال کراتے ہیں۔ انھوں نے طاقت کے زور پر انھیں نہ صرف مجبور کیا ہوتا ہے بلکہ اُن کی بیٹیوں کی عزتیں اور مادی ضروریات بھی اپنے ہاتھ میں رکھی ہوتی ہیں۔ یوں یہ غریب مزارع اپنے مالکوں کے مطابق ہی زندگی گزارتے ہیں اسی پہلو کی نشاندہی طاہرہ اقبال نے بھی کی ہے۔ نسل در نسل یہ مزارعے نوکروں کی طرح کھیتوں میں فصلیں اُگاتے ہیں لیکن انھیں نصیب کچھ نہیں ہوتا۔ جب اُن میں سے کسی کو تھوڑا بہت احساس ہوتا ہے تو وہ اس محنت کے عمل سے خود کو الگ کر لیتا ہے۔ یہ کسان، مزارعے تنگ آکر شہروں کی طرف رخ کرتے ہیں جہاں انھیں دربدر ہونا پڑتا ہے۔ عبدالرحمن ملک فتح شیر کا بیٹا جب الیکشن جیت جاتا ہے تو اپنی ماں سے اسی خدشے اور اپنی کامیابی کا ذکر کرتا ہے کہ اگر وہ طاقت سے انھیں دبا کر نہ رکھیں تو وہ شہروں کی طرف نکل جاتے ہیں۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسان جو جاگیر داروں کی زمینوں پر پورا سال کام کرتے ہیں جب انھیں بدلے میں کچھ نہیں ملتا تو وہ اس محنت سے بھاگ جاتے ہیں:

سوچیں ذرا کتنی بڑی نیکی کی ہے آپ کے بردے غلام بچا کر اس سسٹم کو بچا کر ورنہ پناہیوں کو چھوڑ کر یہ چوبڑے مسلی بھی ملوں میں مزدور بننے کو گاوں چھوڑ رہے تھے۔ آپ کی زمینیں کون کاشت کرتا بنجر ہو جاتیں، راتوں کو پانی کون باندھتا، بھکڑے اگتے، دمبی سٹی بھر جاتی، ہل ویڑیں بن جاتے۔۔۔[۳۸]

صنعتی انقلاب نے دنیا کو تین سو برسوں میں یکسر تبدیل کر دیا اور بے شمار انقلابات سے انسانی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ مشینوں نے انسانوں کی بہت ساری مشکلات کو حل کر دیا اور محنت میں کمی کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو کام ہاتھ سے گھنٹوں میں کیا جاتا تھا اب منٹوں میں ہونے لگا لیکن اس کے باوجود جاگیر داریت نے کسان کی زندگی میں کوئی تبدیلی برپا نہیں کی۔ اگرچہ کچھ اصلاحات کے ذریعے تبدیلی ممکن ہوئی لیکن خاطر خواہ اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ مارشل لاء کے زمانے میں جنرل ایوب نے زرعی اصلاحات کی طرف پیش قدمی کی

لیکن خاطر خواہ تبدیلی ممکن نہ ہو سکی۔ جب بھٹو نے دوبارہ سے نعرہ بلند کیا تو وہ جن کو ایوب کے دور میں ڈسا گیا تھا انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

مہاجروں میں سے ایک کردار فوجی نصیر کا تھا جو مزارعوں کو ایوب کے دور میں اکساتا رہا کہ تم ان زمینوں کے مالک بن جاو گے جب ایوب کا دور چمکے گا لیکن جب ایسا نہ ہوا تو وہ سب مایوس ہو گئے۔ اُن کی امیدوں پر چودھری ذیلدار نے پولیس کے ذریعے پانی پھیر دیا۔ جب دوبارہ فوجی نے بھٹو کی تعریفیں کیں تو وہ اس عمل کا حصہ بننے سے انکاری ہو گئے کہ پہلی مرتبہ جب ایوب کے نام پر ہم نے کوشش کی تو پولیس سے چھتر پڑے یوں اب دوبارہ سے اس عمل کا حصہ نہیں بن سکتے:

> شیرے نے آنکھیں بند کر کے شہادت کی انگلی آسمان کی سمت اٹھالی۔ صدر ایوب تخت پر بیٹھا تو بھی تو نے ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ ذیلدار کی زمینوں کے قرعے ڈال رہے تھے ہم، کیسے چھتر پڑے تھے۔ ہر نمبر کا چھتر۔۔۔[۳۹]

مارکس کے تصور بیگانگی کی عکاسی مذکورہ اقتباس میں واضح نظر آتی ہے کہ جب کسی طرح عمل میں عمل کرنے والے کے لیے کوئی نتیجہ پیدا نہیں ہوتا تو وہ اس عمل میں شرکت سے اجتناب برتتا ہے۔ یہی حال ان غریب، مفلس اور نادار مزارعوں کا بھی تھا جو کسی ایسے عمل میں خود کو شریک نہیں کرنا چاہتے تھے جس کا نتیجہ اُن کے حق میں نہ نکلے۔ ایسی جدوجہد ان کے لیے بے معنی ٹھہرتی ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو نے عوام کے لیے روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ بلند کر کے سوشلزم کے بنیادی اصول کا پرچار کیا۔ ملک بھر سے کئی نوجوان اور ترقی پسند خیالات کے حامل لوگوں نے اس نعرے پر لبیک کہا۔ نوجوان سیاسی شعور لیے اس نئی صبح کے آغاز کے لیے جدوجہد کرنے لگے۔ ایوب خان کے مارشل لا کے خلاف سخت احتجاج ہوا۔ قتل و غارت گری ہوئی۔ کئی نوجوانوں نے احتجاجوں اور ریلیوں میں اپنی جانیں گنوائیں۔ ملک بھر میں اس نئی حکومت کے قیام کے لیے نوجوانوں نے سیاسی جدوجہد میں حصہ لیا لیکن اس نظام میں خاطر خواہ کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ سیاسی طور پر عوام کو بیوقوف بنا کر ذاتی مفادات حاصل کیے جاتے رہے۔ جس کی وجہ سے اس سیاسی عمل کا حصہ بننے سے معاشرے کے باصلاحیت و باشعور افراد نے کنارہ کشی اختیار کی۔

علی جواد اس ناول کا ایک اہم کردار جو پہلے سیاسی جدوجہد کرتا ہے لیکن ناکام ہو جاتا ہے جب اُن غریبوں کو جن کے خون سے اقتدار حاصل کیا پس پشت ڈال دیا گیا اور وہی جاگیر دار و سرمایہ دار حکومت میں بیٹھنے لگے تو ایسے کئی نوجوانوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ ساجدہ سلطانہ "نیلی بار" کے اس سیاسی پہلو کے حوالے سے

لکھتی ہیں:

> نیلی بار کے ذریعے طاہرہ اقبال نے ہر دور کے نام نہاد انقلابیوں کو بے نقاب کیا ہے اور عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتی ہیں کہ ان نئے دیدہ زیب لباسوں میں موجود شکلیں تو نئی ہو سکتی ہیں لیکن سوچ وہی بوسیدہ اور پرانی ہے۔ یہ اپنے اقتدار کے لیے لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ ضرورت پوری ہونے پر کسی بھاری بوجھ کی طرح اتار پھینکنے میں دیر نہیں لگاتے۔ (۴۰)

ان نوجوانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ علی جواد اور اس کی جماعت کے ہم خیال جب سڑکوں پر رل رہے تھے جن لوگوں کے خلاف بغاوت پر آمدہ ہوئے انھیں اپنے ہی لیڈران کے ساتھ بیٹھا دیکھا تو انھیں سخت مایوسی ہوئی۔ شکیل نامی کردار نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اس پس منظر کی عکاسی کرتے ہیں کہ ہم جن کے لیے یہاں لڑتے مرتے ہیں وہ ہمارے ظالم آقاوں کے ساتھ بیٹھے ہیں تو ایسے میں ہمیں اس عمل میں شریک بننے سے گریز کرنی چاہیے:

> میں نے دیکھا کہ دونوں مخالف گروپوں والے ایک کمرے میں بیٹھے روسٹ پرندوں کے ساتھ بیئر اڑا رہے تھے اور نیچے سڑک پر عوام گولیاں کھا رہے تھے اور وہ نیچے جھانک جھانک کر قہقے لگا رہے تھے۔ وہ دونوں فریق مل کر ہمارا تماشا دیکھ رہے تھے۔ مرغوں اور مینڈھول کو لڑا رہے تھے۔ (۴۱)

یعنی جس سیاسی عمل اور نتیجے کی خاطر عوام نے جانیں قربان کیں اسی کے نتیجے سے انھیں بے فیض کیا جانے لگا اور نتیجہ یہ نکلا کہ بھٹو کے ساتھ بھی پہلے سے قابض لوگ ہی دوبارہ اقتدار میں براجمان ہوئے۔ ایسے میں علی جواد جسے ناول میں ایک ایسے کردار کے طور پر دکھایا گیا ہے جو غریب و مفلس لوگوں کو استعمال کرتے ہیں اور اپنے مقاصد حاصل کرتے ہیں وہ علی جواد علامہ محمد علی معاویہ کا روپ دھار کر مذہبی ہتھکنڈوں کے استعمال سے غریب و لاچار اور جاہل عوام کا استحصال کرتا ہے۔ علی جواد کا محمد علی معاویہ بننا مارکسی نظریہ بیگانگی کی بہترین مثال ہے جو نتائج سے مایوس ہو کر غلط راہ اختیار کر لیتا ہے اور سیاسی جدوجہد سے کنارہ کشی کر لیتا ہے۔ آخر وہ جنت کے ٹکٹ فروخت کر کے غریب و مفلس نوجوانوں کو افغان جنگ میں دھکیلنے کا کام کرتا ہے۔

علی جواد جو سیاسی شعور اور غریبوں کے مسائل کو سمجھ کر انھیں جدوجہد کے لیے ابھارتا تھا ایک نئے روپ میں انھیں جنگ میں جھونک دیتا ہے۔ یہ سماجی بیگانگی کی بھی ایک عمدہ مثال ہے کہ مذکورہ پہلو سے بیگانگی

انسان کو سماج اور اس میں موجود انسانوں سے بیگانہ کر کے انھیں سرمائے کی دوڑ میں لگا دیتی ہے اور اس عمل میں وہ اپنے جیسی مخلوق کو کچلنے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں یہی پہلو علی جواد کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے۔

۲۔ محنت کش کی محنت کی پیداوار سے بیگانگی:

مارکسی فکر کے مطابق محنت کش کو محنت کی پیداوار کا حق نہ ملے تو وہ پیداوار اس کے لیے اجنبی بن جاتی ہے۔ ایسے ہی عناصر طاہرہ اقبال کے ناول میں بھی ہیں۔ "نیلی بار" جاگیر داریت، سرمایہ داریت اور مذہبی شدت پسندی کے تحت ہونے والے استحصال کی کہانی ہے۔ طاہرہ اقبال خود جاگیر داریت کے ماحول میں رہی ہیں اس لیے جاگیر داریت کے اس ناسور نے جس طرح سے عام عوام کا استحصال اور منفی تقسیم کو عروج بخشا ہے باخوبی ناول میں سمونے میں کامیاب ہوئی ہیں۔ نچلے طبقات کے جذبات کا استحصال بھی ناول کے اہم موضوعات میں سے ہے۔ ناول کی ابتدا ہی جاگیر داری سماج کے کھیل اور پنجاب کے سماجی رشتوں واقدار سے ہوتی ہے۔ جب تقسیم ہوئی تو ادھر اور اُس پار کے لوگوں نے اہم جگہوں پر زمینیں الاٹ کروالیں اور جو مقامی محنت والے تھے انھیں مزرت میں جھونک دیا۔ بالخصوص آزادی سے قبل جن علاقوں میں لوگوں نے زمینیں ہموار کر کے اپنے روزگار کا بندوبست کیا تو ہلچل کے دوران میں انھی کی زمینوں کو باہر سے آنے والوں نے قبضے میں کر لیا اور وہ اپنی ہی زمینوں پر مزارعوں کی طرح کام کرنے لگے اور حاصل ہونے والی آمدنی بھی انھیں حاصل نہ ہوئی:

> ادھر پنڈی چکول، سیالکوٹ سے آباد کار اٹھ کر آئے۔ جو پہاڑوں جیسے قد آور اور چٹانوں سے مضبوط بدن والے تھے۔ ان فراقیوں، شلواروں اور اچکنوں والوں نے جنات کی طرح ٹبے ٹیلے ڈھا کر ہموار کھیت بنا دیئے، جن ٹیلوں پر ان جنگلیوں کی جھگیاں بہنیاں آباد تھیں۔ انھی کے گلوں میں غلامی کا سنگل ڈال کر انھی کی دھرتی پر انھی کی زمینوں پر انھیں مزرت میں جوت دیا گیا۔ (۴۲)

جن لوگوں کی زمینوں پر باہر سے آنے والوں نے قبضہ کیا یا انھیں الاٹ کی گئیں انھوں نے پہلے سے آباد مفلس اور غریب الحال لوگوں کو اپنا غلام اور ماتحت بنالیا۔ اس طرح انھیں اپنی ہی زمینوں پر اجنبیوں کی طرح کام کر کے اپنا پیٹ پالنا پڑتا۔ یہ مقامی غریب، نادار افرادیوں ہی اپنا استحصال کراتے اور اپنی ہی زمینوں کے لیے اجنبی ہو گئے۔ یوں اس دھرتی پر آقائیت اور رعیت کے عجب جاگیر داری نظام کی بنیادیں پڑیں۔ باہر سے آئے اعلیٰ نسلوں اور ذات پات کے حامل کہلائے اور یہاں کے مقامی نائی، موچی، چوہڑے اور مسلی۔ یہی

مقامی ان جاگیر داروں کی زندگیوں کو سہل اور آسان بنانے کے لیے دن رات تگ و دو کرتے زندگی کی حقیقتوں سے بیگانے ہو گئے۔

ناول میں بیان دو خاندانوں کی زندگی مجموعی پنجابی معاشرت میں جاگیر داری نظام کی عکاس ہے۔ ملک فتح شیر عام عوام کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بڑا چیمپئن ہے۔ جو نہ صرف لوگوں کے مال کو اپنے پیٹ کی ہوس کے لیے ہتھیاتا ہے بل کہ غریب و نادار لوگوں کی بچیوں، بیٹیوں کی عزت کو بھی اپنی جنسی خواہشات کے لیے تار تار کرتا ہے اور کوئی بھی اُس کے اس عمل کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتا۔ اس کام کے لیے اُس نے غنڈے پال رکھے ہیں۔ جھوک لنگڑیالاں سے گزرنے والی ایک بارات سے چار لڑکیوں کو اغوا کر لیتا ہے اور ساتھ ہی اُن کے سامان کو بھی گھوڑوں سے اتروالیتا ہے جب کہ باراتی سارے بے بس و مجبور اپنی عزت اور مال لوٹتے ہوئے جان کی مان کے لیے بھیک مانگتے ہیں۔ برسوں کی جس محنت سے آج وہ اس خوشی کو منا رہے تھے وہ سب اُن سے چھین لیا جاتا ہے اور وہ بے بس ہوتے ہیں۔

جاگیر داری سماج میں عوام کی بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنی ہی محنت کی پیداوار کو اپنا نہیں کہہ سکتے۔ اُن کے شعور کو بھی سلب کر لیا جاتا ہے جس سے انھیں لگتا ہے کہ جو کچھ وہ کھاتے ہیں وہ انھی جاگیر داروں کی مہربانی ہے۔ فوجی نصیر جب انھیں بتاتا ہے کہ ایوب اب تمھاری زمینیں تمھیں واپس دلائے گا تو وہ حیران منہ تکنے لگتے ہیں:

> اوپا گلو اس کا مطلب یہ ہے کہ مزارع جس کھیت کو کاشت کر رہا ہے وہ اسی کھیت کا مالک بنا دیا جائے گا۔۔۔ "کسانوں کے حلق سے کڑوے تمبا کو کا ذائقہ سینے میں اتر گیا۔ منشی مستان نے مدبرانہ انداز میں گہرے گہرے کش لیے۔
> "فوجی تیرا مطلب یہ ہے کہ میں ۳۲ نمبر مربع کاشت کرتا ہوں تو وہ کل سے میرا ہو گا۔[۴۳]

فوجی نصیر اور ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اس حقیقت سے یکسر بیگانے ہیں کہ جو محنت وہ کرتے ہیں وہ انھی کی ہے بل کہ انھیں اس پر حیرانی ہوتی ہے تو فوجی نصیر مزید کہتا ہے:

> تو ہی نہیں منشی! اس گاوں کے سارے مزارعے، کل چڑھتے سورج کے ساتھ مالک ہو جائیں گے مربعوں کے، زمینوں کے ابھی ابھی یہی تو خبریں آ رہی تھیں اور یہ دوسروں کی محنت کو کھانے والے، ہم پر حکم چلانے والے تمھیں چوہڑے مسلی،

باندے غلام اور ہمیں مہاجر پناہی کہنے والے کل سے اپنے حقے خود دھریں گے۔۔۔
کھائیں یہ اور گندگی تم اٹھاو، خون پسینہ تم گراو اور فصل یہ اٹھائیں، جوتے تم صاف کرو
اور پیروں میں پہنیں یہ اور انھی جوتوں کے ٹھڈے تمہارے منہ پر ماریں۔ (۴۴)

یعنی ان غریب ، مفلس الحال، بدذات، رذلیل اور کمین لوگوں کی محنت کی پیداوار یہ جاگیر دار کھاجاتے ہیں۔ وہ جو محنت کرتے، خون پسینہ بہاتے ہیں، اپنی نسلوں کو ان کھیتوں میں کام پر جھونکتے رہتے ہیں اُنھی کو اس کا نتیجہ میسر نہیں آتا اور وہ ان سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ انھیں حاصل ہونے والی پیداوار سے کوئی لگاو کوئی تعلق اور دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ محض اتنا حاصل کرتے ہیں یا انھیں ملتا ہے جس سے اُن کی زندگی کی گاڑی کے پہیے حرکت میں رہیں اور دوسروں کے لیے سہولیات فراہم کرتے رہیں۔

جاگیر دار ہوں یا سرمایہ دار وہ اپنے ناجائز منافعے کے لیے عام عوام کو طاقت کے زور سے دبا کر رکھتے ہیں انھیں اُن کی ضرورت سے کم دیتے ہیں اور اُن سے زیادہ کا کام لیتے ہیں جس سے ہوتا یہ ہے کہ وہ طبقہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ اُسے حاصل ہونے والی روزی روٹی ان مالکان کی دی ہوئی لگتی ہے اور وہ اپنی ذلت اور پستی کا ذمہ دار اپنی تقدیر اور قسمت کو ٹھہراتے ہیں۔ اگر انھیں یہ احساس ہو جائے کہ اُن کی محنت کا نتیجہ کوئی اور لے جاتا ہے تو وہ اس کے خلاف بغاوت بھی کر سکتے ہیں لیکن چوں کہ وہ مجبور ہوتے ہیں اس لیے اُن کی اس مجبوری کا فائدہ بھی وہی جاگیر دار و سرمایہ دار لے جاتے ہیں۔ ملک فتح شیر چودھری ذیلدار سے یہی باتیں کرتا ہے کہ ان غریبوں کو دبا کر رکھنا چاہیے اور ان سے طاقت سے زیادہ کام لینا چاہیے تاکہ یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی قاصر رہیں یہی اُن جیسے لوگوں کے مفاد میں ہے۔

نہ صرف غریب مزدور و کسان طبقہ بل کہ متوسط طبقہ بھی دن رات خوب سے خوب تر کے لیے محنت کرتا ہے۔ وہ جن زمین داروں یا سرمایہ داروں کے لیے جی توڑ محنت کرتے ہیں اُس سے وہ محض چند ضروریات ہی پوری کر پاتے ہیں۔ جو کچھ وہ حاصل کرتے ہیں یا کماتے ہیں اُسے مالکوں کی عنائیت سمجھ کر رکھ لیتے ہیں اور باقی اُن سے کسی نہ کسی بہانے ہتھیا لیا جاتا ہے۔

ذیلدار کی بیٹی پاکیزہ جو اس ناول کا اہم کردار ہے اور جاگیر داری معاشرے میں جاگیر داروں کی زندگیوں سے پردہ ہٹانے کا کام سرانجام دیتی ہے کہ یہ جاگیر دار کس طرح اپنی بیٹیوں کو قید میں رکھتے ہیں اور دنیا کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے اور دوسروں کی بیٹیوں کی عزتیں تار تار کرتے ہوئے اپنی جنسی خواہش پوری کرتے ہیں کرن چودھری لکھتی ہیں:

طاہرہ اقبال جاگیرداروں کے ظالمانہ رویے سے پردہ اٹھاتی ہیں جو معصوم بیٹیوں اور بہنوں کی سانس تک چھین لیتے ہیں۔ اپنی انا، وقار اور جھوٹی عزت کی خاطر انھیں سولی پر لٹکانے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھتے۔(۴۵)

صفورہ، بختاور اور پاکیزہ اس سلسلے میں ان جاگیرداروں کے گھریلو ماحول سے پردہ اٹھاتی ہیں تو دوسری طرف یہ بھی اظہار کرتی ہیں کہ کس طرح سے کسان و مزارعے اُن کے سامنے ڈرتے، سہمتے ہوئے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ پاکیزہ جب چھوٹی ہوتی ہے تو وہ بابا دینو کی دکان سے چیزیں لینے جاتی ہے تو بابا دینو اس سے پیسے نہیں لیتا حالاں کہ وہ اس کی اپنی محنت کی پیداوار ہوتے ہیں:

بابا دینو نے ہر کنستر سے مٹھی بھر بھر نوکرانیوں کے پلو میں ڈالی جتنے پیسوں کے مانگے گئے تھے اس سے کہیں زیادہ ملکانی بی کے لیے پیش کر دیئے۔ پاکیزہ نے سکے بڑھائے۔
"نہ چھوٹی ملکانی جی! رکھیں آپ سے پیسے لینا کیا ہمیں سوبھتا ہے۔ آپ کا دیا ہی تو کھاتے ہیں۔(۴۶)

بابا دینو کا پاکیزہ سے پیسے نہ لینا ایک تو محنت کی پیداوار سے بیگانگی اور دوسرا اسے مالکوں کا دیا ہوا تصور کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ جدید سرمایہ داری و نیم جاگیرداری سماج نے انسان کو ہر لحاظ سے بے بس و مجبور بنا کر اُس سے زندگی جینے کا حق بھی چھین لیا ہے اور وہ خود ہی اپنی پیداوار کو اپنا سمجھنے سے قاصر ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اس نیم جاگیرداری و سرمایہ داری نظام کے حربوں اور حقیقتوں کو نیلی بار کے صفحات پر کھول کر رکھا ہے کہ کس طرح سے اس نظام نے استحصال کی چکی میں پیس پیس کر محنت کش عوام کی زندگی اجیرن بنادی ہے۔

طاہرہ اقبال نے جاگیرداری سماج کی بھیانک تصاویر کے ساتھ ساتھ اس نظام کی پروردہ سیاسی پالیسوں اور سیاست کے ذریعے استحصال کو بھی علی جواد کے کردار کے ذریعے بیان کیا ہے۔ علی جواد بنیادی طور پر ایک اشتراکی سوچ کا حامل کردار تھا جسے استعمال کر کے پھینک دیا گیا اور پھر اُس نے دوسرا روپ دھار کر انھی لوگوں کی طرح غریبوں کے جذبات کا استحصال کرنا شروع کر دیا۔ وہ جن لوگوں کے لیے جدوجہد کرتا مسلسل نوجوانوں کی ذہنی آبیاری کرتا تھا آخر میں جب اُسے انھوں نے روند دیا تو انھیں ہی گالیاں بکنے لگا۔ وہ اپنے اس عمل سے خود کو اجنبی تصور کرنے لگا تھا:

وہ دونوں کچہری کی غلیظ کیڑوں والی کینٹین پر بیٹھے انتہائی میٹھی اور بدمزہ چائے ٹوٹے

کناروں والی پیالوں میں چکھ رہے تھے۔ علی جواد اس گزرے عرصے میں سیاسی تبدیلیوں سے اُسے آگاہ کر رہا تھا۔ انھی ہیروز کو گالیاں دے رہا تھا۔ جنھیں کندھوں پر سوار کروا کر وہ بھنگڑے ناچتے رہے تھے۔[۴۷]

بھٹو کے اس دور میں جس طرح سے ان یونیورسٹیوں کے نوجوانوں نے اپنے ملک کے نظام کی تبدیلی کے لیے محنت کی اور محنت جب ضائع ہوئی تو انھیں سخت مایوسی ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملکی حالات کی تبدیلی کے لیے نوجوانوں نے اپنا کردار ادا کرنا چھوڑ دیا۔ ظاہر ہے جب کسی عمل کا نتیجہ عمل کرنے والے کے حق میں نہیں آتا تو وہ اُس عمل اور نتیجے سے اپنی ذات کا ناتا توڑ لیتا ہے۔ یہی علی جواد جیسے کئی کرداروں کے ساتھ اس سیاسی نظام میں ہوتا آرہا ہے جس کی وجہ سے آج اس ملک کا پڑھا لکھا نوجوان سیاسی بیگانگی کا شکار نظام کے لیے جدوجہد کرنے سے قاصر ہے اور سرمایہ داری نظام کے کارپوریٹ کلچر میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کر رہا ہے۔

زارا فتح شیر علی جواد سے طلاق لینے کے بعد جب دوبارہ لاہور میں پالٹیکس کی پروفیسر بن کر آتی ہے تو تب بھی وہ علی جواد کی اس اشتراکی سوچ سے باہر نہیں آپاتی۔ اگرچہ وہ علی جواد کے دوسرے روپ سے آشنا ہو چکی ہوتی ہے اس کے باوجود وہ اس ملک میں چند افراد کے ہاتھوں ہونے والے استحصال کو جب بیان کرتی ہے تو اُس کے اندر وہی علی جواد کی اشتراکی سوچ کار فرما ہوتی ہے۔ وہ اس ملک کے محنت کش عوام کی بیگانگی کے حوالے سے یوں خیالات کا اظہار کرتی ہے حالاں کہ وہ خود ایک جاگیر دار خاندان سے تعلق رکھتی ہے:

اس ملک کی یہی سائیکی ہے کہ لاکھوں کروڑوں کمائیں اور گنتی کے چند افراد اسے کھائیں۔ اس کے سارے وسائل، سارے اختیارات، سارے اناج، انھی گنتی کے خواص کی نسل در نسل میراث ہے۔ اس کی ساری بھوکیں سارے امراض سارے دکھ ساری مشقتیں ان گنت کروڑوں افراد کا ازلی و ابدی مقدر ہیں۔[۴۸]

اس ملک کے عوام کی بیگانگی اس قدر بھیانک ہے کہ انھیں اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ کروڑوں محنت کرنے والے افراد کا معیار زندگی اتنا ناقص اور چند طاقت ور ذرائع پیداوار کے نام نہاد مالک زندگی کی ہر سہولت سے آراستہ کیسے ہیں؟ وہ جس پیداوار پر ناچتے ہیں وہ کس کی ہے؟ اس سے لاتعلق ہیں۔ انھیں بیگانگی کی اس زندگی میں جینے کی عادت ہو گئی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ وہ اسے تقدیر و قسمت پر ڈال کر سماج سے ہی بیگانے ہو جاتے ہیں۔

جاگیر داری سماج جہاں صدیوں سے رائج ہے لیکن وہیں سماج میں بغاوت اور بیگانگی کے پہلو کم

نظر آتے ہیں۔ اگرچہ اس جاگیر داری سماج میں پہلے سے ہی استحصال کی بدترین شکلیں موجود تھیں لیکن سرمایہ داریت کے آغاز نے اسے مزید بدتر بنادیا ہے۔ جب سے سرمایہ داریت کے اصول جاگیر داری سماج میں قابل عمل ہوئے ہیں سماج میں استحصال اور بیگانگی کی شرح میں اضافہ ہونے لگا ہے۔

چوں کہ سرمایہ داریت نے مالکوں کو طبقے کی شکل میں الگ مخلوق بنادیا ہے اس لیے اس نیم جاگیر داری سماج میں مزارعوں اور کسانوں کا استحصال پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ اب سب منافع اور غیر پیداواری کاموں پر خرچ ہوتا ہے جب کہ سرمایہ داریت سے قبل کسی نہ کسی طرح کسان یا مزارعے کو کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ اب انھیں روزی روٹی بھی میسر نہیں آتی اور وہ جاگیر داروں کے پالتو جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزارتے ہیں۔

جو خود کھیتوں میں کام کرتے ہیں وہ سوکھی سڑی اور باسی روٹی کھاتے ہیں اور ان کے مالکوں کے جانور اُن سے کئی گنا بہتر غذا سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

> نوکرانی کی مٹھی میں دبی ہوئی اس روکھی باسی روٹی میں جیسے پاکیزہ کا دل دبا ہو۔ جو دھاڑیں مار مار روتا ہو اور موکھی سوکھی باسی روٹی ان آنسوؤں کے نمک سے لگا لگا کر کھاتا ہو، اس معاشرت میں ان ادھورے، نامکمل، اپاہج، بوڑھے، فاتر العقل افراد کے لیے فطرت کی کوکھ کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ اصطبل میں مربع پال گھوڑی سرپٹ دوڑتی اور آہنی سم اٹھا اٹھا کر بغلی دیوار میں مارتی تھی۔ شاید چنوں کا دلیا اُسے پسند نہ آیا تھا۔[۴۹]

مذکورہ اقتباس میں نوکرانی کی بھوک سے للچاتی ہوئی تصویر اور پس منظر واضح ہوتا ہے جو پرانی باسی روٹی کھاتی ہے اور دوسری طرف جن مالکوں کے لیے وہ دن رات کھیتوں میں کام کرتے ہیں اُن کے گھوڑے بھی چنوں کے دلیے کو پسند نہیں کرتے۔ یہ بیگانگی پیداوار کی انتہا ہے کہ زمین دار اپنے مزارعوں کو کتنی ذلت بھری زندگی جینے پر مجبور کرتے ہیں اور خود اُن کی پیداوار سے نہ صرف عیاشی کی زندگی بسر کرتے ہیں بل کہ اُن کے جانور بھی ان مزارعوں اور کسانوں سے بہتر حیات گزارتے ہیں۔

جاگیر داری سماج میں قدامت پرستی، مذہبی لگاو اور تقدیر و قسمت کے تصور نے بھی اس سماج کی رگوں میں خود کو پیوست کر رکھا ہے اس لیے یہی جاگیر دار اپنے ان مزارعوں کے مذہبی جذبات کا استعمال بھی خوب کرتے ہیں اور کسی نہ کسی بہانے اُن سے رقم ہتھیا لیتے ہیں۔ شام قوالی، نعت خوانی و دیگر مذہبی رسومات میں عام عوام اپنی جمع پونجی لوٹا کر راحت محسوس کرتے ہیں۔ اُن کی یہ قدامت و توہم پرستی انھیں مزید

استحصال کی طرف لے کر جاتی ہے۔ اُن کی نذ و نیاز کی رقوم بھی انھی جاگیر داروں و مذہب فروشوں کی جیب میں جاتی ہے اور وہ اس سے بے نیاز یہ رقم / پیداوار لوٹاتے ہیں اور دعائیں لے کر سکون محسوس کرتے ہیں۔ حالاں کہ پیداوار کو یوں لوٹا کر کسی بھی طرح سے مذہبی رسوم کی ادائیگی سے انھیں کوئی خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوتا۔ ان کی مذہبی بیگانگی اور جہالت کا بھی استحصال ہوتا ہے اور وہ استحصال کراتے ہیں۔ ساجدہ سلطانہ لکھتی ہیں:

> نیلی بار میں طاہرہ اقبال نیلی بار کے باشندوں کی مذہبی حوالے سے لاعلمی، جہالت اور ضعیف الاعتقادی کا ذکر کرتی ہیں۔ نیلی بار کے قدیم باشندے مذہب سے قطعی ناواقف ہیں۔۔۔ ان کا دینی علم محض درگاہوں اور مزاروں پر ماتھا ٹیکنے تک ہی محدود ہے انھوں نے کبھی براہ راست نیلی چھتری والے سے طلب نہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ دعا کی قبولیت کے لیے وسیلے کا ہونا ضروری ہے۔۔۔ طاہرہ اقبال درگاہوں اور مزاروں کا حال بیان کرتی ہیں کہ جہاں ہر یہ ضعیف الاعتقاد لوگ چڑھاوے لیکر پہنچتے ہیں۔ پیروں کی خدمت میں نذرانے کے طور پر صرف نوٹ ہی پیش نہیں کیے جاتے بلکہ بیٹیاں بھی نذر ہو جاتی ہیں۔ (۵۰)

طاہرہ اقبال نے زارا کے کردار کے ذریعے پیر اسرار احمد شاہ لعلاں والی سرکار اور علامہ محمد علی معاویہ جو مذہبی رہنما تسلیم کیے جاتے ہیں کا پردہ چاک کیا ہے اور اُن رہنماوں کے یہاں عام عوام کے جذبات کے استحصال، بچوں اور بیٹیوں کی نذر و نیاز اور جمع پونجی کو لوٹاتے اور لوٹتے ہوئے دکھایا ہے۔ زارا کے یہاں جب اُس کے بچے کی پیدائش ہوتی ہے تو غریب جھولیاں بھر بھر کر اپنی جمع پونجی لوٹاتے ہیں کہ شائد اُن کی بخشش کا کوئی وسیلہ بن جائے:

> درگاہ کا ہر چپہ دیسی گھی کے چراغوں سے جگمگا اٹھا تھا۔ اتنے دیے جلائے گئے تھے اتنے نذرانے اور ڈالیاں ڈھوئی گئی تھیں کہ مریدین خود قرض دار ہو گئے تھے اب یہ قرضہ شاید ان کی آئندہ نسلیں بھی نہ اتار سکیں گی۔ نومولود کی خاص خادماوں کا اعزاز حاصل کرنے کو خوشحال گھرانوں کی لڑکیاں تحفہ پیش کی گئی تھیں۔ کتنے نسلی گھوڑے دودھ دیتی بھینسیں اور سجی ہوئی اونٹنیاں "ڈھوے" میں لائی گئی تھیں۔ (۵۱)

زارا اور علی جواد / علامہ محمد علی معاویہ کے درمیان ایک انجانہ سا تعلق تھا۔ زارا سخت نفرت کے باوجود جنسی تعلق کو قائم کرنے کے لیے اسی سے جا ملتی تھی اور اس طرح اُسے خوب ٹارچر بھی کرتی تھی۔ اُسے مذہبی

لبادے میں یوں استحصال کرنے کو بے عزت کرتی اور طعنے دیتی۔ علی جواد سے جس خوب صورت پیرائے میں وہ خیالات کا اظہار کرتی ہے اور اپنی کوکھ کی مثال سے حقائق سے جو پردہ ہٹاتی ہے، اسے محنت کی پیداوار سے بیگانگی کی بہترین مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ طاہرہ اقبال نے اس پہلو پر خاصہ فرسائی کر کے مارکسی سوچ کی واضح عکاسی کی ہے کہ کیسے جاگیرداریت و سرمایہ داریت میں محنت کش کی پیداوار اس کی زندگی سے خارج اجنبی وجود کا روپ دھار لیتی ہے:

> تو اس میں کہیں نہیں ہے۔ علی جواد مذہبی، بہروپیا، دین کا پردہ فروش یہ صرف میرا ہے کسی عالیشان عمارت کی تکمیل کے لیے کوئی بھی راج گیر ہو سکتا ہے لیکن عمارت پر صرف مالک کے نام کی تختی لگائی جاتی ہے۔ راج گیروں اور مستریوں، ترکھانوں کے نام کبھی نہیں لکھے جاتے۔ وہ صرف اپنی مزدوری وصول کرتے ہیں اور لاتعلق ہو جاتے ہیں۔[۵۲]

مذکورہ بالا اقتباس مزدور / محنت کش کا پیداوار سے بیگانگی کے تناظر میں بہترین مثال ہے کہ کیسے جس چیز کو وہ بناتا ہے اور اُس کی ذات سے الگ کسی دوسرے کی ملکیت کا روپ دھار لیتی ہے اور وہ ایک قلیل سی آمدنی لے کر اس چیز سے لاتعلقی اختیار کر لیتا ہے۔ طاہرہ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے مارکسی سوچ کو بنیاد سے خارج نہیں ہونے دیا اور اسی کے تناظر میں اس سارے کھیل کو جو ستر سال سے یہاں کے عوام کے ساتھ کھیلا جارہا ہے الفاظ کی صورت میں صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا۔ بلاشبہ طاہرہ اقبال دور حاضر کی ترقی پسند ذہنیت کی حامل ناول نگار ہیں جنھوں نے اس ایک ناول سے ناول کی دنیا میں کامیاب قدم رکھا اور اسے بڑے بڑے ناموں کی طرف سے سراہا گیا۔

حوالہ جات

۱۔ارشاد احمد کوچھے،فائر ایریا مظلوم طبقے کی انوکھی داستان،www.urdulink.com،اکتوبر ۲۰۱۹ء10:57am

۲۔گدی،الیاس احمد،فائر ایریا،معیار پبلی کیشنز، نئی دہلی،۱۹۹۴ء،ص۳۵

۳۔ایضاً،ص۳۶

۴۔ایضاً،ص۹۷

۵۔ایضاً،ص۹۷

۶۔ایضاً،ص۳۳۰

۷۔ایضاً،ص۳۲

۸۔ایضاً،ص۳۶

۹۔ایضاً،ص۷۰

۱۰۔ایضاً،ص۷۸

۱۱۔قیصر آفتاب احمد، مزدور طبقہ اور پاکستانی اردو ناول،(مضمون) مطبوعہ :امتزاج،شمارہ۱۲ ،،۲۰۱۹ء،جامعہ اردو، کراچی،ص۹۸

۱۲۔سبط حسن موسیٰ سے مارکس تک، مکتبہ دانیال کراچی،۱۸۲۰ء، ص۲۷۴-۲۷۵

۱۳۔شیراز زیدی جہنمی لوگ، فکشن ہاؤس، لاہور،۲۰۰۲ء ص۱۴

۱۴۔ابو فراز،(مترجم)مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس از ایلن ووڈز/ٹیڈ گرانٹ، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۸ءص۶۰۶

۱۵۔شیراز زیدی، جہنمی لوگ، ص۱۶

۱۶۔مشتاق احمد امتیاز، پاکستانی اردو ناول میں پسماندہ طبقے کے مسائل،ایم۔فل اردو(غیر مطبوعہ) مملوکہ، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد،۲۰۱۹ءص۲۰۰-۲۰۱

۱۷۔شیراز زیدی، جہنمی لوگ،ص۴۴

۱۸۔ایضاً،ص۱۳

۱۹۔ایضاً،ص۲۸

۲۰۔ایضاً،ص۴۶

۲۱۔ایضاً،ص۱۱۱

۲۲۔ایضاً،ص۱۱۶

۲۳۔احمد قادری، پروفیسر، ڈاکٹر،ناول"جہنمی لوگ "میں سماجی، تہذیبی اور طبقاتی کشمکش کی تاریخی معنویت،(مضمون)مطبوعہ:جہان تحقیق، شمارہ۳، ۲۰۲۱ء، آن لائن

۲۴۔بحوالہ غفور شاہ قاسم،ڈاکٹر،مستنصف حسین تارڑ:شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۲۰۱۸ء،ص۱۸۸-۱۸۹

۲۵۔ایضاً،ص۱۸۸

۲۶۔انوار احمد،ڈاکٹر،اردو کے نمائندہ ناول نگاروں کی تخلیقات میں سماجی گھٹن کے تاریخی و ثقافتی عوامل،(مضمون)مطبوعہ:الحمد،شمارہ۱۰، ۲۰۱۸، الحمد اسلامک یونیورسٹی،اسلام آباد،ص۲۵

۲۷۔تارڑ،مستنصر حسین،خس و خاشاک زمانے،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۷ءص۴۱۷

۲۸۔ایضاً،ص۴۳۱

۲۹۔ایضاً،ص۴۳۴

۳۰۔ایضاً،ص۴۳۷

۳۱۔ایضاً،ص۱۷۴

۳۲۔ایضاً،ص۱۹۱

۳۳۔ایضاً،ص۳۷۸

۳۴۔ایضاً،ص۴۸۵

۳۵۔مستنصر حسین تارڑ،(پیش لفظ)نیلی بار از طاہرہ اقبال،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۱۷ءص۹

۳۶۔بی بی امینہ،ڈاکٹر،اکیسویں صدی کے پاکستانی اردو ناولوں میں سماجی و اقتصادی عدم مساوات، (مضمون)مطبوعہ:ادبیات،شمارہ ۱۲۳-۱۲۴جلد دوم،۲۰۲۰، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد،ص۱۱۹

۳۷۔کرن ریاض چودھری،طاہرہ اقبال کا ناول"نیلی بار "تفہیم و تجزیہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۸ء ص۴۰
۳۸۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۱۵۶
۳۹۔ایضاً،ص۹۹
۴۰۔ساجدہ سلطانہ،طاہرہ اقبال کے ناول"نیلی بار"کا فکری و فنی جائزہ،ایم۔فل اردو،(غیر مطبوعہ) مملوکہ،نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،اسلام آباد،۲۰۱۹،ص۳۹
۴۱۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۹۹
۴۲۔ایضاً،ص۱۳
۴۳۔ایضاً،ص۳۷
۴۴۔ایضاً،ص۳۷
۴۵۔کرن ریاض چودھری،طاہرہ اقبال کا ناول"نیلی بار "تفہیم و تجزیہ،ص،۴۷
۴۶۔طاہرہ اقبال،نیلی بار، ص۱۰۰
۴۷۔ایضاً،ص۱۰۱
۴۸۔ایضاً،ص۲۰۵
۴۹۔ایضاً،ص۲۸۱
۵۰۔ساجدہ سلطانہ،طاہرہ اقبال کے ناول"نیلی بار"کا فکری و فنی جائزہ،ص۵۷
۵۱۔طاہرہ اقبال،نیلی بار، ص۳۷۳
۵۲۔ایضاً،ص۲۷۵

باب سوم:

منتخب ناولوں میں افراد کی سماج اور نوعی زندگی سے بیگانگی کا تجزیاتی مطالعہ

افراد کی سماج سے بیگانگی سے مراد انسان اور معاشرہ ہے۔انسان فطری طور پہ سماج قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی پہلو اسے دیگر انواع سے منفرد وممتاز حیثیت دیتا ہے۔یہ اس کا نوعی تقاضا بھی ہے کہ وہ سماج قائم کرے۔مارکسی فلسفہ و فکر کے مطابق افراد معاشرہ کی سماج سے بیگانگی کی بنیاد محنت کش کو اس کی محنت کے صلے کے میسر نہ ہونے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔وہ سماج میں رہتے ہوئے عمل کرتا لیکن بدلے میں اسے صرف اتنا میسر آئے کہ جس سے اس کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہ ہوں تو وہ سماج سے کٹنا شروع ہو جاتا ہے۔یعنی اس کی سماج میں دلچسپی،سماج کی بہتری اور دوسرے انسانوں کے ساتھ جذباتی وابستگی کا خاتمہ ہو جاتا اور وہ صرف اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔

سماجی بیگانگی کی کئی شکلیں ہیں جو آج کے سماج میں ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ہر فرد دوسرے سے آگے نکلنے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے اور اگر اس دوران اسے کوئی رکاوٹ ہو تو وہ سماجی معیار سے نیچے اتر کر اسے کچل کر اپنا پاؤں اس کی گردن پہ رکھ کر گزر جاتا ہے۔مارکس نے سماجی افراتفری کی اس صورت حال کو معیشت سے جوڑتے ہوئے محنت کے استحصال کو وجہ بتایا ہے۔

آج کا سماج دہشت گردی،خوف،چوری،کرپشن،غیر اخلاقی رویے،قتل و غارت گری،جہالت،غربت،بے روزگاری جیسی کئی عفریتوں کا شکار ہے۔جس کی وجہ یہ طبقاتی نظام ہے اور یہی اس کا پالن بھی کرتا ہے۔دہشت گردی ہو یا دیگر برائیاں تب جنم لیتی ہیں جب افراد کو معاشی تنگی پہ مجبور کیا جاتا ہے۔معاشی تنگی نفسیاتی اعتبار سے افراد کو کشمکش کا شکار رکھتی ہے اور کسی اقدار کی تخلیق کے بجائے تخریبی عمل زیادہ ہوتا ہے۔یہی تخریبی عمل دراصل سماجی بیگانگی ہے کیوں کہ انسان جس فطری جذبے اور ضرورت کے تحت سماج بنا کر رہتا اگر وہی ضرورت خود غرضی اور لاتعلقی کی کیفیات پیدا کرے تو اس کا سماج کے مجموعی رویے میں اختلاف سماجی بیگانگی کو جنم دیتا ہے۔

مارکس کے خیال میں انسان دیگر انواع سے مختلف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے۔انسان احساسات و جذبات رکھتا ہے دوسروں کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے اور یوں سماج کی بھی بنیاد ڈالتا ہے۔اس اعتبار سے جب کوئی شخص سماجی بیگانگی کا شکار ہوتا ہے تو وہ نوعی بیگانگی کا بھی شکار ہوتا ہے۔سماجی پستی اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو نکھارنے کے بجائے زنگ آلود بنا دیتی ہے۔افر تفری،جہالت اور اپنے عمل سے دلچسپی کا ختم ہو جانا نوعی تقاضوں کو پس پشت ڈال دینے کے مترادف ہے اور یہی پہلو نوعی بیگانگی کہلاتا ہے۔

اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ فرد خاص صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے اور اسی کے مطابق ایک عمل اپناتا ہے اور جب وہ اپنے اس کردار کو بہ خوبی انجام نہیں دے رہا ہوتا یا سماجی ضرورتوں کے تحت آزادانہ طور پہ صلاحیتوں کا استعمال نہیں کر پاتا تو وہ اسی بیگانگی کا شکار ہوتا ہے۔مثلا کوئی ڈاکٹر ہے تو اس کا سماجی اور نوعی تقاضا ہے کہ وہ اپنے عمل کو پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کرے۔اسی طرح شعور حاصل کرنا بھی انسان کا نوعی تقاضا ہے لیکن ہمارے آج کے جدید سماج میں بھی ایک کثیر تعداد اس تقاضے سے محروم ہیں جس کی بنیادی وجہ ان کے پاس وسائل کا نہ ہونا ہے۔یوں سماجی بیگانگی کا حتمی نتیجہ نوعی اور نوعی کا سماجی بیگانگی ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ نوعی بیگانگی کا اظہار سماجی بیگانگی کی نسبت دکھائی نہیں دیتا۔

فائر ایریا:

ا۔افراد کی سماج سے بیگانگی:

سماجی بیگانگی یاانسان کی انسانوں سے بیگانگی مارکسی فکر کے مطابق معاشی صورتحال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔جب انسان اپنی محنت کی پیداوار سے بیگانہ ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں سماجی بیگانگی پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔اس طرح افراد معاشرہ ایک دوسرے سے اجنبی اور لاتعلق ہو جاتے ہیں۔وہ جس سماج میں رہتے ہیں اس میں خود کو اکیلا تصور کرتے ہیں جب کہ باقیوں کو اپنے حریف کے طور پر جانتے ہیں۔معاشی ناہمواری اس کو اپنی ہی مخلوق سے اجنبی و حریف بنا دیتی ہے۔

سرمایہ داری سماج میں نام نہاد مسابقت کے عمل میں افراد معاشرہ دن رات بھاگتے ہیں بدلے میں ان کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا ایک ہی سماج کے افراد ایک دوسرے سے بیگانے ہو جاتے ہیں۔بالخصوص پیٹی بورژوا

اور پرولتاریہ کی سماجی بیگانگی کی بہترین مثال "فائر ایریا" ہے۔ جس میں سماجی بیگانگی کے تمام مظاہر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ واضح ہو رہے ہیں "فائر ایریا" میں اسی بیگانگی کے حوالے سے مظہر عباس لکھتے ہیں:

> مزدوروں کی مغائرت کی حد ملاحظہ ہو کہ سہدیو کا دوست رحمت میاں کو کان میں حادثہ پیش آیا۔ مالکان نے پولیس، یونین اور ورثا کے جھمیلے سے بچنے کے لیے اسے کان کے ہی دور افتادہ حصے میں دبا دیا اور کاغذات میں ظاہر کیا کہ وہ کان سے باہر آیا تھا اور پھر کہیں چلا گیا۔ جب کہ فائر ایریا میں مرکزی کردار سہدیو نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کو تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن دیگر مزدور اس نظام اور سماج مغائرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ (۱)

"فائر ایریا" میں مارکسی بیگانگی کے سماجی پہلو کی ہر شکل موجود ہے غربت، افلاس، جرائم، جنسی زیادتی، نشہ چوری، جہالت الغرض ہر قسم کی بیگانگی کی واضح عکاسی ملتی ہے۔

ناول کی ابتدا سے ہی سماجی بیگانگی کی واضح تصاویر جھلکنا شروع ہو جاتی ہیں ایسے لگتا ہے جیسے ناول نگار نے خاص اسی پہلو کو بنیاد بنا کر اپنے ناول کی کہانی بنی ہو۔ ننکو جو کوئلے کی کان میں خود بھی کام کرتا ہے وہ اپنے گاؤں سے اس کالی اندھیری کوٹھڑی میں جو زمین کے اندر ہزاروں فٹ نیچے ہے مجبور و لاچار لوگوں کو پھنسا دیتا ہے۔ ان کی اسی مجبوری کا فائدہ اٹھاتا ہے جس کے بدلے میں اسے چند سو روپے ملتے ہیں۔ وہ یہ احساس نہیں کرتا کہ میں جن لوگوں کو کام کی لالچ میں لے جا رہا ہوں اس سے ان کی زندگی سنورنے کی بجائے مزید دلدل میں گھیرتی چلی جائے گی اور وہ نہ ختم ہونے والی دلدل میں ہمیشہ کے لیے پھنس کر رہ جائیں گے۔ وہ گاؤں سے کام کے لیے لڑکوں کو لاتا ہے اور اس کے نتیجے میں جب اس کو کچھ ہاتھ نہیں آتا تو پچھتاوا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھی بھی اس طرح گاؤں سے لڑکے لے کر آتے ہیں اور مالکوں سے چند سو روپے لے کے ان کو موت کے کنویں میں اتار دیتے ہیں ۔

اس موت کے کنویں میں پیٹ کی آگ کو بجھاتے بجھاتے مزدور اپنی ذات سے بھی بیگانہ ہو جاتے ہیں ۔ وہ سماج میں رہتے ہوئے بھی سماج سے کٹ جاتے ہیں، سماجی اقدار اور روایات ان کے لیے بے معنی ہو جاتی ہیں۔ وہ دوسرے انسانوں کو کیڑے مکوڑے تصور کرنے لگتے ہیں ان کے پیٹ کی اس آگ کو مٹانے کے لیے صاحب استعداد ان سے جرائم کراتے ہیں۔ جن کے بدلے میں ان کو چند سو روپے دیئے جاتے ہیں۔ ان جرائم کی عادت میں وہ ان کو نشے کی لت بھی لگا دیتے ہیں جب مزدور کو لیری میں بھی محنت کر کے کچھ حاصل نہیں کر

پاتے تو نشے جیسی لعنت اور پیسے کی خاطر اپنے ہم جنسوں پر تشدد کرتے اور انکو قتل بھی کر دیتے ہیں۔ ناول کی ابتدا سے ہی کالا چند مالک کے کہنے پر ایک بندے کو تشدد کا کا نشانہ بناتا ہے اور نتیجے کے طور پر وہ مر جاتا ہے اور اس کو پیسے ملتے ہیں اس کی لالچ اور بیگانگی کچھ اس طرح ظاہر ہوتی ہے

> پانچ سو روپے کا دارو؟ باپ رے! پانچ سو روپے کا دارو تو پانچ مہینے پیئے گا۔ اس نے ہزار روپے کا نوٹ اپنی بنڈی کی جیب میں ڈال لیا، اب وہ ہوا میں اڑ رہا تھا۔ دو نشے ہیں۔ ایک انگریزی شراب کا نشہ اور دوسرا مالک کا وعدہ، مالا مال کر دوں گا۔ (۲)

سرمایہ داری نظام میں انسان اس قدر مجبور و لاچار ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے پیٹ کو پالنے کے لیے ہر جائز و ناجائز طریقہ اختیار کر کے پیسے کمانا چاہتا ہے جب وہ مایوس ہو جاتا ہے تو سکون کے لیے نشے کا عادی ہو جاتا ہے۔ ان کو لیریوں میں کام کرنے والے مزدور اسی نشے کی لت میں پھنس چکے ہوتے ہیں اور یہ نشہ ان کو غیر اخلاقی رویہ اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

سرمایہ داری نظام طبقات کو پیدا کر کے نچلے اور کمزور طبقے سے سخت محنت کراتا ہے، انھیں مالی طور پر اتنا کمزور کر دیتا ہے کہ وہ کسی بھی طرح کے سماجی نظام میں شریک نہیں ہو پاتے۔ انکے لیے زندگی محض کھانے پینے اور کمانے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ اپنے گھر خاندان اور دوسرے انسانوں اور سماج سے لاتعلق کام میں جتے رہتے ہیں۔ مسلسل دن رات کی یہ محنت انھیں اس قدر بے بس و لاچار بنا دیتی ہے کہ وہ کسی اور چیز کا، کسی اعلی اخلاقی قدر کا، روایت کا تصور بھی نہیں کر سکتے، ان کی اخلاقیات و اقدار بھی تباہ ہو جاتی ہیں۔ سماج دو طبقوں میں بٹ کر بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے۔

کمزور و نچلے طبقے محنت کرتے ہیں اور ان کی یہ محنت ان کے مالکان اور سرمایہ داروں کی جیب میں جا گرتی ہے اور وہ دن رات اپنی ضروریات کو پورا کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ اگر ان کو دو وقت کی روٹی میسر آتی ہے تو چھت نہیں ہوتی۔ وہ پوری زندگی محنت کرتے ہیں لیکن صحت و تعلیم کی بہتر سہولیات مہیا نہیں کر پاتے۔ ایسے میں وہ اپنے بچوں کی تعلیم اور پرورش بھی نہیں کر پاتے جس سے ان کی نسل در نسل جہالت مقدر ٹھہرتی ہے۔ میاں بیوی جیسے مقدس رشتے بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں اتنا وقت بھی میسر نہیں ہوتا کہ دو گھڑی بیٹھ کر آپس میں بات چیت کی جا سکے۔ یوں ان کے درمیان رشتہ محض نام کا رہ جاتا ہے۔ ایسی ایک مثال رحمت میاں کی ہے جس کی زندگی اس قدر مشکل ہو چکی ہوتی ہے کہ وہ خان صاحب جیسے زمین داروں کے

یہاں کام کرنے کے بعد بھی اپنی بیوی بچے کے ساتھ بیٹھ کر کھانا تک نہیں کھا سکتا اور مشین کا کل پرزہ بن کر رہ جاتا ہے۔

> سارا دن خان صاحب کی غلامی کے بعد جب وہ واپس ہوتا تو اتنا تھک چکا ہوتا کہ کسی چیز کی طرف دیکھنے کا من نہ ہوتا، ادھر خنتو نیا بھی دن بھر کے کام کیساتھ گوبر جمع کرتے اور مہوہ چنتے چنتے بھول چکی ہوتی کہ زندگی میں اور کچھ بھی ہے۔ (۳)

طبقاتی سماج میں محنت کش کی کوئی زندگی نہیں ہوتی وہ انسانی جسم کی صورت میں ایک جانور کی طرح پیٹ پالنے میں مصروف عمل رہتے ہیں۔ کوئی انسانی روح کو سکون دینے والی اور جسم کو آرام مہیا کرنے والی چیز کا تصور بھی ان کے ذہن میں نہیں آتا۔ ان کے لیے زندگی محض کھانے پینے اور کمانے کا نام بن کر رہ جاتی ہے وہ کڑ کڑ کے اندر ہی اندر مر جاتے ہیں۔

سہدیو جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے گاؤں کی ایک لڑکی جلیا سے پیار کرتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں انھوں نے زندگی کو ساتھ جینے کے خواب سجا رکھے ہیں۔ جب سہدیو گاؤں سے پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے کولیری میں آتا ہے تو وہ جلیا سے وعدہ کرتا ہے کہ واپس آئے گا اور وہ بھی وعدہ لیتی ہے کہ اکٹھے تہوار منائیں گے۔ لیکن سہدیو کولیری کی اندھیری دنیا میں ایسا کھویا کہ دو سال تک گاؤں تک نہ جا سکا ۔جلیا کی شادی ہو گئی اور وہ کولیری میں اپنا پسینہ بیچنے میں لگا رہا۔ اسی معاشی صورتحال نے اسے اپنے قیمتی احساسات اور جذبات کو دفن کر دینے پر مجبور کر دیا۔

کول فیلڈ کی دنیا اندھیرے کی دنیا ہے جہاں روشنی کا کوئی تصور۔ نہیں انسانی سوچ اور فکر میں کوئی خوشی کوئی روشنی کی کرن باقی نہیں بچتی۔ یہ کول فیلڈ ہمارے مجموعی سماج کی عکاس ہے جہاں انسان اپنے جیسے انسانوں سے بیگانے اپنی ذات تک محدود ہو کر اندھے بہرے بن کر زندگی گزارتے ہیں۔ یہ کول فیلڈ ہمارے سماج کے اُس چہرے کو پیش کرتی ہے جس نے آج ہر شخص کو ایک دوسرے سے بیگانہ کر رکھا ہے۔ جہاں انسان ہی انسان کا دشمن بن چکا ہے وہ اپنے جیسے انسانوں پر ظلم ہوتے ہوئے دیکھتا ہے لیکن آواز نہیں اٹھاتا۔ وہ بے بس اور مجبور ہوتا ہے کہ اگر وہ احتجاج کرے گا تو اس کو بھوک جیسی لعنت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بے روزگاری اس کا مقدر بن جائے گی، طاقت ور افراد اس کی جان لے سکتے ہیں، اس کا خاندان اور گھر تباہ ہو جائے گا، ایسے میں وہ خاموش انسانوں سے لاتعلق زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کی تصویر "فائر ایریا" میں الیاس احمد گری نے کھینچی ہے۔

"فائر ایریا" کے مزدور معاشی پریشانیوں کا شکار ہو کر زمین کے نیچے ہزاروں فٹ اندھیری دنیا میں خود کو موت کے منہ میں دھکیل دیتے ہیں۔ ان کو پیٹ کی آگ اس موت کے منہ میں ظلم و ستم اور استحصال سہنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے ظلم ہوتا ہوا دیکھتے ہیں مگر آواز بلند نہیں کرتے، وہ ڈرتے ہیں بے روزگاری، بھوک اور موت سے، قتل و غارت سے اور تماشائی بن کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں احساس ہو تب بھی اپنا منہ نہیں کھولتے، ظلم کے خلاف بغاوت نہیں کرتے، استحصال کو خاموشی سے سہتے رہتے ہیں۔ مجمدار کول فیلڈ میں کام کرنے والوں کی اس بے بسی کو سہدیو سے کچھ یوں بیان کرتا ہے:

> اس کول فیلڈ میں رہنے کی یہ پہلی شرط کہ دیکھو سب کچھ، سنو سب کچھ، مگر بولو ایک لفظ نہیں، یوں سمجھ لو یہاں کے لوگوں کے پاس آنکھ ہے، کان ہے۔ مگر منہ نہیں، زبان نہیں، چھے سال ہو گئے ہیں مجھ کو مختلف کولیریوں میں کام کرتے ہوئے، میں نے کسی کو بولتے نہیں سنا، کسی کو آواز اٹھاتے نہیں پایا۔ (۴)

یعنی اس سماج میں بھوک منہ کھولے ہر وقت غریب کو نگلنے کے لیے کھڑی رہتی ہے وہاں یہ لوگ اپنے منھ بند کیے سب کچھ آنکھوں سے دیکھنے اور سننے کے باوجود کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوتے، وہ بے بس ہوتے ہیں۔ مجبوری ان کو انسانوں اور سماج سے بیگانہ کر دیتی ہے۔ ان کی بیگانگی کی صورتحال انھیں ایک وقت میں انسانی نوعی تقاضوں سے بھی محروم کر دیتی ہے۔ پھر وہ صرف اور صرف ایک جانور کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کی نسلیں بھی اس طرح ظلم سہتی ہیں اور چند افراد کے لیے دولت پیدا کرتے کرتے مر جاتی ہیں۔ یہ آج کی بات نہیں ہزاروں سال سے ایسا ہوتا آ رہا ہے لیکن سرمایہ داریت نے اس کو پوری آب و تاب کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے

"فائر ایریا" کے تمام کردار کسی نہ کسی طرح سے بیگانگی کا شکار ہیں کولیریوں کے مالکان ہوں یا لیڈر، مزدور ہو یا ٹھیکیدار ہر ایک دوسرے سے بیگانہ ہے۔ جو طبقے خوش حال ہیں وہ اپنے نچلے طبقے سے نفرت کرتے ہیں انھیں ذلیل کرتے ہیں۔ سمال صاحب کا کردار اس کی دلیل ہے جو حاکم وقت اور گوری چمڑی ہونے کی وجہ سے ہندوستانیوں کو کمتر اور ذلیل تصور کرتا ہے۔ اس کے دیگر ساتھی بھی اسی سوچ کے پیروکار ہوتے ہیں۔ ایسے میں ان کے درمیان نفرت پیدا ہو جاتی ہے ایک جگہ کام کرنے والے آپس میں بیر پیدا کرتے ہیں۔ وہ دوسرے کی ہار پر اپنی جیت کی عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ انعام الحان کی شکست بھی اس کی دلیل ہے کہ کس طرح سے اسے نئی یونین کے ذریعے سے اپنے راستے سے ہٹا دیا گیا۔

متوسط اور پرولتاریہ ایسے طبقے ہیں جن کی زندگی مچھروں کی طرح گندے نالوں میں بسر ہو رہی ہوتی ہے ایسے میں وہ طرح طرح کے غیر اخلاقی کاموں میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ متوسط طبقہ پیرولتاریہ پر اپنی برتری کی کوشش، نفرت کرتا ہے اور بالائی طبقے کی چاپلوسی کرتا ہے۔ ایسے میں کولیروں میں موجود یہ نچلہ طبقہ چوری چکاری، سود خوری اور جنسی جرائم، قتل و غارت جیسی برائیوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے، ناجائز تعلقات قائم کرتا ہے، جنسی تشدد کرتا ہے، عزت کو پامال کرتا ہے چوری کرتا اور پیٹ پالتا ہے، رشوت دیتا ہے تاکہ کسی قانونی مسئلے سے بچ سکے۔

رحمت میاں ایک حادثے میں اپنی جان گنوا بیٹھتا ہے۔ اس کی موت کے چشم دید گواہ مدنا کو زبردستی گواہی دینے اور راز کو ظاہر کرنے سے روک دیا جاتا ہے۔ وہ ڈر اور خوف کے مارے اپنے ہی گھر میں قیدی بن کر نوعی تقاضے سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے اور سماجی فرض سے بھی۔ پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ نشے کی حالت میں وہ کالا چند سے اس کا ذکر کر بیٹھتا ہے:

> ڈر سے اب اس نے گھر سے باہر ہی نکلنا چھوڑ دیا ہے۔ روز شام کو اپنی بیٹی سے دارو منگوا لیتا ہے۔ جب تینوں بچے سو جاتے ہیں تو وہ پینا شروع کرتا ہے۔ گلاس بھر بھر کے آگ اپنے اندر انڈیلتا ہے مگر بدن کی ٹھنڈک اور ہاتھوں کی لرزش ختم نہیں ہوتی۔ (۵)

اس جیسے دیگر کئی مزدور جن کو کسی نہ کسی طرح اس کہانی / حادثے کا پتا چل جاتا ہے وہ بھی اس بات کو چھپاتے ہیں۔ وہ کسی طرح کی کوئی بات نہیں کرنا چاہتے، خاموش ہو کر تماشا دیکھنے پر مجبور ہیں۔ حاضری بابو اس حادثے کی حقیقت جانتا تھا لیکن اس کو چھپانے پر مصر رہا۔ اس نے غلط دستخط اور انگوٹھا لگانے کے لیے بھی جو راہ اختیار کی وہ سماجی بے بسی اور انسانی تقاضوں کے یکسر خلاف ہے۔ یہی نہیں جب اس سے پوچھا جاتا تو وہ اس بات کو نئے رنگ دے کر چھپانا چاہتا ہے۔ رحمت میاں کی موت سماجی اصولوں کے مطابق یہ تقاضا کرتی تھی کہ کمپنی کے خلاف قانونی کاروائی کی جائے اور معاوضہ بھی دیا جائے۔ لیکن بے حسی کا یہ عالم ہے کہ کمپنی اس سارے معاملے کو چھپانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتی ہے۔ سہدیو جو پہلے پہل آواز اٹھانے کی کوشش کرتا ہے ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ بھی خاموشی اختیار کیے کولیری میں ہونے والے واقعات سے منھ پھیر لیتا ہے، آنکھیں بند کر لیتا ہے، اس کی خاموشی اس کی بے بسی اور بیگانگی کی علامت ہے۔

کول فیڈ کی اس دنیا میں محنت کش کو پیسے اور طاقت سے دبا دیا جاتا ہے۔ انھیں ایک طرف محنت کی اجرت کے ذریعے خریدا جاتا ہے اور دوسری طرف منہ بند رکھنے کے لیے بھی ان کو ان کے فرض سے بیگانہ کر

دیا جاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں، سنتے ہیں مگر بولتے کچھ بھی نہیں۔ ان کے گرد خوف کا حصار قائم ہے یہی خوف کا حصار انھیں سماجی زندگی سے کاٹ دیتا ہے۔ مجمدار جو ایک سوشلسٹ کردار ہے وہ بھی بے بسی اور مغائرت کا شکار ہے۔ وہ جانتے بوجھتے بھی اس لیے نہیں بول سکتا کہ اس کی مجبوریاں ہیں زندہ رہنے کی مجبوری پیٹ پالنے کی مجبوری۔

ان کولیریوں میں یونین بنا کر مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے جس کے لیے باقاعدہ غنڈے پالے جاتے ہیں۔ جو زبردستی مزدوروں کو یونین کا حصہ بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان سے فنڈ لیے جاتے ہیں پھر ان کو یونین کی لڑائی میں مروا دیا جاتا ہے۔ اپنی ہی یونین کے لوگوں کو قتل کر دیا جاتا ہے، ایک دوسرے کو گالیاں نکالی جاتی ہیں پیٹا جاتا ہے اور یہ سب کرتے ہوئے ان کے ذہن میں سماجی قوائد اور نہ انسانی ہمدردی کے جذبات ہوتے ہیں۔ سہدیو کو جب مارا جاتا ہے تو سب خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہتے ہیں۔ کوئی بھی آگے بڑھ کر ان کو الگ نہیں کرتا، نہ مارنے والوں کو احساس ہوتا ہے یہ انسان ہے اور نہ دیکھنے والوں کو کہ سماجی ذمہ داری اور انسانی تقاضوں کو بروکار لاتے ہوئے اس کی مدد کی جائے :

> کوئی بچانے والا نہیں، کوئی ایک لفظ کہنے والا نہیں۔۔۔ یہ سارے لوگ یہ سیکڑوں لوگ
> جو اس سفاک منظر کو دور نزدیک سے دیکھ رہے ہیں، یہ نہ گونگے ہیں نہ بہرے نہ نامرد
> ہیں مگر کسی میں ذرا سی آگ، ذرا سی گرمی نہیں بچی ہے ٹھنڈے بے حس لوگ۔۔۔ (۶)

سہدیو ہو، رحمت میاں ہو یا کوئی اور کسی کے حق میں کسی نے آواز بلند کرنے کی جرات نہیں کی سب خاموش تماشائی۔ اصغر خان، لالہ دیپ نارائن، مزدور سنگھ جیسے بڑے بڑے نام بھی اس بے حسی اور روپے کی لالچ میں ایک دوسرے کی جان تک لے لیتے ہیں۔ بیچ چوراہے پر قتل و غارت گری ہوتی ہے، گولیاں چلتی ہیں ، آنکھیں دیکھتی ہیں مگر کچھ بتاتی نہیں۔

سماجی بیگانگی کی ایک اور مثال جنسی بے راہ روی اور زیادتی ہے جہاں مزدور سخت کام کرنے کے بعد جنسی تسکین کے لیے غلط راہ پر چل پڑتے ہیں۔ وہ عورتوں سے چھیڑ چھاڑ بھی کرتے ہیں اور جنسی ملاپ بھی۔ مزدوروں سے بڑھ کر سماجی بیگانگی کی یہ شکل متوسط طبقے کی ہے جو عورتوں کو محض جنس تصور کرتے ہیں اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی طور پر جنسی تعلق قائم کرتے ہیں۔ عورتوں کی عزت لوٹتے ہیں، انھیں اپنا جسم بیچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ جو نہیں مانتی اس کو زبردستی جنسی استحصال کا شکار بناتے ہیں۔ پھول منیا ہو یا کالا چند کی بہن رانی ، یا مزدور سنگھ کی ماں کی بہن کا کردار ہر ایک جنسی استحصال کا شکار ہو کر اپنی سماجی عزت کو داؤ پر لگا دیتا ہے۔

سماجی استحصال لوگوں کو جرم کی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں وہ جانور صفت بن جاتے ہیں۔ ان کے لیے انسانی جان، مال، عزت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہ نشے میں مبتلا ہو کر سماج سے الگ زندگی گزارتے ہیں، انکے لیے سماجی قوانین اور روایات کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ وہ استحصال کی چکی میں پستے پستے مر جاتے ہیں لیکن احتجاج نہیں کر سکتے۔ خالد اشرف "فائر ایریا" کی اس استحصالی صورتحال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کانوں کے اندر کی خون جلا دینے والی گرمی، موت کے کنویں جیسی گہرائیوں میں کام کرنے کا خطرہ، کانوں سے باہر روزمرہ کی ذلت تشدد، بیوی بچوں کے ساتھ نہ رہنے کی فرسٹریشن اور ملازمت سے نکالے جانے کی لٹکتی تلوار، سب مل کر ان مزدوروں کی شخصیت کو اس قدر مسخ کر دیتے ہیں کہ وہ پھیپھڑے گلا دینے والی گھٹیا شراب میں پناہ لیتے ہیں۔ یا نکہائیوں کے پاس جا کر اپنی حیوانی پیاس بجھاتے ہیں۔ (۷)

ناول "فائر ایریا" کے بیشتر کردار سماجی و انسانی زندگی سے بیگانے ہو چکے ہیں۔ انھیں زندگی کی کسی سہولت سے کوئی سروکار نہیں، وہ پیٹ پالنے کے لیے چوری کرتے ہیں، قرض لیتے ہیں، شراب پیتے ہیں اور استحصال کراتے ہیں۔ ان کی زندگی ایک ہی دائرے میں گھومتی رہتی ہے اور ان کے اوپر بیٹھے مالکان ان کو اسی دائرے میں جینے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ کوئی آواز نہیں اٹھتی جو اٹھتی ہے اس کو دبا دیا جاتا ہے اس ڈر سے لوگ انسانی تقاضوں سے بیگانے جیے جا رہے ہیں۔

۲۔ افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی:

انسان اس کائنات میں موجود دیگر جانداروں سے شعور اور تخلیقیت کی وجہ سے افضل تصور کیا جاتا ہے۔ دیگر جاندار بھی کسی نہ کسی طرح کچھ نہ کچھ تخلیق کرتے ہیں لیکن وہ صرف ایک سمت میں اور ایک ہی چیز تخلیق کرتے ہیں۔ جب کہ انسان مختلف انواع کی اشیاء کو تخلیق کرتا ہے۔ انسان وہ واحد جانور ہے جو صرف اپنی ذات کے لیے عمل نہیں کرتا بلکہ اپنی ہم جنسوں کے لیے بھی کرتا ہے۔ انسان اپنے شعور اور محنت کے اس مادے کی بنیاد پر دوسرے جانداروں سے خود کو ممتاز کرتا ہے۔ اس کی یہی خصوصیت اس کو کائنات میں منفرد مقام سے نوازتی ہے۔

مارکسی فکر کے مطابق انسان کی محنت اور تخلیق کا عمل ہی اسے دوسرے جانداروں سے انفرادیت بخشتا ہے۔ یہاں اس پہلو کو بطور انسان اس کی خصوصیات اور تقاضوں سے پرکھا جائے گا کہ کس طرح ایک سماج میں انسان کو اپنے نوعی تقاضے یا فطری صلاحیتوں اور خصوصیات کو بروکار لانا چاہیے۔ "فائر ایریا" ہو یا کوئی

بھی ناول جو انسانی مسائل اور سماج کی عکاسی کرتا ہو اس میں نوعی تقاضوں سے بیگانگی کا عنصر نہ ہونا اچنبھے کی بات ہوگی۔ نوعی تقاضے کے بغیر ادب کا اعلیٰ شاہکار تخلیق نہیں ہو سکتا۔ الیاس احمد کے ناول میں جہاں دیگر پہلوؤں سے بیگانگی موجود ہے۔ وہیں انسان کی نوعی تقاضوں سے بیگانگی کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔

کول فیلڈ میں کام کرنے والے محنت کش ہوں یا سماج کے محنت کش وہ کسی نہ کسی طرح سے نوعی بیگانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کول فیلڈ کی دنیا میں انسان جہاں صرف زندہ رہنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ کیسے ممکن ہے کہ وہ نوعی تقاضوں سے بیگانہ ہو؟ مارکسی بیگانگی کا یہ پہلو ناول میں مختلف پس منظر کے ساتھ واضح ہوتا ہے اور گدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کس طرح انسان نوعی تقاضوں سے مسائل میں الجھ کر دور ہوتا جارہا ہے۔ بنیادی طور پر یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں رشوت خوری، قتل و غارت گری، سیاسی ہتھکنڈے، جنسی زیادتی، لوٹ کھسوٹ، غربت، افلاس اور سہولیات کی عدم دستیابی ہے۔ یہ ایک ایسے نظام کا عکاس کا ناول ہے جس نے جدید سرمایہ داری نظام کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر صغیر احمد "فائر ایریا" کے حوالے سے "اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ کے بعد" میں لکھتے ہیں:

> "فائر ایریا" کا موضوع صنعتی سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے۔ جہاں پر روز مزدوروں کا استحصال ہو رہا ہے۔ اس ناول میں ٹریڈ یونین کی سیاست کی مختلف شکلوں کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ "فائر ایریا" کے قالب میں آگ ہی آگ ہے مصنف نے آگ کو کئی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک آگ وہ ہے جو کولیریوں کے اندر دہک رہی ہے اور مختلف کرداروں کے اندر کی آگ کو بھی بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ (۸)

مارکسی سوچ کو بنیاد بنا کر تحریر کردہ ناول "فائر ایریا" میں نوعی بیگانگی کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ ناول کی ابتدا سے ہی ہمیں اس کے ایسے پہلو ملتے ہیں جس میں نوعی بیگانگی دکھائی دیتی ہے۔ "فائر ایریا" کے کردار اپنے نوعی تقاضے کو بھرپور انداز میں پیش نہیں کر پاتے۔ وہ سماجی بیگانگی کا شکار ہیں انھیں سماج اور اس کے اصولوں سے کوئی غرض نہیں ہے۔

انسان جہاں رہتا ہے وہاں اس کو اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق عمل کرنا ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے جیسے انسانوں کے لیے کار آمد ثابت ہو، دوسروں کو امن و محبت سکھائے اور بہتر سے بہتر کی تلاش میں رہے۔ لیکن ناول میں محنت کش سماج سے بیگانہ ہونے کے ساتھ نوعی تقاضوں سے اس قدر بیگانے ہیں کہ ان کو احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ انسان ہیں وہ خاموش بھوت کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ کالا چند کو سود کی

رقم ادا نہ کرنے پر مار پڑتی ہے۔ وہاں موجود مزدوروں سے فطری تقاضا یہ ہے کہ وہ آپس میں لڑنے والے ان افراد کے درمیان صلح رحمی کرائیں۔ ظلم کرنے والوں کو ظلم سے روکیں لیکن سماج سے بیگانے یہ لوگ اپنے فطری جزبے کو دبا لیتے ہیں۔ وہ انسان جو دوسروں کو دکھ درد سے نجات دلاتا ہے وہ خاموش کھڑا ہو تو اس کا مطلب اس کے فطری تقاضے اس کو یکسر بھول چکے ہیں سوائے سہدیو کے۔ اس عمل پر ننکو سخت پریشان ہوتا ہے اس کو ڈانٹتے ہوئے کہتا ہے: "سنجوگ کی کیا بات ہوئی کالا چند کو مار کھاتے کیا تم نے اکیلا دیکھا تھا؟ وہاں تو پچاسوں آدمی موجود تھے۔ خود جگشیر بھی تھا اس نے تو کوئی ٹوک ٹاک نہیں کی۔[۹]

ایک بڑی تعداد مار پیٹ کرنے والے چند افراد کو روک نہیں سکی۔ جب سماجی بیگانگی پیدا ہو جائے تو اس کا حتمی نتیجہ نوعی بیگانگی ہوتا ہے جو بظاہر نظر نہیں آتا مگر اس کے اثرات سے آگاہی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب رحمت میاں کی موت ہوتی ہے سب خاموشی اختیار کرتے ہیں اور چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالاں کہ انسانی فطرت / نوع کا تقاضا ہے وہ ایسے ہونے والے مظالم کے خلاف اپنا کردار ادا کریں۔ اسی لیے کالا چند غصے میں کہتا ہے ان کو سب پتا ہے مگر بولتا کوئی نہیں ڈرپوک ہیں سب اور اپنی فطرت کو بھول چکے ہیں۔ مدنا جو اس موت کا چشم دید گواہ ہے گواہی دینے کے بجائے اپنے گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ پہلے شراب کے نشے میں سچائی اگل دیتا ہے اور جب اس کو ہوش آتا ہے تو پچھتاوے کا ظہار کرتا ہے اور گواہی کے ڈر سے بچوں کو لے کر بھاگ جاتا ہے۔ مجمدار جب سہدیو سے پوچھتا ہے کہ کیا ایسا کوئی آدمی ہے جس نے اس حادثے کو آنکھوں سے دیکھا ہو تو سہدیو اس کو مدنا کے بارے میں کہتا ہے:

> کچھ پتا نہیں کسی کو معلوم نہیں۔ وہ اتنا خائف تھا کہ چار دن سے گھر میں بند تھا۔ کل رات میں نے اس کو پکڑا تو اس نے ساری باتوں کا اقرار کر لیا۔ میں نے اس کو کہا تھا کہ وہ کل میرے ساتھ یونین آفس چلے۔ بس اسی بات پر وہ بھاگ نکلا۔[۱۰]

کول فیلڈ میں کام کرنے والے مزدور اپنی بنیادی ضروریات سے باہر ہی نہیں نکل پاتے ایسے میں ان سے نوعی تقاضوں کی امید رکھنا خود کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ ان کے ساتھ انسان مارے جاتے ہیں قتل کر دیے جاتے ہیں لیکن وہ خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ انسان فطری طور پر یہ خواہش اور مادہ رکھتا ہے کہ وہ کچھ عظیم کرے بلند سے بلند مقاصد کی خاطر اپنی صلاحیتوں کو صرف کرے لیکن ہوتا کیا ہے کہ طبقاتی سماج میں انسان کی یہ صلاحیتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ وہ کسی اعلی مقصد کے بجائے جو ملتا ہے اس پر قناعت اختیار کر لیتا ہے۔ صلاحیت اور جذبہ رکھتا ہے لیکن کئی مواقعوں پر وہ لاتعلقی کا اظہار کرتا ہے۔ وہ کولیری میں ایک وفادار

اور محنتی شخص ہے لیکن وہ ترقی نہیں چاہتا، وہ کسی اعلی مقام کی خواہش نہیں کرتا جس سے اس کی فکر کو عملی جامہ پہنایا جاسکے۔ وہ یونین لیڈر بننے کی صلاحیت تو رکھتا ہے لیکن بننا نہیں چاہتا اس کو لگتا ہے شاید وہ یونین لیڈر بن کر دوسروں کی طرح بن جائے گا اس لیے وہ جیسا ہے ایسا ہی رہے:

> مجھے یونین کے اعزاز واکرام کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے لیڈر بننے کا خواب کبھی نہیں دیکھا۔ میں ایک مائننگ مین ہوں اور یہی میری شناخت بھی ہے اور یہی امتیاز بھی۔[11]

یعنی ایک ایسا شخص جو زندگی کی ٹھوکروں سے تنگ آچکا ہے، جس نے ساری زندگی صرف پیٹ پالنے کی سوچی ہو، ایسا انسان سماج میں اپنی صلاحیتوں کو کیسے بروئے کار لا سکتا ہے؟ وہ جس طرح کے سماج میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے اس طرح کی اس کی سوچ بن جاتی ہے۔ ایک ایسے سماج میں جہاں روٹی ہی زندگی ہو ایسی ہی سوچ پیدا ہوگی۔ تعلیم کے ذریعے انسان کو شعور حاصل ہوتا ہے جب پیٹ بھرا ہو تو انسان کے ذہن میں نئے خیالات اور افکار ترتیب پاتے ہیں۔ یہ افکار تعلیم کے ذریعے پرورش پاتے ہیں، سہدیو خود میٹرک پاس تھا لیکن اپنے بیٹے کی تعلیم کے لیے دل سے خوش نہیں تھا۔ پرتی بالا جب اس کو کہتی کہ بیٹے کی فیس کا مسئلہ ہے تو وہ یہ دلیل دیتا ہے کہ آخر پڑھ لکھ کر کیا کرلے گا؟ وہی کسی سکول کا ماسٹر یا کلرکی کرے گا جب اس کو پرتی بالا کہتی ہے کہ کیا ڈاکٹر یا انجنیئر نہیں بن سکتا؟ تو وہ خاموشی اختیار کرلیتا ہے۔

انسان کا یہ نوعی تقاضا ہے کہ وہ شعور حاصل کرے اور اس شعور کے ذریعے سے وہ دیگر انسانوں کے لیے بھی کار آمد ثابت ہو۔ جب کوئی انسان سماج میں مسائل کا شکار ہو تو نتیجہ کے طور پر وہ ہر شے سے بیگانہ ہو جاتا ہے، وہ جرائم کرتا ہے غیر اخلاقی و غیر انسانی رویے کا شکار ہو جاتا ہے۔ سہدیو اور مجمدار جیسے باشعور افراد بھی بعض اوقات اس بیگانگی کا شکار ہو جاتے ہیں حالات ان کو ان کے تقاضوں سے نبرد آزما نہیں ہونے دیتے۔ عرفان جب سوچنے سمجھنے کے لائق ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے باپ کی موت کے حوالے سے اپنی ماں اور دادا کی کیفیت یاد آتی ہے۔ اس کا دادا جو کہ نماز پڑھتا تھا بیٹے کے لیے دعائیں کیا کرتا تھا اس قدر متنفر ہوا کہ مذہب اور خدا کو برا بھلا کہنے لگا:

> دادا کی اللہ پاک سے لڑائی ہوگئی ہے۔ کبھی کبھی وہ اللہ میاں کو گالیاں بکتا ہے۔ روزہ نماز سب بند، کعبہ کی طرف پاؤں کرکے سوتا ہے۔ کہتا ہے سب جھوٹ ہے ،بڑے خانصاحب سمجھاتے ہیں، کفر کیوں بکتے ہو؟ اللہ کے قہر سے ڈرو۔ بوڑھا

بدک جاتا ہے۔ قہر گراتا ہے تو گرا کر دیکھ لے۔ وہ ایسوں پر قہر کیوں نہیں گراتا
جو رات دن بے ایمانی کرتے ہیں، دوسروں کا حق مارتے ہیں۔ زمین ہڑپ کرتے
ہیں۔[۱۲]

یہ انسان کی فطرت میں شامل ہے کہ وہ کسی نہ کسی عقیدے کو تسلیم کر کے زندگی گزارتا ہے۔ عقیدے سے مراد کسی نظریے کسی تصور کو ماننا ہے۔ مذہب بھی ایک تصور ایک نظریہ ہے جس پر افراد معاشرہ کاربند ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی روحانی کیفیت سے تعلق رکھتا ہے۔ روحانی سکون کے لیے انسان کو مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس سفر کے ذریعے وہ اپنے رب تک پہنچ جائے گا مگر استحصال کا مارا شخص اپنے اس نوعی تقاضے کو بھی بھول جاتا ہے۔ وہ اس کے لیے کوئی اجنبی شے بن جاتی ہے جس سے اس کے اندر نفرت جنم لیتی ہے اور نفرت کا یہ سلسلہ اس کو بیگانگی کا شکار بنا دیتا ہے۔

انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جس سماج میں رہے اس میں اپنا کردار ادا کرے۔ وہ سماجی اور نوعی تقاضوں کی انجام دہی سے انسانیت کو ترقی دے۔ سماجی مسائل کو حل کرے اور انسان کو کائنات کے رازوں سے واقفیت کے لیے مواقع فراہم کرے لیکن آج بھی انسان اس سماج میں بنیادی سماجی و مادی مسائل میں الجھا ہوا ہے۔ اسے مسائل سے چھٹکارہ ملے تو آگے کی طرف دیکھ اور سوچ سکے۔ بلاشبہ کولیری مزدور کوئی بڑا کارنامہ سرانجام نہیں دے سکتے لیکن الیاس احمد گدی نے جس طرح ناول کا اختتام کیا ہے وہ انسان کے نوعی تقاضے پر پورا اترتا ہے۔

اگر آج انسان اس بیگانگی سے نکل کر انسانیت کے لیے جدوجہد کریں تو انسانیت بہت جلد ترقی کی منازل پر گامزن ہو سکتی ہے کیوں کہ سرمایہ داریت و جاگیرداریت کا توڑ کمیونزم کے تصور میں ہے جو انسان کو مادی مسائل سے چھٹکارہ دلا سکتا ہے اور اس میں کردار ادا کرنا ہی انسان کا نوعی تقاضا ہے جس سے آج افراد معاشرہ محروم ہیں۔ گدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے بیگانگی اس کے پہلو اس کی وجوہات اور اس کے حل کو ایک ہی ناول کا حصہ بنا کر اپنے فن اور فکر کی کمال مہارت کا اظہار کیا ہے۔ سرمایہ داریت کا رد اور بیگانگی کا علاج بھی بتایا ہے۔

جہنمی لوگ:

ا۔افراد کی سماج سے بیگانگی:

محنت کش کی سماج / انسان سے بیگانگی جدید معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ بنتا جارہا ہے آج معاشرے کا ہر فرد بیگانگی کے عمل کا شکار ہے۔وہ زندگی کی اس دوڑ میں اپنے جیسے انسانوں سے بے پرواہ اپنی ذات کے لیے تگ ودو کرتا دوسرے انسانوں کو اپنے لئے حریف تصور کرتا ہے۔محنت سے بیگانگی، محنت کی پیداوار سے بیگانگی حتمی طور پر انسان کو انسانوں سے بیگانگی پر مجبور کر دیتی ہے۔وہ سماج کا حصہ ہوتے ہوئے بھی سماج سے الگ جی رہا ہوتا ہے۔اس عمل سے معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اس میں طرح طرح کے مسائل سر اٹھانے لگتے ہیں۔ معاشرے کی اقدار ،روایات، قوانین، ثقافت، تہذیبی اخلاقیات برباد ہو کر رہ جاتی ہیں۔ مسابقت میں ہر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی غرض سے دوسرے کو کچلنا چاہتا ہے۔یہ ہمارے معاشرے کا وہ ناسور بنتا جارہا ہے جس کی بنیادوں میں سرمایہ داری نظام فکر کے اصول کار فرما ہیں۔

"ناول جہنمی لوگ" جو سماجی بیگانگی کی اعلیٰ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ناول ہے جس کی تمام اقدار و اخلاقیات تباہ ہو چکی ہیں۔طبقات کے نتیجے میں ندی کنارے رہنے والے انسانوں کی اپنے ہم نفسوں سے بیگانگی کے نتیجے میں ایک اکثریتی آبادی جہنم کی زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ ایسی زندگی جس نے انسانوں سے اس کی انسانیت چھین لی، ان کی اقدار روایات چھین لیں۔ انہیں غربت و افلاس اور جہالت، نفرت بھری زندگی جینے پر مجبور کر دیا۔غربت و افلاس اور جہالت اکیسویں صدی میں بھی دنیا کے لیے ایک سنگین مسئلہ بنتی جارہی ہے جس کی وجہ یہی کار فرما نظام ہے جس نے ایک طرف تو کچھ افراد معاشرہ کے لیے زندگی کی ہر سہولت کو وافر مقدار میں بہم پہنچایا ہے تو دوسری طرف جسم کا روح سے تعلق قائم رکھنے کے لیے بھی زندگی کی ضرورت کا نہ ہونا ایک المیہ ہے،جو انسانیت کے لیے زہر قاتل اور بد نما داغ ہے۔ اسی بد نما داغ کو "جہنمی لوگ" میں شیراز زیدی نے برتنے کی کاوش کی ہے۔بشریٰ رحمان لکھتی ہیں:

> شیراز زیدی کا ناول جہنمی لوگ اسی دنیا کی کہانی ہے جس میں ہم اور آپ بستے ہیں یہ کہانی نئی نہیں ہے۔۔۔ ایسی کئی کہانیاں اس زمین پر بکھری ہوئی ہیں جہاں انسانیت غربت و افلاس کی چکی کے دو پاٹوں میں پس رہی ہے۔۔۔ ایک طرف بلند و بالا محلات اور شاہانہ لوازمات ہیں۔اور دوسری طرف کچھ انسان دن رات کی محنت مشاقہ کے

باوجود پیٹ بھر کے روٹی کھانے کو ترس رہے ہیں۔ ایک طرف دولت ہر بنائے احترام ہے تو دوسری طرف نجابت اور شرافت کا استحصال ہو رہا ہے۔۔۔[۱۳]

غربت، افلاس اور جہالت جس معاشرے کا حصہ بن جائیں وہاں انسانی زندگی کا ممکن رہنا ناممکن بن جاتا ہے۔ طبقات کی یہ تقسیم ہی مسائل کو پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے اور یہی تقسیم انسانوں کو انسانوں سے کاٹ دیتی ہے جس سے سماج اجتمائی طور پر بیگانگی / مغائرت سے دوچار ہو کر زوال کی اور سفر کرتا ہے۔ جب ہم اپنے سماج میں نظر دوڑاتے ہیں تو وہی کہانی جو "جہنمی لوگ" کی ہے حقیقت میں اپنے ارد گرد چاروں اور ہالہ بنائے دکھائی دیتی ہے۔ یہ کہانی ہمارے سماج کی حقیقت بھی ہے اور اس کے پیچھے بلند و بانگ دلفریب نعروں وعدوں کے منھ پر ایک طمانچہ بھی۔

وطن عزیز کو جن بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے آزادی کا نعرہ بلند کیا، الگ وطن کا قیام عمل میں آیا۔ آج وہی وطن عزیز کسی ان دیکھی دنیا کی کہانی بیان کرتا ہے تو دل دہل اٹھتا ہے کہ کیا ہم نے ایک ایسی ہی سر زمین کے لیے جدوجہد کی جس کے ہر انگ میں غربت و افلاس، جہالت، نفرت اور اجنبیت سرائیت کر چکی ہے۔ جہاں انسانوں کا جینا محال ہو چکا ہے، جہاں انسانیت کی تذلیل اس کی قسمت میں لکھ دی گئی ہے، جہاں معاشرہ مختلف گروہوں اور طبقات میں تقسیم ہو چکا ہے، کیا یہ وہی وحدت کا تصور ہے جس کا نعرہ بلند کیا گیا تھا؟ جاگیر دار، سرمایہ دار، مذہبی گروہ اور محنت کشوں میں تقسیم کرنے کے لیے اس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہی کہانی غربت کی، افلاس کی، سرمایہ دار اور محنت کش کی، مذہبی گروہوں کی "جہنمی لوگ" بیان کرتا ہے۔

اس ناول کی کہانی طبقات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غربت و افلاس، جہالت، اخلاقی گراوٹ، اقدار کی شکست وریخت کی کہانی ہے۔ جو کسی معاشرے میں رہنے والے انسانوں کو دو بڑے طبقات میں تقسیم کر کے انھیں اجنبی بنا دیتی ہے، جہاں ہر ایک دوسرے کی محنت پر اپنی عمارت قائم کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ غربت اس نظام زر کی وہ دین ہے جس سے انسان انسانیت سے گر جاتا ہے غربت جہالت کا باعث بنتی ہے جو بذات خود بیگانگی کی عکاسی کرتی ہے۔

نواز جس کے گھر کے گرد کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہے۔ محنت کے باوجود غربت کی زندگی جینے پر مجبور ہے۔ ایسے کئی نواز اپنے خاندان کو دو وقت کی روٹی بھی مہیا نہیں کر پاتے اور اگر ایسے میں کوئی حادثہ ہو جائے یا کوئی بیمار ہو جائے تو ساری زندگی مقروض ہو کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے پیاروں کی زندگی کا علاج تک نہیں کرا سکتے، انھیں دو دن کی دوائی خرید کر نہیں دے سکتے۔ اس طرح یہ بیماری پھیلتے پھیلتے ان کے پیاروں کی جان لے لیتی

ہے جو الگ سے ان کی قمر توڑ دیتی ہے۔ نواز کی بیوی کو ٹی بی کی بیماری ہے جو ابتدا میں کم مگر علاج نہ ہونے کی وجہ سے گمبھیر شکل اختیار کر لیتی ہے اور نواز اس قدر مجبور ہے کہ وہ اپنی بیوی کا علاج نہیں کرا سکتا۔ اللہ دتہ جو نواز کے ساتھ کام کرتا تھا اس کی بیوی کی صحت کا پوچھتا ہے تو نواز کہتا ہے:

> ڈاکٹر کہتا ہے ہر پندرہ دن بعد باقائدگی سے چیک کرانا ہے اور دوا کی پرچی الگ ہاتھ میں تھما دی تھی کہ بازار سے ملیں گی نجانے ہسپتال کی دوائیں کہاں جاتی ہیں؟ پورے سو روپے کی دوا میں نے بازار سے لی تھی۔۔۔ ایک ہفتے کی دوسرے ہفتے کے لیے پیسے بچے ہی نہیں تھے۔ اور پھر اس کی طبیعت بھی کچھ سنبھل گئی تھی اس لئے دوا بند کر دی۔۔۔ اب بتاؤ کہ میں اپنی ڈیڑھ دن کی مزدوری سے جہنم بھروں یا جورو کا علاج کراؤں؟[۱۴]

یعنی غربت و افلاس کی زندگی جینے والے یہ محنت کش جو دن رات کام کرنے پر مجبور ہیں اپنے اہل خانہ کی بیماری کے لیے دوائی مہیا کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ ایسے میں جب غربت سر پر ناچ رہی ہو کوئی انسان بیگانہ نہ ہو تو کیا کرے اس کے پاس اس کے علاوہ اور کیا چارہ ہے کہ وہ لاتعلق ہو جائے کہ کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟

سماج میں انسانوں کی انسانوں سے بیگانگی صرف محنت کش میں ہی نہیں دیگر طبقات میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ سرمایہ دار کی محنت کش سے، محنت کش کی سرمایہ دار سے، متوسط طبقے کو نچلے طبقے سے اور نچلے طبقے کی متوسط طبقے سے، ایک مذہب کی دوسرے مذہبی گروہ سے۔ الغرض ہر سطح پر پھیل جاتی ہے اور ہر طبقہ اپنے سے نچلے طبقے پر اپنی عمارت تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ جیسے ان مزدوروں کا ٹھیکیدار سخت محنت و مشقت کرنے اور مزدوروں کو ظلم سہنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ متوسط طبقے سے ہے جو نچلے طبقے سے نفرت کرتا ہے لیکن انھی کی محنت سے اپنا سر اٹھانا چاہتا ہے ایسے ہی ایک ٹھیکیدار کی کہانی کرم دین بیان کرتا ہے:

> ارے یہ ٹھیکیدار تو پھر کچھ ٹھیک معلوم پڑتا ہے، میں جس کے ساتھ پہلے کام کرتا رہا ہوں وہ تو پورا جانور تھا، کہتا تھا کہ مزدوروں کو دیہاڑی کے دوران پانی بھی مت پینے دو، سست ہو جاتے ہیں، گرمی کی شدت سے جلتے مرتے ہم پانچ پانچ گھنٹے پیڈ پر کھڑے پیاسے کام کرتے تھے، زبانیں ہماری باہر نکل آتیں ہونٹ سوکھ جاتے، کئی بار تو ہم میں سے کوئی بے ہوش ہو کر گر پڑتا مگر وہ ظالم کہتا کہ سارے مکر کرتے ہیں۔۔۔ خدا غارت

کرے کم بخت مزدوروں کو تو انسان سمجھتے ہی نہیں، کہتے ہیں ان سے گدھوں کی طرح جتنا کام لو گے اتنے ہی ٹھیک رہیں گے۔ (۱۵)

طبقاتی معاشرے میں متوسط طبقہ ہمیشہ نچلے طبقے کو کوستا ہے، ان سے نفرت کرتا ہے، جانوروں سے بدتر خیال کرتا ہے، زندگی بھر خود سرمایہ دار بننے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ بطور انسان سب ایک ہی ہیں اور انسانیت کے ناتے ہی سماج کا قیام اور ترقی ہو سکتی ہے۔ وہ بھڑاس اپنے سے کمزور پر غصے ، نفرت اور تعصب سے نکالتے ہیں۔ اس طرح اس نظام میں مزدور اور سرمایہ دار بھی ایک دوسرے سے بیگانے رہتے ہیں۔ مزدور کو نہیں معلوم تھا کہ اس کی محنت کس کی جھولی میں گرے گی اور نہ سرمایہ دار کو اس سے واسطہ ہوتا ہے کہ اس کی اس ملکیت کو پیدا کرنے والا کون ہے۔ یہی کچھ "جہنمی لوگ" میں ہوتا دکھائی دیتا ہے جہاں ٹھیکیدار مزدوروں کا استحصال کرتا ہے۔ اور مزدور اس سے بیگانے ہیں کہ یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ یہ بیچ کا تیسرا شخص تو محض ایک ٹول ہے جو انہیں ظلم کی چکی میں پسنے کے لیے کردار ادا کر رہا ہے۔

جب سماج میں معاشی ابتری ہو تو ایسے حالات میں انسان اپنے قریبی لوگوں حتٰی کہ اپنے خاندان سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے۔ وہ دن رات کی محنت میں مصروف عمل تھوڑا سا وقت بھی اپنے پیاروں کے لیے نہیں نکال پاتا۔ جن کے ساتھ اس کا جینا مرنا اور اٹھنا بیٹھنا ہوتا ہے۔ انھی سے لاتعلق زندگی کی دوڑ میں لگا رہتا ہے ۔بشیراں جو نواز کی بیوی کو ہسپتال ساتھ لے جانے کے لیے نواز کے گھر اس سے ملنے آتی ہے تو زندگی کی مصروفیات کا تذکرہ کرتی ہے۔ نواز بھی صبح کام پر جاتا ہے اور رات کو واپس گھر لوٹتا ہے۔ ایسے میں نہ صرف وہ اپنے ہم جنسوں سے دور بلکہ اپنی ذات سے بھی دور کہیں مشین کا کل پرزہ بن گیا ہے۔ جب بشیراں اس کے گھر آتی ہے تو ان کی گفتگو کچھ اس طرح ہوتی ہے:

> بشیراں تو تو آج کل نظر ہی نہیں پڑتی آج کل، بھائی کو بالکل ہی بھول گئی کیا؟۔۔۔
> بشیراں نے پہلے دانت نکالے۔۔۔لے نوازے کیسی باتیں کرتا ہے تو بھی، بھلا بھائی کو بھی کوئی بھولتا ہے۔ البتہ بڑے دنوں سے اپنی ملاقات نہیں ہوئی، میں نے جنتے سے بھی پوچھا تھا، تجھے چھٹی جو نہیں کام سے۔۔۔فیر اچھا ہے دہاڑی لگی رہتی ہے، مرد ذات ویسے بھی گھر میں بیٹھی کونسی بھلی لگتی ہے۔۔۔اور بات یہ ہے کہ تو رات کو اس وقت آتا ہے۔ میں تجھے دن بھر کے تھکے ہارے کو کیا ستایا کروں۔۔۔ (۱۶)

طبقاتی نظام میں رشتے ہمیشہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار اس بنا پر ہوتے ہیں ہیں کہ معاشی نا آسودگی محنت کش کو زندگی جینے اور سماجی رشتوں میں ہمدردی پیدا کرنے کے قابل نہیں چھوڑتی۔ پورا دن کام کے بعد تھک ہار کر چور بدن کے ساتھ جب گھر لوٹتے ہیں تو آرام کر کے خود کو دوبارہ کام پر جانے کے لیے تیار کرنے اور سونے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ ایسے میں قریبی تعلقات میں دوری اور اجنبیت کا احساس جنم لے لیتا ہے۔ یہی احساس مجموعی سوسائٹی کو جب اپنی گرفت میں لے لیتا ہے تو اس سے سماجی گھٹن اور نا آسودگی کی کیفیات پیدا ہوتی ہیں جو افراد معاشرہ کو بیگانگی سے دوچار کرتی ہیں۔

سوسائٹی جب طبقات پیدا کرتی ہے تو اس سے سماج میں موجود افراد معاشرہ اخلاقی اقدار کی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر ذہنی طور پر نا آسودگی سے دوچار ہوتے ہیں وہ اس سے چھٹکارے کے لیے طرح طرح کے مشروبات کا سہارا لیتے ہیں لیکن وہ سہارا ان کی زندگیوں کو مزید اجیرن بنا دیتا ہے افیون شراب، سگریٹ جیسے نشے میں مبتلا ہو کر وہ خود کو سماج سے بالکل دور کر دیتے ہیں۔ "جہنمی لوگ" کے تمام مرد و خواتین مزدور کسی نہ کسی طرح کے نشے کے عادی ہیں، وہ ذہنی سکون کی تلاش میں نشے کو اپنا لیتے ہیں اور خود موت کے کھڈے کھودنے کے ساتھ ساتھ سماجی بیگانگی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ خود نواز اور بشیر اں بھی اسی نشے کے عادی ہیں لیکن ان سے زیادہ بسنتی کا خاوند نشے میں مبتلا ہو کر گھریلو ذمہ داریوں سے بھی خود کو الگ کر دیتا ہے۔ ایسے میں وہ بچوں کو بھیک مانگنے پر لگا دیتا ہے۔ وہ بچے جنھوں نے شعور حاصل کر کے قوم و وطن کے مستقبل کے لیے اپنی صلاحیتوں کو صرف کرنا تھا بھیک منگے بن کر رہ جاتے ہیں۔ وہ شعوری و غیر شعوری طور پر اپنے مستقبل کو تاریکی میں دھکیل دیتے ہیں، بسنتی کہتی ہے:

> لے حال کیا ہونا کنجر کا، افیم کھائی پڑ گیا، نہ بچوں کا خیال نہ گھر کا ہوش بسنتی کرے جو کچھ کرے، مزدوری بھلے پیشہ، اسے تو کھانے کو افیم اور بھنوڑنے کو پنڈا ملتا رہے کتے کی طرح۔۔۔ ایک اور سنو کل جب میں گھر گئی تو یار و نہ ہو۔۔۔ وہ چھوٹا تخم میرا آخر کا بہت دیر ڈھونڈتی پھری نہ ملا اور وہ حرامی بھی کچھ نہ بولے۔۔۔ آخر کو جب ڈھونڈ ڈھانڈ کے تھک گئی۔۔۔ تو سامنے سے چلا آرہا ہو سلور کے پیالے میں سکے اچھالتا کھیلتا ہوا۔۔۔[۱۷]

اسی طرح ان غریبوں کے بچے بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ نامساعد حالات اور غربت کی چکی میں پیس کر زندگی کی خوشیاں چھین لیتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ حالات نواز کے بیٹے فضل کے بھی ہوتے ہیں جو اپنے

باپ اور بہن کی وفات کے بعد کلو کے کہنے پر بھیک مانگنے نکل کھڑا ہوتا ہے لیکن اسے بھیک دینے والا بھی کوئی نہیں ہوتا۔

جب سماج بیگانگی کا شکار ہو جاتا ہے اور طبقاتی تقسیم اپنے پر پھیلا لیتی ہے تو ایسے میں ہر کوئی دوسرے کی ذات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں اپنے جیسے نوع کے افراد کو کچلنے اور منافع کے لیے تگ و دو میں مصروف رہتا ہے نواز کی موت کے بعد جو پیڈ گرنے کی وجہ سے ہوئی ٹھکیدار نے سرکار سے موت کے نام پر پیسے منظور کرائے لیکن اس کی بیوی بچوں کو نہیں دیے بلکہ خود ہڑپ کرنے کے چکر میں لگا ہوا تھا۔ ایسی ناگفتہ بہ حالت سے جب نواز کا خاندان گزر رہا تھا تو ایک طرف ٹھیکیدار ذاتی فائدے کو حاصل کرنے میں مصروف تھا تو دوسری طرف بستی میں موجود لوگ بھی ان سے لاتعلق تھے۔ کسی کے پاس اتنی آمدنی نہیں تھی اور نہ وقت کہ وہ دو وقت ان کے دکھ درد کو بانٹ سکیں۔ ایسے میں چھیما آگے بڑھ کر کردار ادا کرتے ہوئے جنت کے لیے کام ڈھونڈتی ہے جبکہ ساری بستی اپنی زندگی کی بھاگ دوڑ میں لگی تھی۔

> جنت بولی۔۔۔ چھیما میری بہن کون برا سمجھتا ہے تجھے، میرے دل میں تو تیری بڑی عزت ہے، تجھ میں انسانیت ہے تو میرے بارے میں سوچا ہے ناں تو نے ورنہ ساری بستی میں سے اور کوئی کیوں نہ آ گیا پوچھنے۔۔۔[۱۸]

جب لوگ معاشی ناآسودگی، غربت اور بے شعوری کی زندگی جینے پر مجبور ہوں تو ایسے میں انہیں سماج میں بسنے والے دیگر انسانوں سے کوئی لینا دینا نہیں ہوتا وہ اپنے جیون کے لئے دوڑ دھوپ میں سماج اور انسانوں سے لاتعلق بن جاتے ہیں۔

زندگی خواہشات کے ساتھ جینے کا نام ہے اور انسان خواہشات پالتا ہے اس کا سینہ لاتعداد خواہشات کا معدن ہوتا ہے جہاں سے خواہشات جنم لیتی ہیں۔ کبھی ایک خواہش تو کبھی دوسری۔ کوئی پوری ہوتی ہے تو کوئی ادھوری رہ جاتی ہے لیکن یہ خواہشات انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ یہ خواہشات بھی طبقاتیت سے جنم لیتی ہیں اور اسی کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ ایک طرف ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو وہ سوچتا ہے وہ اسے مل جاتا ہے ،اس کے لئے اسے کسی جدوجہد کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی لیکن دوسری طرف پرولتاریہ ساری زندگی پیٹ کا جہنم بھرنے میں لگے رہتے ہیں۔

یہاں خواہشات کا وجود ہی نہیں ہوتا وہ تو محض ضرورت پوری کرنے کے لیے جیتے ہیں وہ بھی ان کی پوری نہیں ہو پاتیں۔ ایک طرف سماج ذلت کے گڑھوں میں گھرا ہوتا ہے تو دوسری طرف عیاشیاں ہوتی

ہیں۔ایک طرف لوگ گندے ندی نالوں اور کچی بستیوں میں رہتے ہیں تو دوسری طرف فائیو سٹار لائف اسٹینڈرڈ کے تحت زندگی جی جارہی ہوتی ہے۔ یہ سماجی بیگانگی ہی ہے کہ سماج دو الگ الگ ایک دوسرے سے لاتعلق طبقات میں زندگی گزارتا ہے۔ نعمت اپنی ماں جنت سے ایک ایسی ہی خواہش کرتے ہوئے کہتی ہے:

اماں مجھے لیتی جاتی تو اچھا ہوتا، میں بھی کوٹھی دیکھتی، بستی کے کسی بچے نے نہیں دیکھی۔ جنت نے ٹھہرتے ہوئے اسے ٹوکا۔۔۔ نہیں میری بچی میں نے صبح بھی سمجھایا تھاناں مجھے جانے کتنی دیر ہو جائے۔[۱۹]

اقتباس ایک طرف جہاں بچی کی معصوم خواہش کی عکاسی کرتا ہے وہیں اس جبر، ناہمواری اور لاتعلقی کو بھی بیان کرتا ہے جس نے ہمارے سماج میں موجود انسانوں کو منقسم کر رکھا ہے۔ایک طرف بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہوتیں اور دوسری طرف زندگی کی ہر عیش موجود ہے۔ایک طرف کچی بستی میں لوگ سڑ رہے ہیں تو دوسری طرف بلند و بالا عمارات اپنا حسن نکھارے غریبوں کے جذبات کا استحصال کر رہی ہیں:

غربت طبقات اور ذاتی ملکیت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے اور اس سے بیگانگی جنم لیتی ہے۔ جنت کی زندگی جس بدحالی میں گزر رہی تھی اس کا اظہار ناول میں بخوبی ہوا ہے۔اور ساتھ ہی ساتھ انسانوں کی بے حسی بھی اپنے جلوے بکھیرتی نظر آتی ہے۔جہاں سماج باہمی تعاون سے آگے بڑھنے کے بجائے صرف ذاتی زندگیوں تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔چندے کے پیسوں سے بچی کے کفن دفن کا انتظام ہوتا ہے۔ ایسے میں جنت جب اسے گھر پر رہنا چاہیے تھا وہ مزدوری کرتی ہے۔لوگوں کو اس کے دکھ میں شریک ہونا چاہیے تھا روزگار میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ چھیما اسے سمجھاتی ہے کہ وہ دوبارہ سے کام پر جائے۔ بستی کے لوگ پہلے ہی غربت و افلاس کی زندگی جیتے ہیں، تجھے پوچھنے والا کوئی بھی نہیں۔ بھوک، بیماری اور جہالت نے انہیں سسک سسک کر مرنے اور بے حسی کے جیون کو بسر کرنے میں پھنسا کر رکھا ہے۔ایسے میں تجھے اپنے اور بچے کے لیے جانا ہو گا۔

چھیما کہتی ہے یہ سماج ایسا ہی بے حس ہو چکا ہے۔ بارہ سال کی عمر سے در در کی ٹھوکریں اور جنسی استحصال نے سماجی اور انسانی رویوں سے خوب آشنا کیا ہے۔اس لئے یہ کوئی نئی بات نہیں کہ بستی والے تجھے بھول چکے ہیں۔ شیراز زیدی نے غربت و افلاس کے اس ستائے معاشرے کے ساتھ ساتھ طبقایت اور افراد

معاشرہ کی نفسیاتی الجھنوں کو بھی انھی کرداروں کی صورت میں خوب برتنے کی سعی کی ہے۔ڈاکٹر ممتاز احمد خان لکھتے ہیں:

> نوجوان ناول نگار شیر اززیدی کا مختصر ناول جہنمی لوگ اس اعتبار سے لائق اعتنا ہے کہ انھوں نے غربت و افلاس کے مارے لوگوں کی بستی کو مرکز بناتے ہوئے ان کی جہنم ٹائپ زندگی کی عکاسی کی ہے۔اس ناول کو ترقی پسندانہ رجحان کے تحت رکھ کر دیکھنا چاہیے ہمارا معاشرہ جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے دکھوں،المیوں اور چھوٹی سی اور مختصر سے لمحوں میں معدوم ہو جانے والی خوشیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے۔لہذا غربت و مفلسی کے تمام سروکاروں کے حوالے سے یہ ناول شوق سے پڑھا جاسکتا ہے۔(۲۰)

شیر اززیدی نے ناول میں جس طرح سے ہمارے طبقاتی سماج کی خود غرضی، جہالت، غربت، افلاس، نفرت، محبت، عداوت، اجنبیت، مغائرت کے عناصر کو سمویا ہے وہ قابل تعریف ہے۔اگر اس ناول کو مارکسی بیگانگی کا شاہکار کہا جائے تو بے جانہ ہو گا جس نے سماجی بیگانگی کے ہر پہلو کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے اور اقتدار کے پجاری لوگوں کی زندگیوں سے بے خبر نیند میں مدہوش۔وہ ایک طرف اس طبقے کی زندگیوں سے بیگانے ہیں تو دوسری طرف کسی سماجی تعمیر کو بھی در غور اعتنا نہیں سمجھتے جو انسانوں سے انسانوں کی بیگانگی کی واضح مثال ہے۔

۲۔افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی:

محنت کش کی انسانوں سے بیگانگی کا حتمی اور کلی نتیجہ انسانی تقاضوں سے بیگانگی ہے انسان کے نوعی تقاضوں سے مراد اس کا شعوری عمل ہے یعنی تخلیقیت کا عمل۔نوعی بیگانگی عموماً نظر نہیں آتی اور اسے سماج میں سمجھنا ایک مشکل عمل ہے تاہم جب افراد معاشرہ انسانی اقدار اور تصورات سے عاری دکھائی دیں تو اس سے ان کی نوعی بیگانگی کو سمجھا جاسکتا ہے۔

انسان اس کائنات میں دیگر جانوروں سے خود کو ممتاز شعوری عمل کے ذریعہ سے کرتا ہے۔مگر وہ اس شعوری عمل کے بغیر زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔یعنی اس کا عمل آزادانہ بنیادوں پر اس کی نوع کے اعتبار سے ہونے کے بجائے جبر یا مجبوری کی بنیاد پر ہو اور ہمیشہ ایک ہی سمت میں رہے تو وہ جانوروں کی سطح پر آجاتا ہے انسان، انسان اس لیے ہے کہ اس کا دوسرے انسانوں سے ہمدردی تعاون اور انسانی بنیادوں پر ایک رشتہ قائم

ہے اسی بنیاد پر وہ محنت / شعوری عمل کو بروئے کار لا کر ترقی کی منازل طے کرتا ہے اور خارجی زندگی سے روحانی تسکین حاصل کرتا ہے لیکن آج ہمارے سماج میں نوعی تقاضے یکسر بھلا دیے گئے ہیں۔

انسان باہمی تعاون کے ذریعے سے ہی زندگی کو کامیاب بنا سکتا ہے۔ اگر وہ صرف اپنی ذات تک محدود ہو کر رہ جائے تو اس کی زندگی جانوروں کی زندگی کے مترادف ہے۔ "جہنمی لوگ "میں انسان جانوروں کی زندگی جینے پر مجبور کسی عمل کو آزادانہ بنیادوں پر کرنے سے یکسر محروم ہو چکے ہیں۔ ناول کی ابتدا سے ہی جب نواز اپنی بیوی کی بیماری کی کہانی بیان کرتا ہے تو ساتھی مزدور کہتے ہم تیری کسی بھی طرح سے مدد اس لیے نہیں کر سکتے۔ ہماری مجبوری ہے ہم تیرے حق میں آواز بلند کریں گے تو اس سے اپنے ہی چولہے ٹھنڈے پڑ جائیں گے، ہماری حالت بھی تیرے جیسے ہی ہے۔ اس خیال سے یہ اخذ کرنا مشکل نہیں کہ انسان کو دوسرے انسان کی مدد کرنی چاہیے یہی انسانیت کا تقاضا ہے اور اسی بنیاد پر جانوروں سے الگ بھی ہیں لیکن ایسا کر نہیں پاتے کیونکہ وہ ایک جبر کے سماج میں اپنی زیست کے دن گننے پر مجبور ہیں۔

انسان اپنی ذہنی اور روحانی تسکین کے لئے عقیدے کو اختیار کرتا ہے تاکہ اس خارجی دنیا سے الگ اپنی روحانی خواہشات کو بروئے کار لا سکے۔ وہ مذہبی تعلیمات پر عمل کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کے ذریعہ سے اپنی ذات سے خدا تک رسائی حاصل ہو سکے۔ یہ رسائی اس کی تکمیل ذات کا باعث بنے گی مگر سرمایہ دارانہ نظام نے اس روحانی تسکین کے ٹول کو بھی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لوگ اپنے مذہب سے بھی بیگانے ہوتے جا رہے ہیں وہ مادی الجھنوں میں روحانی رشتوں کو یکسر بھول چکے ہیں۔ مزدوروں کی آپس کی گفتگو کو شیراز زیدی نے کچھ یوں بیان کیا ہے:

> ابے تو ہمارے اعمال بھی تو خراب ہیں پتہ نہیں جنت نصیب ہو گی یا نہیں؟۔ زرا بتاؤ تو ہم میں سے کتنوں نے قرآن پڑھا ہے؟ رشید نے ایک لمحے کو رک کر سب کے چہروں کو غور سے دیکھا اور ان کے خاموش رہنے پر بات جاری رکھی۔ ارے ہم سب ہی ایسے ہیں اور اگر تم مذاق نہ اڑاو تو ایمان سے مجھے تو نماز بھی بھولتی جا رہی ہے۔ (۲۱)

انسان کا مذہب سے لگاؤ ہوتا ہے اور اسی مذہبی عقیدے کو روحانی رشتے سے منسلک کرتے ہوئے انسان تحصیل ذات کی تکمیل کرنا چاہتا ہے لیکن آج وہ اپنے نوعی تقاضوں سے بھی بیگانہ ہے۔ کسی عقیدے کو اپنانا اس کے لیے سکون اس کی سماج میں زندگی کے لیے رہنمائی کا باعث بنتا ہے لیکن سرمایہ دارانہ نظام نے اسے بھی نگل لیا ہے۔

اسی طرح جب نواز کی موت ہوتی ہے تو اس کے گھر پر روٹی کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اس کی فاتحہ خوانی کے پیسے تک نہیں ہوتے، ایسے میں چھیما انسانی ہمدردی کی مثال بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ حالات کے نامساعد ہونے کے باوجود ابھی انسانی اقدار کی حامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی ذات کو اپنے جسم کو بیچنے کے بعد ہی روزی روٹی مہیا کرتی۔ اس ناول کی خواتین مزدور اپنی محنت کے ساتھ اپنا جسم بھی بیچنے پر مجبور ہیں لیکن ان کے یہاں انسانیت کی رمق باقی ہے مگر نوعی تقاضوں سے بے خبر ہیں یہ دل دہلا دینے والی کہانی ہے۔

چھیما جنت کو کام کرنے کے لیے نصیحت کرتی ہے اور سوسائٹی کے معیارات سے آگاہی دیتی ہے۔ اس کی عدت پوری نہیں ہوئی ہوتی اس لیے اس کے لیے گھر سے باہر کام کرنا ممکن نہیں ہوتا لیکن حالات اس قدر شکستہ ہیں کہ کام کیے بغیر زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ چھما اور جنت کی آپس کی گفتگو اور ناول کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت ایک گھریلو خاتون ہے اور مزدوری کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ اب وہ بیماری سے بھی گزر رہی تھی اس لیے کسی سخت کام کی توقع بھی مشکل تھی۔ اسے کوٹھی میں کپڑے دھونے کا کام ملا تھا لیکن اگر وہ عدت پوری کئے بغیر گھر سے نکلے گی تو مولوی صاحب کی طرف سے کسی فتوے کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔ یہی خدشہ جب وہ چھما سے بیان کرتی ہے تو پھر وہ کہتی ہے:

> ہاں تو مولوی بھڑوا بھجوادے نا تجھے دو وقت کی روٹی اگر فتویٰ لگائے گا تو۔۔۔ اور خدا کو کیا معلوم نہیں تھا کہ نواز مر گیا تو اس کی بیوی بچے کہاں سے کھائیں گے۔۔۔ ان کا کون بیٹھا ہے دینے والا اگر پھر بھی نافرمانی ہوتی ہے تو ہونے دے یہاں کا جہنم سہ لیا تو وہاں کا بھی بھر لیں گے۔۔۔ میری بہن مذہب بھی روپے کے ساتھ چلتا ہے، غریب کا کیا دین کیا دھرم مر گئے مردود نہ فاتحہ نہ درود۔۔۔ ہونہہ (۲۲)

یہاں چھیما کے مذہب کے حوالے سے خیالات و جذبات یہ بتاتے ہیں کہ آج انسان اپنی ضرورت زندگی میں الجھے ہوئے ایک جہنم میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور یہی جہنم بھری زندگی انھیں نوعی تقاضوں سے بیگانہ کیے ہوئے ہیں۔

جب انسان مادی زندگی کی الجھنوں میں پھنس کر رہ جاتا ہے تو ایسے میں وہ اپنی زندگی سے تنگ ہو کر طرح طرح کے نشے کرنے لگتا ہے۔ یہ نشے کی لت اسے اس کے شعور سے بھی عاری بنا دیتی ہے۔ وہ جس سکون کی تلاش میں نشہ کرتا ہے وہ اس سے اس کی انسانیت کو چھین لیتا ہے۔ "جہنمی لوگ" کے کئی کردار نشے کی لت سے اپنی زندگی کو برباد کرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں لگتا ہے سکون کے لیے نشہ کرنا ضروری ہے حالانکہ ذہنی و

جسمانی سکون تب میسر ہو گا جب مادی ضروریات سے چھٹکارا ملے گا اور وہ اپنے قیمتی وقت کو کسی عمدہ کام میں صرف کریں گے۔ یہی وقت کا بہتر استعمال انہیں روحانی خوشی سے ہم کنار کر سکتا ہے۔ شیراز زیدی نے طبقایت پیدا ہونے کے اسباب اور اثرات کو پوری جانفشانی سے ناول میں سمو دیا ہے۔ انھوں نے واضح کیا کہ کس طرح سے افراد معاشرہ میں ذاتی ملکیت کے تصور سے طبقایت کے پیدا ہونے اور سماجی اور نوعی بیگانگی کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

جنت اس معاشی ذلت کے سماج میں اپنے سگے بھائی کو جو مر رہا تھا دیکھنے کے لیے آگے نہیں بڑھتی کہ اس کا بوجھ وہ سہار نہیں سکے گی۔ وہ اپنے نوعی تقاضے کو بھی اسی ذلت کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے:

> غریب عورت کچھ لمحوں تک حواس باختہ اس کی صورت دیکھ رہی جو بالکل پچک سی گئی تھی اور پھر مجمع سے تڑپتی ہوئی نکلی۔۔۔ہائے یہ میرا بھائی کب ہے،وہ تو لڑ لڑ کے جانے کہاں چلا گیا تھا، یہ تو کوئی لاوارث پاگل ہے۔ جسے سرکار خود دفن کر دے گی البتہ یہ میرے بھائی سے ملتا جلتا تھا۔ (۲۳)

تعلیم انسان کے لیے شعور کا باعث بنتی ہے یہی شعور انسان کو دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتا ہے۔ اگر سماج کے افراد کو شعور زندگی حاصل نہ ہو سکے تو ان کی اور دوسری انواع کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ وہ بھی جانوروں کی طرح صرف کھاتے پیتے افزائش نسل کے عمل سے گزر کے مر جاتے ہیں۔ فرق کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے شعور و عمل کے ذریعے سے اپنی نوع اور دوسری انواع کے لئے کارگر ثابت ہو، فطرت کو مسخر کرنے کی کوشش کرے۔ اسی حوالے سے قرآن میں آتا ہے کہ زمین کی سیر کریں۔ یعنی فطرت کو پرکھے اور اسے استعمال میں لا کر انسانیت کے لیے فائدہ مند بنائے لیکن آج کا سماج اس میں بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔

جس کے پاس شعور کا مادہ ہے وہ بھی اپنی نوعی تقاضوں کو سرانجام نہیں دے رہا جیسے ناول میں صحت کے حوالے سے کافی اہم موضوع کو بیان کیا گیا ہے۔ غریب کے لیے صحت کی سہولیات میسر نہیں ہیں وہ جن سرکاری ہسپتالوں میں علاج کے لیے جاتے ہیں وہاں ان کو نہ تو دوائی کی سہولت ہے اور نہ ہی ڈاکٹرز اپنا نوعی تقاضے انجام دے رہے ہیں۔ وہ مریضوں کو دیکھنے کے بجائے محض برائے نام تنخواہ لیتے ہیں ان کا کام جان بچانا ہوتا ہے لیکن وہ مریضوں کا علاج کرنے کے بجائے منافع کے لئے انہیں کلینک پر آنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ڈاکٹروں کی بھی بذات خود ایک الگ گینگ ہے جو اپنے نوعی تقاضوں سے یکسر منافع کے لیے مریضوں کے استحصال کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔

غربت انسان کو اس کے نوعی تقاضوں سے محروم کر دیتی ہے۔ یہ عفریت انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں چھین لیتی ہے نواز اور جنت کے بچے جو پیسے نہ ہونے کی وجہ سے سکول نہیں جا سکتے تعلیم حاصل کر کے سماج کے لیے کارآمد نہیں بن سکتے ظاہر ہے کہ غریب معاشرے کے افراد زندگی کے اہم ترین پہلو سے تہی دامن ہیں۔ وہ جہالت کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور یہی جہالت انہیں سماج میں مختلف جرائم اور اخلاقی گراوٹ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وہ کچی بستی میں گندگی کے ڈھیروں میں رہنے پر مجبور ہیں جنھیں دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی کیسے ممکن ہے کہ کسی نوعی تقاضے کو سرانجام دے سکیں۔ نوعی تقاضے کی انجام دہی کے لیے ضروری ہے کہ انسان بنیادی ضروریات زندگی سے سے آزاد ہو تا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بھرپور طریقے سے بروئے کار لا سکے۔

نواز اور جنت کے گھر کو بنیاد بنا کر جہاں شیراز زیدی نے ایک بستی کی کی تصویر کشی کی ہے وہیں یہ آج کے سماج کے ہر گھر کی کہانی ہے ان کی بیگانگی سماج بھر کی بیگانگی ہے۔ وہ بیگانگی ذات کا شکار ہیں۔ زندگی کی دوڑ میں انسانیت کو کھو چکے ہیں۔ ایسی کئی مثالیں اس میں موجود ہیں جو آج کے انسان کی بیگانگی کی کی کہانی سناتی ہیں ، سلیم شہزاد "جنت کا جہنم" میں لکھتے ہیں:

> نواز اور جنت کا کردار جس باہمی یگانگت کا متقاضی ہونا چاہیے تھا اس سے بڑھ کر بیگانگی یگانگت کو پیش کرنا نظر آتا ہے مگر یہ بیگانگی کرداروں کی بیگانگی نہیں اس رویے کی بیگانگی ہے جس نے اس کردار کو جنم دے کر جہنم واصل کیا۔ (۲۴)

شیراز زیدی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس مختصر سے ناول میں میں ہمارے سماج کے ان رویوں کی کی عکاسی کی ہے جن کا شکار ہو کر معاشرہ ذلت کا شکار ہو جاتا ہے۔ انھوں نے مزدوروں کی زندگی سے نقاب کشائی نہیں کی بلکہ اس سرمایہ داری نظام کی ناکامی اور دعووں کے برعکس استحصال کے شکار افراد معاشرہ کی زندگیوں کی بھی عکاسی کی ہے۔ یہ کسی ایک بستی کی کہانی نہیں اور نہ ہی کسی نواز یا جنت کے گھر کی کہانی ہے یہ کہانی آج کے جدید سرمایہ داری نظام کے زیر اثر ہر گھر کی کہانی ہے۔ آج کے انسان جس کرب، دکھ تکلیف اور نامساعد حالات کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں اس کی مثال تاریخ میں بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جو استحصال آج سرمایہ داری نظام میں موجود ہے پہلے کے سماج میں نہیں تھا۔ یہ نیم جاگیر داری و سرمایہ داری نظام ہی آج کے

اس سماج کی بربادی کا ذمہ دار ہے۔ بلاشبہ اس استحصال نے عوام کی گردنوں کو اپنے قبضے میں کر رکھا ہے مگر بسنتی اور اور چھما جیسے کئی کردار موجود ہیں جو اس نظام کو توڑ کر نئے نظام کو قائم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ یہ طبقایت کس طرح سے لوگوں کا استحصال کرتی ہے یہی کمزوری سرمایہ داریت کو گھٹنے ٹیکنے کے لئے مجبور بھی کرے گی۔

خس وخاشاک زمانے:

"خس وخاشاک زمانے" سماجی، سیاسی، تہذیبی الغرض ہر موضوع کو سمیٹے ہوئے ایک بہترین ناول قرار دیا جاسکتا ہے۔ اکیسویں صدی میں منظر عام پر آنے والے چند بہترین ناولوں میں "خس وخاشاک زمانے" بھی شامل ہے۔ یہ ایک طویل تاریخ پر مبنی طویل ناول ہے جس کا انداز بیان اور زبان بھی قابل تعریف ہے۔ تاہم بعض حصے / جہگوں کا ذکر کرتے ہوئے تکرار کا عنصر بھی نظر آتا ہے اس کے باوجود "خس وخاشاک زمانے" نے ہر ہر موضوع کو اپنے اندر سمیٹا ہے اور بھرپور انداز میں اس کا اظہار کیا ہے۔ یہ ایک کرداری ناول ہے اور کرداروں کے ذریعے سے ہی کہانی آگے بڑھتی ہے۔ ناول کے تمام کردار اپنی جگہ مکمل ہیں اور قارئین کے ذہین پر انمٹ نقش ثبت کر جاتے ہیں۔

ناول میں آزادی سے قبل کے ماحول، آزادی کے واقعات، مارش لاء، سقوط ڈھاکہ اور نائن الیون جیسے اہم واقعات کا بیان ہے۔ مذہبی شدت پسندی وبنیاد پرستی اور اسلام / مسلمانوں کے خلاف برتا جانے والا رویہ اور سامراجیت کے ہاتھوں میں یہاں کے مقتدر طبقے کے استعمال ہونے کا تذکرہ بھی بھرپور ہے۔ اپنی تہذیب ومعاشرت اور سماجی حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ امریکہ اور کینیڈا کی صورت حال کا بھی بیان دلچسپی سے خالی نہیں۔ رفعت رفیق اپنے مقالے "عالمگیریت اور اُردو ناول" میں لکھتے ہیں:

> عالمگیریت کے اہم موضوعات تہذیب ومعاشرت اور معیشت ہیں۔ تہذیبی حوالے سے یہ ناول پنجاب کی قدیم اور خالص معاشرت کو پیش کرتا ہے وہیں امریکہ کی معاشرت یعنی وہ تہذیب جو عالمگیریت پوری دنیا پر مسلط کرنا چاہتی ہے اس کا بیان بھی تفصیلاً ملتا ہے۔ اور سرمایہ دارانہ معاشرے کی واحد کاروباری اخلاقیات جو منافع کے گرد گھومتی ہیں۔ (۲۵)

ناول میں تہذیبوں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے اثرات اور مغائرت کا بھی ذکر ہے۔ خاص طور پر افغانستان میں روسی فوج کے خلاف تیار کردہ جہادی اور پھر اس کے نتیجے میں امریکہ کا اپنے ہی ٹاوز تباہ کر کے

پوری دنیا کو دہشت گردی کے نام نہاد بوجھ تلے دبانے کا عمل جس سے سماجی سطح پر مغائرت کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ بالخصوص انعام اللہ کے ساتھ کار میں پیش آنے والے واقعات اس چیز کی دلیل ہیں کہ جان بوجھ کر ایک مسئلے کو کھڑا کیا گیا۔ اس مسئلے کو کھڑا کرنا محض مذہبی اختلاف نہیں بلکہ سامراجی طاقتوں کے معاشی مقاصد ہیں۔ انھی معاشی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے دنیا میں ایک نئی جنگ اور تہذیبوں کے ٹکراؤ کو پیدا کیا گیا۔ عراق میں ہونے والی بمباری اور افغانستان کی خستہ حالی اس کا واضح ثبوت ہیں۔ یہاں سماجی و نوعی بیگانگی مارکسی نقطہ نظر سے "خس و خاشاک زمانے" کے حوالے سے دیکھی جائے گی۔

ا۔ افراد کی سماج سے بیگانگی:

سماجی بیگانگی کی بنیادیں سماج میں قائم معاشی نظام کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ جس طرز کا سماج میں نظام قائم ہو گا وہاں کے افراد معاشرہ کی زندگی بھی ویسی ہی ہو گی۔ آج ہمارے معاشرے میں ہر فرد دوسرے سے بیگانہ دکھائی دیتا ہے، یہ بیگانگی محض طبقاتی نظام کی دین ہے۔ جہاں افراد معاشرہ ایک بہت بڑے مسئلے سے دو چار اس لیے ہیں کہ محنت کش اپنی بنیادی ضروریات زندگی کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اور اُن کے اوپر مسلط وہ طبقے ہیں جنہیں سرمایہ دار اور ملکی سطح پر سامراج کہا جاتا ہے۔ سرمایہ دار سماج کے نچلے طبقوں کو تقسیم کر کے اُن پر حکمرانی کرتے ہیں تو سامراج ملکوں پر اپنی دھاک بٹھاتا ہے۔ ایسے حالات میں افراد معاشرہ معاشی تنگی اور نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو کر بنیاد پرستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جس سے وہ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں سے مغائرت کا شکار ہوتے ہیں انھیں اپنا حریف تصور کرنے لگتے ہیں۔

"خس و خاشاک زمانے" بنیادی طور پر ایک سماجی ناول ہے جس کے پس پردہ معاشی محرکات ہیں۔ اگرچہ اس میں ذات پات، مذہب، حلال و حرام، جنسیت جیسے موضوعات کا تذکرہ ہے۔ اس کے باوجود جب اس سارے منظر نامے کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں معیشت اہم کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل برصغیر کے عوام جہاں ایک عرصے سے مل کر رہا کرتے تھے وہیں سامراجی طاقت نے اُن میں مذہبی دراڑیں ڈال کر انھیں معاشی لحاظ سے کمزور کر دیا تھا۔ صدیوں سے اکھٹے رہنے والے برطانوی سامراج کے یہاں قیام کے بعد سے ایک دوسرے کے جانی دشمن بن گئے جس کے لیے مذہب بطور ٹول استعمال ہوا۔ پھر آزادی کے واقعات میں قتل و غارت گری اور لوٹ کھوٹ اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ معاشی مسئلے نے بہت سے مسائل کو جنم دیا۔ یہاں سے دولت کے انبار لوٹ کر سمندر پار پہنچا دیے گئے، یہاں کے عوام میں اختلاف پیدا کر کے

ایک ہی جگہ رہنے والوں کو تقسیم کر دیا کہ فلاں طبقہ تمھارے حقوق کو لوٹ رہا ہے۔ایسے ہی انسانوں کی انسانوں سے بیگانگی کی ایک مثال ہمیں اس ناول میں آزادی کے واقعات سے ملتی ہے اور پھر نائن الیون کے واقعے تک ہمیں اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

سروسانسی ناول کا ایک اہم ترین کردار ہے۔ناول میں سانسی نسل کی زندگی کی تمام تصویروں کی خوب صورت عکاسی کی گئی ہے۔سانسی نسل کسی عقیدے کے ماننے والے نہیں اس لیے انھیں سماج میں کوئی خاص مقام عطا نہیں کیا جاتا۔انھیں سماج میں حقیر طبقے کے طور پر جانا جاتا ہے اور یہ طبقات میں بٹ کر اپنی نوعی زندگی سے یکسر بیگانے ہو چکے ہیں۔ان کی بستیوں اور اخلاقیات کا تذکرہ تارڑ نے بہترین انداز میں کیا ہے کہ یہ کس طرح ذلت بھری زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔یہ صدیوں سے ایسی ہی زندگی گزار رہے ہیں اور کوئی خاطر خواہ تبدیلی ان میں واقع نہیں ہوئی۔وجہ صرف اُن کے پاس کسی بھی طرح کے ذرائع پیداوار کا نہ ہونا ہے۔وہ مانگ تانگ کر زندگی گزارتے ہیں اور اب یہ ان کی نفسیات کا حصہ بن چکا ہے کہ وہ خود کو سماج کا ذلیل ترین طبقہ سمجھنے پر مصر ہیں۔بخت جہاں شراب کے حصول کے لیے جب سروسانسی کے یہاں جاتا ہے تو وہ اپنے آپ کو بطور انسان پیش کرنے کی جگہ جانوروں کی سطح پر لے جاتا ہے:

> سروسانسی وہیں پتھر ہو گیا۔وہ اُس کے قدموں میں لوٹنا چاہتا تھا پر اُس میں اُسے جان کا خدشہ تھا کہ کہیں بخت جہاں اُس کی گردن دبوچ کر دبا نہ دے۔چوہدری تو پھر ایک مہمان جاٹ ہے۔میں نے تو آج تک کسی کشمیری، شیخ یا لوہار ترکھان کو بھی چھونے کی جسارت نہیں کی۔میں پلید مٹی کا کوزہ، بھلا تیرے قریب آسکتا ہوں۔تو حکم کر۔(۲۶)

کسی بھی سماج میں قائم ذات پات کی بنیاد ہمیشہ معیشت ٹھہرتی ہے۔جس طبقے کا معاشی سلسلہ بہتر تھا وہ اعلیٰ طبقہ کہلایا اور جو معاشی اعتبار سے کمزور تھے وہ حقیر طبقے کہلائے۔یوں ان طبقات میں اس فرق نے انھیں بطور انسان ایک دوسرے سے جدا کر دیا اور ان میں سماجی دوری نے جنم لیا۔سروسانسی بخت جہاں سے ہاتھ نہیں ملا سکتا اُسے چھو بھی نہیں سکتا۔یہ بطور انسان اور سماج کے غیر فطری سا ہے کہ کس طرح انسان اپنے ہی جیسے انسانوں کو چھونے سے بھی گریز کرتے ہیں۔اعلیٰ ذات / سرمایہ دار نچلے طبقوں اور نچلے طبقے بالائی طبقات کو اپنے سے الگ مخلوق تصور کرتے ہیں۔

سانسی نسل کے لوگ مردار اشیا کو کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔تارڑ نے اُن کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہ اپنی ان نسلی اور صدیوں سے رچی بسی نفسیات کے تابع رہتے ہیں اور اب اُن کی

اصلیت / فطرت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ وہ سات سمندر پار جا کر بھی اپنی اُس آبائی جبلت اور بنیادی تربیت کو نہیں بھول سکے۔ گاؤں میں جب کوئی بیل وغیرہ مر جاتا تھا تو چیلوں اور گدھوں کے ساتھ ساتھ سانسی بھی اُس پر ٹوٹ پڑتے تھے اور ایسے میں وہ اپنے جیسے دیگر انسانوں کو بھی بھول جاتے تھے۔ پیٹ کی یہ آگ انھیں اپنے جیسے دیگر انسانوں سے قطعی لاتعلق کر دیتی ہے۔ ایک مرتبہ سانسی ایک بیل کو کاٹنے کے لیے بھاگتے ہیں اور جب بیل کو کاٹ رہے ہوتے ہیں ایک سانسی کی ٹانگ بھی کاٹ دیتے ہیں۔ انھیں احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ہی جیسے ایک انسان کو کاٹ کر جانوروں کی طرح اس گوشت پر ٹوٹ چکے ہیں۔ داروسانسی جو سروسانسی کا سسر بنتا ہے بھوک اور مردار کی لذت لینے کے لیے بیل کے ساتھ چمٹا ہوا تھا کہ سروسانسی کے کلہاڑی نے اُس کی ایک ٹانگ کو اُس سے الگ کر دیا۔

> بیل کے ساتھ بیل ہوئے داروسانسی کو اس کی سروسانسی کی بھنگ کے نشے میں دُھت کلہاڑی الگ سے نہ پہچان سکی۔ اور اس کا تیز پھل اُس کی ٹانگ میں اتر گیا۔ دارو کی دل دوز چیخ سے وہ سنگلاخ ویرانہ گونج اٹھا۔ نیولے، کرلے، سانپ اور بچھو اپنی آماجگاہوں سے باہر آ گئے پر سروسانسی نے یہی سمجھا کہ اُس کے چاچے نے ایک طویل مدت کے بعد مردہ خون کے لوتھڑوں کو اپنی حلق میں سے اتارا ہے اس لیے چیخ و پکار کر کے مسرت کا اظہار کر رہا ہے۔ (۲۷)

انسان کی انسان سے یا سماج سے بیگانگی مذکورہ اقتباس میں واضح ہوتی ہے کہ جب کسی فرد کو اس کی بنیادی ضرورت اور عمل سے محروم کرنے سے برابر حصہ نہیں ملتا تو وہ دوسروں کو کچل کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اُسے اپنے جیسے دیگر انسان اپنے حریف کے طور پر نظر آتے ہیں۔ جیسے مذکوہ اقتباس میں بیل تک رسائی کے لیے کئی سانسی دوڑ دھوپ میں لگے تھے اور اسی اثنا میں داروسانسی کی ٹانگ بھی ضائع ہو جاتی ہے اور وہ چیخ پکار کرنے لگتا ہے۔ باقی تمام سانسی اپنی کارروائی میں لگے ہوتے ہیں انہیں خیال ہی نہیں ہوتا کہ یہ بوڑھا داروسانسی کیوں چیخ و پکار کر رہا ہے۔

امیر بخش کوٹ مراد سے روزگار کی تلاش میں نکلتا ہے اور خوشی محمد گوندل کے پاس جاتا ہے جہاں اُس سے انتہائی ذلیل حرکت کی جاتی ہے اور وہ اپنی پشت پر خوشی محمد گوندل کے کتوں کے نشان لیے لاہور شہر آتا ہے۔ لاہور میں گلی گلی پھرتا ہے لیکن اُسے روزگار حاصل نہیں ہوتا ایسے میں اسے اپنا گاؤں یاد آتا ہے۔ اُس کی بہتی ہوئی نہریں، آب و ہوا، چرند پرند اور دیگر حیات اُس کے ساتھ سفر کرتی ہیں اور بار بار جب اُسے کسی

ٹھوکر کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو گاؤں اور ماں کے ہاتھ کی بنی روٹی اور وہ آزادی اُسے یاد آتی ہے جہاں تمام پریشانیوں سے آزاد زندگی گزارتا تھا۔لاہور میں اُس کی ملاقات عزیز جہاں اور سروسانسی سے ہوتی ہے۔ سروسانسی ایک کمی کمین کے طور پر اپنے مالک عزیز جہاں کے ساتھ اُس کی حفاظت کے لیے آیا تھا۔

لاہور میں جب مذکورہ کردار کھانا کھانے کے لیے بیٹھتے ہیں تو سروسانسی علیحدہ ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔عزیز جہاں بھی اُس کی نسلی خصلت کا ذکر کرتا ہے لیکن امیر بخش کی ضد کی وجہ سے وہ پہلی مرتبہ ایک تہذیب کے تحت کھانا کھانے کے لیے بیٹھتا ہے تو نوالے حلق سے نیچے اتارنا اُس کے لیے مشکل ہو جاتے ہیں:

> سروسانسی کے چہرے سے مسکراہٹ کافور ہو گئی۔اُسے یقین نہ آیا کہ وہ اپنے چوہدری ۔راجے کا کٹھیا۔۔۔چوہدری کے ساتھ ایک ہی دستر خواں پر بیٹھ سکتا ہے۔اگرچہ اُس نے ایک پراٹھے میں سے کچھ لقمے توڑے پر وہ اس کے حلق میں سے نہ اترے۔اُسے تو ایسی پذیرائی کی عادت ہی نہ تھی۔۔۔وہ زندگی میں پہلی بار ایک ایسے دستر خواں پر بٹھا دیا گیا تھا جس میں سے چوہدری اور صاحب لوگ لقمے اٹھاتے تھے۔[۲۸]

مارکس کے خیال میں جب سماج میں طبقات پیدا ہو جاتے ہیں تو یہ طبقات ایک دوسرے سے مغائرت کا شکار ہو جاتے ہیں اور دوسرے طبقے کو اپنے خلاف تصور کرنے لگتے ہیں۔نچلے طبقات زندگی کی رنگینی اور سہولتوں سے یکسر محروم رہ جاتے ہیں۔یہ طبقات ایک دوسرے کے حریف بن جاتے اور انسانی سطح سے نیچے چلے جاتے ہیں۔یہی کچھ ناول سانسی لوگوں کے حوالے سے اظہار کرتا ہے کہ اُن کے لیے سماج اور اس میں قائم نظام ایک اجنبی ہوتا ہے۔انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ زندگی کیسے گزر رہی ہے اور اس کو بہتر بنانے کے لیے کیا کیا جا سکتا ہے۔

سماجی بیگانگی کی بنیاد طبقات اور قائم نظام ہوتا ہے۔چوں کے سماج میں تمام افراد معاشرہ ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرتے ہیں اس لیے اُن کے درمیان باہمی انسانی رشتے قائم ہوتے ہیں۔لیکن جب سے ذاتی ملکیت کا تصور پیدا ہوا اور بالخصوص سرمایہ داریت نے سماج میں دو واضح طبقات کو پیدا کیا ہے تب سے یہی افراد معاشرہ ایک دوسرے کو اپنے حریف کے طور پر جاننے لگے ہیں۔وہ آگے بڑھنے کی دوڑ میں دوسروں کو کچلنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔بالخصوص درمیانہ طبقہ جسے مارکس نے پیٹی بورژوا کہا اپنے سے نچلے طبقے سے سخت نفرت کرتا ہے اور انھیں سماج میں کسی طرح کی

اہمیت دینے سے قاصر ہوتا ہے۔ اس کی مثال اس ناول میں بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہے کہ جاٹ برادر باقی طبقات کو ذلیل اور کمتر تصور کر کے اپنی متکبرانہ ذہنیت کا پرچار کرتی ہے۔

ناول میں اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی سے بھی پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے نسل در نسل غلامی کی زندگی بسر کرتے رہتے ہیں۔ اُن کی نسلیں مالکوں کی عنائیت کو پورا نہیں کر پاتیں اور ہر روز نئے دلل میں دھنس جاتے ہیں۔ اُن کی شادیاں، رسومات و روایات کی انجام دہی بھی انھی بھٹوں پر ہوتی ہے۔ وہ قلیل مزدوری سے بہ مشکل اپنا پیٹ بھر کر اگلے دن کے کام کے لیے تیار ہو پاتے ہیں۔ شادی، بیاہ، خوشی غمی کے موقعے پر مالکوں سے ادھار رقم لیتے ہیں جسے اُن کی نسلیں چکاتی رہتی ہیں لیکن وہ ادھار کی رقم جسے سود پر دیا جاتا ہے کبھی ختم نہیں ہوتی ایسے میں بعض اوقات انھیں ایک بھٹے سے دوسرے میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔

اینٹوں کے بھٹے پر کام کرنے والے مزدور اگر کسی مالک سے تنگ آجائیں یا جگہ تبدیل کرنی ہو تو خریدنے والا شخص جس رقم کے عوض انھیں خریدتا ہے اور اپنے بھٹے پر کام کرنے کے لیے لاتا ہے تو وہ خریدنے والے کی رقم کو بھی ادا نہیں کر سکتے اور پھنس کر رہ جاتے ہیں۔ جب وہ کمزور ہو جاتے ہیں یا مالک کی امید کے مطابق کام نہیں کر پاتے تو وہ انھیں فروخت کر دیتا ہے اور خریدنے والے سے رقم وصول کر لیتا ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی نسلیں انھی اینٹوں کے بھٹوں میں کام کرتی کرتی تباہ ہو جاتی ہیں لیکن انھیں انسانی سماجی سطح پر کوئی تبدیلی محسوس نہیں ہوتی:

> پشپی کڑی دھوپ میں کھڑی فیصلے کی منتظر رہی۔ لوہے کی لاٹ بدن سگتا رہا۔ کیا اُس لمحے جب وہ ایک جانور کی مانند فروخت کے لیے پیش کی گئی تھی اُسے کچھ تذلیل محسوس ہوئی تھی۔ اُس کی عزت نفس کو تکلیف پہنچی تھی یا وہ دکھی ہوئی تھی؟ ہرگز نہیں کہ وہ جنم جنم سے جنور تھی۔۔۔ وہ تذلیل تب محسوس کرتی اگر اُس کے ساتھ کبھی انسانوں جیسا سلوک کیا جاتا۔[۲۹]

پشپی اُن کرداروں کی نمائندہ ہے جو اینٹوں کے بھٹے پر کام کرتے ہیں اور اُن کے ساتھ جانوروں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ وہ بطور مشین کے پرزے کے زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کا سماج کے مجموعی نظام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی دنیا ہی الگ ہوتی ہے اور یہ اسی ذلت کی دنیا میں جینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ سماج میں بطور انسان نہیں بلکہ کام کرنے والی مشین کے طور پر زندہ رہتے ہیں۔

پشپی سماج اور انسانوں کے درمیان کھڑی خود کو فروخت کر دیتی ہے لیکن اُسے اپنی خرید فروخت پر کوئی تذلیل نہیں ہوتی۔ عزیز جہاں سے شادی کرتی ہے تو بھی اُس کی زندگی میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوتی۔ رام داس کے بھٹے پر مشین کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے اُسے یہ بھی یاد نہیں ہوتا آیا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھی کوئی بچے بھی تھے یا نہیں اور وہ جانوروں کی طرح ایک بھٹے سے دوسرے بھٹے میں شفٹ کر دی گئی۔ مستنصر اس سے اخذ کرنا چاہتے ہیں کہ ان لوگوں کی زندگی ایسی ہوتی ہے کہ بیوی الگ اور خاوند الگ فروخت ہو جاتے اور بچے کہیں رہ جاتے ہیں اور اس طرح یہ لوگ ایسی ہی غیر انسانی زندگی گزار کر مر جاتے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے خون ریز فسادات جو مذہب کے نام پر ہوئے ان کے پیچھے بھی معاشی صورت حال واضح دکھائی دیتی ہے۔ جب برصغیر میں انگریز نے قدم رکھا تو یہاں رہنے والے ایک ہی جگہ مذہب کے اختلاف کے باوجود اپنی عبادات کرتے اور خوشحال زندگی گزار رہے تھے۔ لیکن جلد ہی لوٹ کھسوٹ کر اُن کے درمیان نفرت کے ایسے بیج بو دیے جن کا نتیجہ لاکھوں انسانوں کی جانوں کے ضیاع کے طور پر نکلا اور انھیں اس اختلاف سے یہ احساس دلوایا کہ فلاں مذہب تمہارا حق کھا رہا ہے۔ یوں اُن کے درمیان نفرت کی آگ بھڑکی اور جب تقسیم ہوئی تو لاکھوں انسانوں کا قتل عام کیا گیا:

> وہ خون آشام سرخ بگولوں کی مانند گاؤں گاؤں اٹھتے ہیں۔ اپنی بہو، بیٹیوں اور ماؤں کے دریدہ پیراہنوں کی دھجیاں کبھی چومتے اور کبھی آہ وبکا کرتے آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ جانے وہ کیسے نامراد اور بے غیرت سکھ تھے جنھوں نے یہ ظلم کمائے۔ اگر ہم ان کے راستے میں حائل ہوتے ہیں تو وہ ہمیں بے غیرتی کے طعنے دیتے ہیں۔۔۔ اُن میں ایک باولا شخص سید شریف نام کا ہے جس کی تین بہنوں کو امرتسر کی ایک قدیمی مسجد میں فرش پر قرآن پاک کے ورق بچھا کر اُن پر لٹا کر۔۔۔ محکم دین دکھ سے چپ ہو گیا۔ (۳۰)

آزادی کے ان واقعات میں ایسے ایسے غیر انسانی واقعات ہوئے جن کا تصور کر کے دل دہل جاتے ہیں۔ ماؤں بہنوں کی عزتیں لوٹی گئیں، لوگوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا اور جو بچ گئے ان میں سے کچھ ادھر رہ گئے اور کچھ ادھر۔ اس پورے منظر نامے کو مذہب سے جوڑنا محض اپنی دلجوئی کرنا ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ استحصال اور لوٹ کھسوٹ کے ستائے ہوئے لوگ دوسرا عقیدہ رکھنے والوں کو اپنا دشمن سمجھ کر قتل

کرتے رہے اور نفرت کے بیج بوتے رہے۔ جب کہ یہ معاملہ خالصتاً سرمایہ داریت اور سامراجیت کی دین تھا جس نے یہاں کے عوام کو ذلت کے گھڑوں میں دھکیل کر انھیں بنیاد پرستی اور شدت پسندی پر مجبور کیا۔ ورنہ کیا آٹھ سو سال سے اکھٹے رہتے ہوئے انھیں مذہبی اختلاف کا خیال نہیں آیا تھا؟ کیا کم تعداد میں ہونے کے باوجود کثیر تعداد پر انصاف پر مبنی حکومت قائم نہیں تھی ؟ جب اُن پہلوؤں پر غور کیا جائے تو اسے بھی اقتصادی مسئلے سے تعبیر کرنے میں کوئی حرج نہیں اور "خس وخاشاک زمانے" میں اس سماجی وانسانی بیگانگی کی واضح مثالیں ملتی ہیں۔

کوٹ مراد میں سکھوں کو گردوارے میں جس طرح سے جلا دیا گیا وہ انسانیت کے دلسوز واقعات کی نمائندگی کرتا ہے۔ دونوں اطراف سے جس طرح کا رویہ اپنایا گیا وہ انسانوں کا طبقات میں بٹنے اور اس کے اثرات کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی طرح سے سقوط ڈھاکہ جو کہ مذہبی ہر گز نہیں تھا خالصتاً حقوق کی پامالی کی جنگ تھی ایسے ہی طبقاتی نظام پر چوٹ کرتا ہے جہاں اپنوں نے اپنوں کے گلے کاٹے اور عزتیں لوٹیں۔

ناول میں جگہ جگہ شراب اور جنسیت کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ سانسی ہوں یا جاٹ، مسلمان ہوں یا سکھ یا عیسائی سب اسی نشے کی لت سے دوچار ہیں۔ جب انہیں سماجی سطح پر تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ذہنی سکون وآرام نہیں ملتا تو اکثر افراد معاشرہ نشے کی لت میں لگ جاتے ہیں اور عورتیں اپنا جسم بیچ کر اپنا روزگار چلاتی ہیں۔ ناول کا وہ حصہ جس میں امریکہ اور کینیڈا کا ذکر ہے ایک کردار ہزارہ خان کا ہوتا ہے جو لڑکوں کو جنسیت کے لیے استعمال کر کے پیسے کماتا ہے اور کچھ لڑکیاں اپنا جسم بیچتی ہیں۔ ہزارہ اپنے سماج سے روندا ہوا جب امریکہ جاتا ہے تو اس طرح کے غیر اخلاقی کاموں میں حصہ لیتا ہے اور بچوں کو اس کام کے لیے ذلت کی زندگی جینے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ انسانی تقاضوں اور سماجی ضرروتوں سے عاری پیسے کی دوڑ میں لگ جاتا ہے۔

نائن الیون کا واقعہ جدید دنیا کے لیے ایک بہت بڑی تبدیلی اور کشمکش کا باعث بنا۔ افغانستان میں روس کو روکنے کے لیے امریکا نے مسلم کمیونٹی کا استعمال کیا۔ کئی ممالک سے خدا بچاؤ تحریک کے نام پر جہادی تیار کیے گئے۔ سماج کے کمزور اور نچلے طبقے کو ان مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا گیا۔ جب اس میں کامیابی حاصل ہوئی تو خود ساختہ پلان کے تحت ورلڈ ٹریڈ سنٹر کا واقعہ کرایا گیا اور بدلے میں تمام مسلمانوں سے نفرت اور افغانستان کو مٹی کا ڈھیر بنا دیا۔ مسلم کمیونٹی کو معاشی ومعاشرتی طور پر کمزور کر کے نفرت کا بیج بویا گیا۔ محمد سہیل اقبال لکھتے ہیں:

ناول میں سانحہ ۱۱/۹ کے بعد امریکہ میں مقیم مسلمانوں سے نفرت اور مذہبی تعصب کی صورت گری کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ انعام اللہ جو ہر قسم کے عقیدے و مذہب سے آزاد انسان تھا۔ جس کا مذہب ہی انسانیت تھا کو بھی امریکا میں مذہبی نفرت اور تعصب کا سامنا کرنا پڑتا ہے امریکا میں مقیم مسلمانوں پر سانحہ ۱۱/۹ کے اثرات بھی اس ناول کے پلاٹ کا حصہ ہیں۔ (۳۱)

امریکہ کا افغانستان میں روس کے خلاف لڑنا، نائن الیون کا واقعہ کرنا اور عراق میں بمباری کرنا کوئی مذہبی نہیں بلکہ مذموم معاشی مقصد کے تحت کیا گیا اور اس کے لیے ایک مرتبہ پھر مذہب کو بطور آلہ کار استعمال کیا۔ جس سے بڑی تعداد میں مسلم طبقے میں تفسیاتی بحران نے جنم لیا۔ انعام اللہ جو کسی مذہب کا پیروکار نہیں اُسے بھی اس سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ جب ٹیلی ویژن پر بار بار اُس واقعے کو دیکھتا تو اُس کے اندر طرح طرح کے احساسات جنم لیتے۔ کبھی وہ طالبان / جہادی بننے کا سوچتا اور کبھی وہ خود کو قید کرنے کا تصور کرتا:

تم جانتی ہو جو لیا کہ میرا جی کیا چاہتا ہے۔ کہ وہ مجھے گرفتار کریں۔ میری مشکیں کس کر سر مونڈھ کر میرے چہرے کو زرد رنگ کے کنٹوپ سے ڈھانپ کر ایک کال کوٹھڑی میں دھکیل دیں۔۔۔ کم از کم وہاں ٹیلی ویژن تو نہ ہو گا۔ (۳۲)

ایک طرف مسلم کمیونٹی کے خلاف نفرت اور دوسری طرف پاکستان سے دوری سخت سماجی بیگانگی کا باعث بنی۔ کینیڈا ہو یا امریکہ دونوں میں مقیم یہ کردار اپنے ماضی کی تلخیوں اور حال میں جاری رویے سے سخت بے زار تھے۔ انعام اللہ تو اس بیگانگی کا شکار ہونے کے بعد خودکشی پر مائل ہو جاتا ہے لیکن شباہت اُسے روک لیتی ہے۔ عراق میں ہونے والی تباہی اور افغانستان کے پہاڑوں میں اٹھنے والی راکھ بیگانگی انسانیت کی حقیقی جاگتی مثالیں ہیں کہ کس طرح سرمائے کی دوڑ میں کمزور اقوام کو کچل دیا جاتا ہے۔ جیسے کسی سماج میں بالائی طبقے نچلے طبقے کو کچلنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یعنی سرمایہ داری طاقتیں جب بیرونی ممالک میں اثر و رسوخ بڑھاتی ہیں تو ایسے سامراجیت کہا جاتا ہے۔ اور اسی سامراجیت نے ان کمزور اقوام کی نہ صرف دولت لوٹی بلکہ انھیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دیا۔ جس کے لیے انھوں نے پاکستان کے غریب عوام اور عوام دشمن حکمرانوں کو پیسے دے کر اپنے مذموم مقاصد کو حاصل کرنے کی سعی کی اور کامیاب ہوئے۔ اس حوالے سے محمد کامران شہزاد لکھتے ہیں:

نائن الیون کے پس منظر میں مستنصر حسین تاڑ کا دوسرا ناول خس و خاشاک زمانے (۲۰۱۰ء) ہے جس کا بنیادی موضوع زوال انسان ہے۔ لیکن ناول کے آخری حصے میں نائن الیون کے واقعے کے بعد مشرق وسطی کی سیاسی و سماجی صورت حال کو جہاں بیان کیا گیا ہے وہاں امریکی پالیسیاں جو کہ ذاتی مفاد کے لیے پاکستان جیسے ملک کو ڈالر دے کر ان طالبان کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا۔۔۔ انھوں نے نائن الیون کے خود ساختہ امریکی المیے کے بعد افغان وار میں طالبان کے ہسپتال میں محصور ہوتے ہوئے بھی امریکی اتحادی فوج کے خلاف بھرپور مزاحمت کرنے اور ہتھیار ڈالنے کی روداد کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔[۳۳]

مستنصر حسین تارڑ نے "خس وخاشاک زمانے" میں کئی موضوعات کو سمیٹا ہے تاہم اس کا ایک موضوع انسان کا زوال بھی ہے وہ زوال جس سے وہ دوسرے انسانوں سے خود کو لاتعلق بنا رہا ہے۔ وہ عقائد ،ذات پات، رنگ و نسل اور جغرافیے میں قید ہو گیا اور دوسرے اُس کے لیے حریف بن چکے ہیں۔ جس کے خاتمے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام مذکورہ وجوہات سے بالاتر ہو کر ایسے سماج اور ریاستیں قائم کی جائیں جو خالصتاً انسانی بنیادوں پر قائم ہوں۔ انسان انسان کا دشمن نہیں بلکہ اس کا غم خوار ہو۔ اسی لیے ناول کے اختتام پر شاہت اور انعام اللہ کے کردار اس نئی دنیا کی تعمیر کی طرف راغب ہوتے ہیں کہ ایک نیا خواب دیکھا جائے۔ ایسا خواب جہاں صرف انسانی بنیادیں ہوں اور انسانیت ہو اس کے لیے مارکس نے کمیونزم کے نظام کے قیام کی طرف راہنمائی کی ہے۔ جہاں ہر طرح کے فرق اور تعصب کا خاتمہ ہو گا اور افراد معاشرہ جو کہ اب گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر چکا ہے باہمی تعاون اور نظریہ ضرورت کے تحت دوسروں کے لیے کار آمد ثابت ہوں گے۔ جہاں ہر تقریق دم توڑے گی اور نئے سماج اور نئی دنیا کی تخلیق ہو گی جس کے لیے جہد مسلسل درکار ہے۔

۲۔ افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی:

نوعی زندگی سے بیگانگی دکھائی دینے والی اور عام فہم نہیں ہوتی۔ یہ انتہائی گہرے مشاہدے اور مطالعے کے نتیجے میں ہی آشکار ہوتی ہے۔ نوع سے مراد انسان کی داخلی صلاحیتیں اور طبعی و فطری میلانات ہوتے ہیں۔ یعنی وہ فطری جذبے جن کی وجہ سے انسان دوسری حیاتیاتی مخلوق سے خود کو منفرد کرتا ہے۔ "خس وخاشاک زمانے" کا مطالعہ اس پہلو کی بڑی واضح تصویر کشی کرتا ہے کہ آج ہمارے سماج میں نوعی بیگانگی کے عناصر کس

طرح پروان چڑھ رہے ہیں۔ بنیادی طور پر انسان کے تمام فطری پہلوؤں کا اظہار اس کی مادی ضروریات کی تکمیل سے جڑا ہوا ہے۔ آج کا انسان مختلف مسائل اور نظریات میں الجھ کر انسانی و نوعی تقاضوں کو بھول چکا ہے۔ وہ اپنے فطری کردار کے بجائے مصنوعی زندگی گزار رہا ہے اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے یہی پہلو اس ناول کا ایک اہم موضوع بھی ہے۔ ڈاکٹر فرید حسینی لکھتے ہیں:

> کہانی کا پیش منظر بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کا نصف آخر ہے مگر پس منظر میں عصر حاضر جھلکتا ہے۔ کیوں کہ آج بھی بلوائیوں کا گروہ بذعم خود مدعی، استغاثہ، منصف اور جلاد کا فریضہ سر انجام دے رہا ہے۔ بھٹہ خشت کے مزدوروں سے لیکر جامعات تک اس جھتے کے نعروں سے خوف زدہ ہیں۔ "خس وخاشاک زمانے" شوخ رنگوں سے مزین تصویروں کا البم ہے۔ ہر تصویر پڑھنے والے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنا نقش قائم کرتی ہے۔ قیامت خیز ظلم کی آندھی نے جب تہذیب کو خس وخاشاک بنایا تو فرد کی بے جائیگی اور بے معنویت ظاہر ہوئی۔ (۳۴)

انسان سماج میں رہتے ہوئے تعلقات و سماجی رشتے بناتا ہے۔ دوسروں کے لیے اور اپنی ذات کے اظہار کے لیے تخلیق کرتا ہے۔ فطری جذبوں کا اظہار کرتا ہے لیکن آج کے سماج کا انسان ٹوٹ پھٹ اور داخلی خلفشار کا شکار ہے۔ تارڑ نے بھی اسی تصور انسان کو "خس وخاشاک زمانے" میں پرونے کی سعی کی ہے۔

ناول کے ابتدائی صفحات میں تارڑ نے آزادی کے واقعات کو اجمالی انداز میں بیان کیا ہے کہ کس طرح سے تقسیم کے وقت غیر انسانی سلوک برتا گیا کہ انسانیت شرما جائے۔ سکھوں اور مسلمانوں کا ہونے والا قتل عام نہ صرف غیر انسانی رویہ تھا بلکہ جانوروں سے بھی بدتر سلوک نہتے اور بے بس عوام سے برتا گیا۔ ماؤں کی کوکھیں اجاڑی گئیں۔ بہنوں بیٹیوں کے ساتھ ریپ کیے گئے اور عزتیں لوٹی گئیں۔ بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے کہ نفرت نے انھیں اندھا بنا دیا تھا۔

مذہب جیسے مقدس اصولوں کی آڑ میں لاکھوں انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا لیکن پھر بھی تشفی نہ ہو سکی۔ دشمنیاں پیدا کر کے آنے والی نسلوں کے لیے نفرت کی جڑیں لگا دی گئیں۔ فطری آزادی کے حصول کے نام پر لاکھوں کروڑوں کو ہوس پرستی و بنیاد پرستی کا غلام بنا دیا۔ گجرات اور اس کے ارد گرد موجود سکھوں سے بدلے کی آڑ میں انسانیت کا قتل عام کیا۔ مذہب کے مقدس نام پر ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے بنیادی انسانی تقاضوں کو ترک کر کے خون کی نہریں بہا دیں لیکن انھیں تسکین حال نہ ہو سکی۔

آج انسان طبقات وعقائد میں بٹ کر فطری تقاضوں کو بھول گئے۔وہ انسان جس نے دوسرے انسانوں کے لیے رہنمائی کا باعث بننا تھا،انھیں دکھ درد سے نجات دلانی تھی،اپنی کم فہمی اور ہوس کی بنیاد پر اس سے بھی دور ہو گئے۔جاٹ چاہے سکھ ہوں یا مسلمان اپنی نسلی برتری کی بنیاد پر قدامت پرستی اور من گھڑت تاویلوں کا سہارا لے کر سماج کے مجموعی رویے سے کٹتے چلے گئے۔جہاں ایک طرف انسان جدید تعلیم وتہذیب سے آراستہ ہو رہے تھے وہیں برصغیر کے یہ عوام جو صدیوں سے قدامت پرستی کی دلل میں ڈوبے ہوئے تھے انھیں جدید تہذیب وتقاضوں سے کوئی میل نہ تھا۔اُن کی زندگی کھیتوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی ۔وہ جانوروں کے ساتھ جانوروں کی زندگی بسر کر رہے تھے۔برصغیر میں انگریز تسلط کے دوران میں جدید تعلیم کے دروازے کھل رہے تھے لیکن یہاں کے عوام اس نوعی تقاضے کو حرض جان بنانے سے محروم تھے۔تعلیم انسان کی شخصیت کو نکھارتی ہے اس کو سماج میں جینے کے قابل بناتی ہے اور کائنات کے رازوں سے واقفیت دلواتی ہے لیکن مادی زندگی میں الجھے برصغیر کے یہ عوام اس سے روشنی اخذ کرنے سے محروم تھے:

> جاٹوں کے ہاں آل اولاد کو پڑھانے کا رواج نہ تھا۔۔۔اُن کے نظریے کے مطابق پڑھ لکھ جانے والا ہل کی ہتھی پر بوجھ ڈال کر اُس کے پھالے زمین کے اندر تک اتارنے کے قابل نہیں رہتا۔تعلیم اُسے نامرد بنا دیتی ہے۔یہ پڑھائی لکھائی براہمنوں یا مولویوں کے بکھیڑے تھے۔(۳۵)

ان کے خیال میں جو شخص تعلیم حاصل کرے گا وہ کھیتوں میں پیداواری عمل میں زیادہ بہتر کارکردگی نہیں دکھا سکتا جس سے پیداواری عمل متاثر ہو گا۔حالاں کہ تعلیم یافتہ شخص فصل کی پیداوار میں زیادہ بہتر کارکردگی اور طریقے اپنا سکتا ہے۔اسی خدشے کے پیش نظر اس فطری تقاضے سے بھی یہ لوگ بیگانے زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے۔

"خس وخاشاک زمانے" میں سانسی لوگوں کی زندگی کی عکاسی دراصل تارڑ کی مذہب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی کشمکش،بے چینی اور تصادم کی نفی کا اظہار ہے کہ کسی عقیدے کے تعصب اور نفرت کا خاتمہ ہی خالص انسانی بنیادیں سماج کے قیام کے لیے فراہم کر سکتا ہے۔سانسی ان پڑھ،جاہل اور کمتر ذات کے حامل حرام وحلال کی تمیز کے بغیر زندگی گزارنے والے انسان تھے۔وہ معاشرے کا حقیر طبقہ ہونے کی وجہ سے مردار کھاتے تھے اور کسی عقیدے کی پیروی نہیں کرتے تھے۔وہ گدھوں کی طرح مردار کا گوشت نوچ نوچ

کر کھا جاتے تھے اور کسی تعصب کا شکار نہ ہوتے تھے۔ زندہ بچھو، نیولا اور دیگر حیات کو وہ بھون کر کھا جاتے اس وجہ سے باقی تمام طبقات اُن سے نفرت کرتے تھے اور انھیں ذلت بھری نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

انسان نے اس کائنات میں آنے کے بعد کسی نہ کسی عقیدے سے وابستگی اختیار کر لی اور اسی عقیدے کے مطابق زندگی گزرانے لگا۔ عقیدہ دراصل ایک روحانی تسکین کا باعث اور سماجی ضروریات کو کچھ حدود میں رہتے ہوئے انجام دینے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

کوئی مسلمان ہے، کوئی عیسائی ہے، کوئی بدمت کا پیروکار ہے تو کوئی ہندوازم کا ماننے والا۔ کوئی یہودی سے تو بہائی اور کوئی جین ازم کو ماننے والا۔ ان مذاہب کے ماننے والے ایک دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہی زندگی بسر کرتے ہیں لیکن تارڑ نے سروسانسیوں کو لامذہب انسانوں کے روپ میں پیش کر کے ایک طرف تو یہ دکھایا کہ کس طرح یہ لوگ سماج میں کسی نفرت سے بچے رہتے ہیں تو دوسری طرف اس طرف بھی راہنمائی کسی کی یہ لوگ بنا کسی عقیدے کے یوں ہی جیے جاتے ہیں اور اس لیے انھیں سماج میں کوئی مقام و مرتبہ نہیں دیا جاتا۔

سانسی لوگ ایک طرف مذہب و عقائد سے بیگانے زندگی بسر کرتے ہیں تو دوسری طرف کسی سماجی ضابطے اور کردار سے بھی یکسر محروم ہیں۔ اُن کے نزدیک کسی بھی طرح کے سماجی ضابطوں کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ تعلیم و تربیت حاصل نہیں کرتے اور نہ ہی خود کو اس ذلت کی زندگی سے بلند کرنے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ طبقات میں بٹے اپنے جیسے انسانوں کے غلام وہ انسانی زندگی سے نابلند جانوروں کی طرح جینے کے خواہش مند ہیں اس لیے کہ صدیوں سے اُن کے ساتھ اس طبقاتی تقریق نے یہی رویہ اپنائے رکھا۔ انھیں انسان کے طبعی و فطری میلانات سے بھی کوئی آگاہی نہیں ہوئی:

> اُس کی گھر والی سوہنی نے تو ہنگامہ کر دیا۔۔۔ مردار کے بچے تم نے میرے بچوں کو سبق پڑھا کر تختی لکھوا کر خراب کرنا ہے۔ کبھی کسی سانسی کے بچے نے بھی سبق پڑھا ہے یا تختی لکھی ہے۔۔۔ تو انھیں جوہڑوں میں سے کچھوے پکڑنا سکھا۔۔۔ نیولے اور ریلے دبوچنے کے فن سے آگاہ کر اور مردار کی بو سونگھ کر گدھوں سے پہلے اُس تک پہنچنے کے گر بتا۔ (۳۶)

سانسیوں کی نفسیات صدیوں سے اسی طرح ذات پات / طبقات میں بٹنے کی وجہ سے یکسر سماجی رویے سے مختلف ہے۔ وہ جس انداز میں سماجی زندگی بسر کرتے رہے ہیں اس سے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دقت نہیں کہ اُن میں اور جانوروں میں فرق صرف جسمانی بناوٹ کا رہ جاتا ہے۔

تارڑ نے اپنے اس ناول میں انسانوں کی مختلف عقائد اور علاقائی تقسیم کی طویل تاریخ اور مٹتی ہوئی انسانی تہذیب کا نوحہ بیان کیا ہے۔ یہاں لاکھوں کروڑوں انسان صرف نظریے کے اختلاف پر دوسرے انسانوں سے جانوروں سے بدتر سلوک کرتے ہیں۔ چند افراد معاشرہ جب مجموعی سماج پر اثر انداز ہونے لگتے ہیں تو یہ تقسیم انھیں طاقتور اور کمزور میں بانٹ کر غلامی کی زندگی جینے پر مجبور کرتی ہے۔ آج جدید دنیا میں تہذیبوں و نظریات کا ٹکراؤ پیدا ہو چکا ہے جس سے انسان اپنی شناخت سے بھی محروم ہو رہے ہیں۔ اپنے معاشی مقاصد کی خاطر ناقابل بیان سازشیں رچائی جاتی ہیں اور نتیجے کے طور پر کروڑوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا دیا جاتا ہے۔ جنگ عظیم اول، دوم، تقسیم برصغیر ہو یا جدید جنگیں سب کی سب طاقت حاصل کرنے کی لڑائیاں ہیں۔ معاشی منڈیوں پر قبضے اور آگے بڑھنے کی جنگیں جنھوں نے انسانوں کو انسانوں سے ہی یکسر بیگانہ کر کے انھیں نوعی تقاضوں سے بھی محروم کر دیا ہے۔

جس انسان نے کائنات کے رازوں سے واقفیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی نوع کے لیے ایک ہمہ گیر اور انسانیت پرست کردار ادا کرنا تھا وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کا دشمن بن کر طبعی رجحانات سے عاری زندگی گزار رہا ہے۔ ماضی قریب کے چند برسوں میں نائن الیون کے واقعے نے یہ قلعی کھول دی کہ کس طرح معاشی مقاصد کے حصول اور طاقت حاصل کرنے کی اس جنگ نے لاتعداد لوگوں کی جانوں کا ضیاع کیا۔ معاشی و سماجی اعتبار سے تقسیم کا شکار عوام اس آگ کا ایندھن بنے۔ نائن الیون کے واقعے میں جہاں ہزاروں انسانوں کی جانیں گئیں وہیں بدلے کی آگ نے کروڑوں زندگیوں کو پتھر کے زمانے میں دھکیل دیا اور کہیوں کے چھیتڑے اڑا دیے۔ اس ناانصافی اور طاقت کی جنگ نے ناقابل یقین اور غیر انسانی کھیل کھیلے:

> ورلڈ ٹریڈ ٹاورز۔۔۔پینٹاگن اور وہائٹ ہاوس کے متکبر معبدوں کو مسمار کرنے کی نیت رکھنے والے جو جیٹ طیارے اُن کی جانب بڑھتے تھے انھیں اغوا کرنے والے قطعی طور پر شریعت کے پابند مسلمان نہ تھے۔ اُن میں سے ایک عادی شرابی تھا اور اپنی ترک محبوبہ کے ہمراہ جرمنی میں رہائش پذیر تھا اور دوسرا۔۔۔عطا۔۔۔وہ بھی نائٹ کلبوں

اور شراب کا رسیا تھا۔ چنانچہ اس خودکشی میں عقیدے کا کچھ عمل دخل نہ تھا۔ یہ مسلسل بے توقیری اور ناانصافی کے گھاؤ تھے جو اس کا سبب بنے تھے۔[۳۷]

افغانستان اور عراق میں امریکی فوجیوں نے جس غیر انسانی رویے کا مظاہر کیا وہ کسی بھی طرح انسانی سماج کے لیے قابل قبول نہیں۔ افغانستان میں برپا نے ہونے والی تبدیلی کو روکنا، معاشی طور پر کمزور کرنا خود طاقت حاصل کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ جب کئی برسوں میں اس قوم کو خانہ جنگی کی لپیٹ میں رکھ کر بھی مقاصد حاصل نہ ہو سکے تو خود ساختہ تجربہ کیا۔ یہ تجربہ خود ساختہ تھا لیکن دنیا کے سامنے یہ تاثر دیا کہ افغانی طالبان نے یہ غیر انسانی رویہ اپنا کر حملہ کیا۔ اگر اس بات کو درست بھی مان لیا جائے تو مارکس کا یہ تصور درست ثابت ہوتا ہے کہ جب کسی سماج میں محنت کرنے والے کو ان کے عمل کا نتیجہ نہیں ملتا اور طاقت کے زور پر دبایا جاتا ہے تو وہ کمزور طبقات غیر انسانی رویے کا شکار ہو کر بنیادی انسانی فطرت کے تقاضوں کو بھول جاتے ہیں۔ اُن کے لیے اقدار ورویات اور سماج بوجھ بن جاتا ہے۔ اسی نظریے کی پیش کش مذکورہ اقتباس میں تارڑ نے بھی کی۔ اگرچہ انھوں نے خالصتاً مارکسی نقطہ نظر نہیں اپنایا لیکن اپنے بیان میں اسی پس منظر کو لے کر چلے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول کے آخری صفحات میں انھوں نے ایک نئے آدرش اور نئے خواب کے ساتھ نئی دنیا کی بنیاد کی طرف اشارہ کیا ہے۔

پاکستان جو کہ معاشی اعتبار سے کمزور اور سیاسی و سماجی سطح پر رفتہ رفتہ زوال کی طرف گامزن ہے۔ اس ملک میں مذہبی شدت پسندی اور معاشی اعتبار سے لوگوں کو کمزور کر کے انھیں جہالت کی زندگی گزارنے پر مجبور کیا گیا۔ چند مفاد پرست ٹولوں نے کروڑوں انسانوں کی زندگیوں کو جہنم بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بنیاد پرستی اور جہالت راج کرتی ہے جب کہ انسانی ہمدردی اور لگاؤ کے جذبات ختم ہو چکے ہیں۔ لوگ اپنے ہی مذہب سے بھی بیگانے ہو چکے ہیں۔ وہ زندگی کی مادی الجھنوں سے اس قدر پریشان ہیں کہ مذہب جیسے مقدس فریضے کو زندگیوں سے خارج کر رہے ہیں۔ دہشت گردی اور قرآن کو نذر آتش کرنے کے کئی واقعات بھی نوعی زندگی سے بیگانگی کی ہی مثالیں ہیں۔ انسانی زوال اور اقدار کی پامالی ہو رہی ہے اور کسی واضح نظریے اور راہ کے تعین کا فقدان ہے۔ اس لیے تارڑ شباہت کے کردار کے ذریعے کہتے ہیں:

> اس دھرتی پر جتنے بھی آدم مٹی کے بت ہیں اُن کی مٹی کو پھر سے گوندھ کر ایک نئے انسان کو ایک نئے آدم کو تخلیق کرنا ہے۔ اسے ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور خیال کرنا ہے کہ اس مٹی میں کوئی ایک ذرہ بھی بے انصافی، ستم اور غربت کا نہ ہو۔۔۔ اس

مذہبی، معاشرتی اور نسلی تنگ نظری کا شائبہ تک نہ ہو اور نیمی ایک ایسا انسان میرے
بدن کے سانچے میں ڈھل رہا ہے۔[۳۸]

تارڑ نے اس ناول میں جتنے موضوعات کو برتا ہے وہ اُن کے فن اور گہرے فکری مطالعے کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں اس میں کئی اور موضوعات ہیں ایسے لوگوں کی کہانی بھی ہے جو روزگار کے لیے گھروں سے شہروں اور دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں۔ انھیں جن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور جس طرح انھیں اپنا وطن یاد آتا ہے وہ نا قابل بیاں ہے۔ مستنصر حسین تارڑ نے سات سو چالیس صفحات میں برصغیر کی آزادی سے قبل کے حالات، تقسیم، سقوط ڈھاکہ، بھٹو کا دور، مارشل لاء، نائن الیون، عراق، کینیڈا اور امریکہ سمیت عالمگیر موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ مذہبی شدت پسندی ہو یا پھر معاشی استحصال اور سامراجی سازشیں۔ الغرض ہر پہلو کو لیے ہوئے ہے اور ناول کے اختتام پر انھوں نے شعوری / غیر شعوری طور پر ایک نظام کے خواب دیکھنے کی سعی کی ہے۔ وہ خواب جس کے لیے مارکس کمیونزم کے نظام کو قائم کرنے کا تصور دیتا ہے۔ اس سطح پر مارکس اور تارڑ ہم خیال نظر آتے ہیں۔

نیلی بار

ا۔ افراد کی سماجی زندگی سے بیگانگی:

سماج / انسان سے بیگانگی سے مراد محنت کش کا سماجی زندگی میں کردار ادا کرنے سے لاتعلقی اختیار کرنا اور غیر پیداواری امور میں خود کو الجھا دینا ہے۔ جب محنت کش کو اُس کی پیداوار سے کاٹ دیا جاتا ہے تو اس کی ابتدا ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ اس کا عمل دخل سماجی زندگی میں بھی آ جاتا ہے۔ سماج میں اخلاقی گراوٹ، دہشت گردی، چوری چکاری، جنسیت، شراب نوشی و دیگر نشہ آور اشیاء کا استعمال وغیرہ بڑھ جاتا ہے، ان غیر اخلاقی رویوں کا در آنا ہی سماج سے بیگانگی ہے۔ طاہرہ اقبال کا ناول "نیلی بار" مارکسی سماجی بیگانگی کا بہترین مظہر ہے جس نے ہر ہر پہلو کو مارکسی سوچ کے تحت اپنے اندر سمویا ہے۔ "نیلی بار" کو سماجی بیگانگی اور طبقاتی معاشرے کا آئینہ قرار دیا جا سکتا ہے جس میں ہر طرف پھیلی نحوست منہ کھولے دکھائی دیتی ہے۔

سماجی بیگانگی کا آغاز طبقائیت سے ہوتا ہے اور طبقائیت دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے یوں معاشرے میں طبقات وجود لیتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے اجنبی ہو جاتے ہیں۔ "نیلی بار" میں ناول کی ابتدا ہی سماجی بیگانگی سے ہوتی ہے تقسیم کے بعد جب ہجرت کر کے لوگ یہاں آ کر بسے تو مقامی پناہ

گیروں کو مہاجر زیادہ تقویت نہ دیتے وہ اُن پر ترس کھاتے تھے اور اُنھیں احساس کمتری سے دوچار کرتے تھے۔ باہر سے آنے والے خود کو اعلیٰ نسل اور ذات سے منسلک کرنے کے داعی تھے۔ لیکن مقامی باشندے بھی انھیں زیادہ عزت و محبت کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے کہ یہ باہر سے آکر ہمارے ذرائع پر قابض ہو رہے ہیں۔ یوں اُن کے درمیان سماجی بیگانگی اور اجنبیت کی بو آتی تھی۔

> پناہ گیر عورتیں اور بچے یہ چومکھی دیکھنے کو بھاگے چلے آئے جو اپنی زمینیں گھر، ڈھور ڈنگر چھوڑ چند جانیں بچالائے تھے اور زیادہ وہیں گنوا آئے تھے اور اب سے نئے دیس میں جٹ گوجر آرائیں وغیرہ کی بجائے مہاجر کہلاتے تھے اور ان جانگلیوں کے محتاج تھے جو انھیں پناہ گیر، پناہی اور مہاجر کہہ کر ترس کھاتے تھے اور یہ مہاجر ان وطنیوں کو معاشرتی لحاظ سے اپنے سے کمتر سمجھتے ہوئے جانگلی مسلی، چوہڑے کے تضحیک آمیز ناموں سے پکارتے تھے دونوں ایک دوسرے کی معاشرت، لباس اور زبان کا مذاق اُڑاتے اور ٹھٹھے لگاتے۔ (۳۹)

جاگیر داری سماج میں چوں کہ مختلف طبقات تھے جاگیر دار، مزارع، ترکھان، موچی، نائی، لوہار وغیرہ تو اس لحاظ سے اُن کے سماجی رتبے بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اس لیے جب ہجرت کر کے لوگ یہاں آئے تو انھی طبقات نے ایک دوسرے کو زیادہ عزت کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ انھیں ایک دوسرے سے زیادہ ہمدردی و دلچسپی نہ ہو سکی۔ باہر سے آنے والے اپنے گزشتہ ادوار کی بنا پر خود کو اعلیٰ حسب نسب سے پہچانے جانے کے خواہاں تھے جب کہ مقامی انھیں گھس بیٹھیا تصور کر کے اُن سے نفرت کرتے تھے کہ وہ اُن کی زمینوں پر قابض ہو رہے تھے اور مربعے الاٹ کرا رہے تھے۔ اس لیے اس اجنبیت کا بیج ابتدا سے ہی اس ملک کی جڑوں میں داخل ہو گیا تھا جو آج اپنے جوبن پر دکھائی دیتا ہے۔

باہر سے آنے والوں نے اپنی ذات پات کے اعلیٰ تصور کے ناسٹلجیا سے خود کو باہر نہیں نکالا اور یہاں کے ان کمی کمینوں کو اپنے غلام بنانے کی طرف زیادہ رجحان رکھا جس سے ایک واضح خلیج قائم ہوئی۔ زمینیں الاٹ کروا کر اُن سے زمینیں کاشت کرانا شروع کیں اور یوں آقا و غلام / جاگیر دار و مزارع کا ایک تصور پیدا ہوا۔ یہاں کے مقامی یوں ہی صدیوں سے باہر سے آنے والے گروہوں کے ہاتھوں میں استعمال ہوتے رہے اور اُن کے لیے پیداوار کو بڑھانے کام کام سرانجام دیتے رہے۔ باہر سے آنے والوں کو ہمیشہ اور اس کے باسیوں نے اُن کی امید سے زیادہ انھیں نوازا۔ ایسا ہی آزادی کے بعد ہوا اور یہاں کے مقامی کمتر، ذلیل، مطیع،

غلام و مزارع کہلائے اور نئے آنے والے حاکم، جاگیر دار و سرمایہ دار۔ یہی فرق ان کے درمیان طبقات کے قیام کا باعث بنا اور سماجی بیگانگی / انسانوں سے بیگانگی کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں۔

مقامی افراد صدیوں سے یوں ہی دنیا سے لاتعلق زندگی بسر کر رہے تھے۔ اُنھیں مذہب کی الف ب کا بھی پتا نہیں تھا۔ سماجی تعلقات / پیداواری امور سے زیادہ سروکار نہیں تھا وہ بس اتنا حاصل کر لیتے تھے جس سے اُن کی زندگی کی گاڑی کا پہیہ چلتا رہے۔ اس لیے باہر سے آنے والے اُن کی اس آزاد منش معاشرتی زندگی سے کراہت محسوس کرتے اور ان کی زندگیوں پر تھو تھو کرتے تھے۔ یہ مہاجر اپنی گزشتہ زندگی اور وطن کو یاد کرتے تھے اور یہاں کی صورت حال سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ اس لیے ماضی کی یادوں کو یاد کر کے حال پر طنز کرتے تھے۔ مقامی جاگیر دار انھیں گھس بیٹھیا کہہ کر انھیں زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔

مقامی جاگیر داروں اور باہر سے آکر بسنے والوں نے یہاں کے مفلس الحال افراد کو مزید پستی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ صدیوں سے بے نام و بے شناخت زندگی بسر کر رہے تھے اور اب انھیں مالکوں کے یہاں محنت کر کے زندگی بسر کرنی پڑ رہی تھی یوں اس جاگیر داری سماج نے ان مزارعوں، چوہڑے مسلیوں سے اُن کے نام کی پہچان بھی چھین لی اور انھی کی محنت پر مربعوں اور ایکڑوں کا چند افراد کو مالک بنا دیا۔ یوں یہ نادار سارا سارا دن کھیتوں پر کام کرتے اور خاندانی رشتوں سے بھی لاتعلق سے تھے اُن کا سماجی زندگی میں کوئی واضح کردار نہ تھا سوائے کھیتوں پر کام کرنے کے:

> مردوں کا گھروں کے اندر ہونا اس رہتل میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔ وہ مویشیوں کے باڑوں اور بہکوں میں حقے گڑ گڑاتے رات گزارتے تھے اور اُن کی بیویاں جیسے کوئی اجنبی عورتیں نہ راتوں کو ملیں نہ دن کو بات کرنے کا حوصلہ کر پائیں، نہ گھر کے کسی مسلے، رشتے ناتے میں صلاح مشورہ دے سکیں۔ (۴۰)

جاگیر داری سماج نے انھیں جانوروں کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا اور سماجی رشتے محض نام کے رہ گئے تھے۔ اُن کے درمیان کسی انسانی، جذباتی یا نوعی تعلق کی کوئی رمق بھی باقی نہ رہی تھی۔ عورتیں اور مرد ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ فطری تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بھی انھیں کسی مقام کی سہولت میسر نہ تھی اور وہ وقت بے وقت کھیتوں کھلیانوں میں ہی ان امور سے نبھا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ جاگیر داری سماج میں سماجی بیگانگی اور کیا ہو سکتی تھی کہ اُن کے درمیان فطری رشتے بھی پروان نہ چڑھ سکتے تھے۔

نیم جاگیر داریت کے اس سماج میں انسانوں سے انسانوں کی بیگانگی یقیناً پہلے کی نسبت کئی گنا بڑھ چکی

ہے۔ سرمایہ داریت نے منافعے کی جس لذت سے بالائی طبقے کو روشناس کرایا ہے اُس نے ان غریب جانگلیوں کی زندگیوں کو مزید دردناک بنادیا اور انھیں کسی سماجی رتبے و عزت کے قابل نہیں چھوڑا۔ اس سب کے لیے وہ اپنی بے پناہ طاقت کا استعمال کرتے ہیں اور نھیں کچلتے رہتے ہیں۔ انھیں سر اٹھا کر چلنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ اُن سے اُن کی طاقت اور نفس سے زیادہ اُن پر بوجھ ڈال دیتے ہیں تا کہ وہ اسی چکر میں گھومتے رہیں اور بالائی طبقے کی شان سلامت رہے اس کے لیے وہ ہر راہ کا استعمال کرتے ہیں۔ یوں ان کے درمیان کوئی انسانی سماجی رشتہ قائم نہیں ہو پاتا اور وہ محض منافع پیدا کرنے والی مشینیں بن کر جانوروں کی زندگی گزارنے پر مجبور رہتے ہیں۔ ملک فتح شیر اور ذیلدار کے درمیان یوں تبادلہ خیال ہوتا ہے:

> آپ تو جانتے ہیں سائیں۔ اپنی گرفت مضبوط رکھنے کو بعض اوقات رعیت کے ساتھ سختی بھی کرنا پڑتی ہے ورنہ جو آپ کے ساتھ ہوا، آپ جانتے ہی ہیں۔ ان غریبوں کو اگر آج رج کے کھانے اور سر اٹھا کر چلنے کی آپ اجازت دے دیں گے تو ان کا کمینہ خون کل آپ کے ہی خلاف جوش مارے گا۔ انھیں بھوکا اور لاغر رکھو۔ ان کا سر انھی کے کمزور کندھوں میں دھنسائے رکھو۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام لو ان کی انا کو ہر روز کچلتے رہو کہ کہیں یہ اپنی کوئی عزت و عزت نہ بنا بیٹھیں۔ ان کی عورتوں کو ان کی عزتوں کو پامال کرتے رہو تا کہ بے غیرت بن کر خوفزدہ رہیں۔ (۴۱)

طبقاتی نظام میں محنت کش و سرمایہ دار / جاگیر ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہوتے ہیں۔ بالائی طبقے اس نچلے طبقے سے گن محسوس کرتے ہیں اور انھیں کمزور سے کمزور تر بنا کر انھیں مجبور کرتے ہیں کہ وہ اُن کے ماتحت ہو جائیں۔ ان کا آپس میں تعلق مزدور و مالک کا ہوتا ہے باقی کسی سماجی انسانی تعلق کی گنجائش بھی نہیں ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے ایک سماج میں ایک جیسے انسانوں کے درمیان محض پیداواری رشتے کے علاوہ کوئی دوسرا تعلق نہیں ہوتا جو اس امر کی دلالت کرتا ہے کہ کیسے انسان ہی انسانوں کے لیے کسی اجنبی مخلوق کا روپ دھار لیتے ہیں یہ اجنبی پن انسانی و سماجی بیگانگی کی ہی مثال ہے۔ جاگیر دار اور مزارع کے درمیان محض پیداواری رشتہ انسان کی انسان سے بیگانگی ہی ہے۔ جمیل حیات لکھتے ہیں:

> پاکستانی معاشرے میں عموماً اور دیہی طرز معاشرت میں خصوصاً وڈیرے، جاگیر دار اور نواب، غریب عوام کو اپنی رعیت تسلیم کرتے ہیں۔ غریبوں کی نوجوان لڑکیوں سے جنسی حظ اٹھانا اور اُن کی عصمت دری کرنا امیر زادوں کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔

غریبوں کی ازلی بے بسی اور اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کی بجائے ظالموں کے مظالم سہنے والوں کی بے حسی، بے بسی اور سر جھکا کر سب ظلم سہہ جانے کی کیفیات کو طاہرہ نے تلخ حقیقت نگاری کے ذیل میں عمدگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ (۴۲)

یعنی جاگیر داری سماج میں مالک ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور ان غریبوں کو جس طریقے سے چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں۔ یوں یہ غریب و نادار کسی بھی لحاظ سے سماجی زندگی کو جینے کی خواہشات سے بے پرواہ اس سماجی ظلم کو سہتے رہتے ہیں اور اگر کہیں آواز اٹھانے کی جرات بھی کر لیں تو انھیں کچل دیا جاتا ہے۔

بھٹو کے دور میں کچھ نوجوانوں نے سیاسی سطح پر اس طبقاتی تفریق کے لیے جدوجہد کی لیکن اُن کی توقعات کے مطابق تبدیلی برپا نہ ہو سکی۔ وہ اپنی اس طبقاتی تفریق کی دلدل سے نکلنا چاہتے تھے جس نے انھیں سماج میں حقیر و ذلیل بنا کر اُن سے انسانی اقدار اور تہذیب کو بھی چھین لیا تھا۔ دہرے معیارات قائم ہو چکے تھے۔ سماج دو طبقوں میں بٹ کر اعلیٰ و ادنیٰ کے تصور پر قائم ہو چکا تھا۔ یہ لوگ جس زندگی کو جینے کے لیے مجبور ہیں وہ انسانوں کی نہیں بل کہ کیڑے مکوڑوں کی زندگی ہے اور کیڑے مکوڑوں کی زندگی گزارنے والے سماجی رویوں اور تہذیب و اقدار سے ناواقف ہوتے ہیں۔ وہ محض زندہ رہنے کی تگ و دو کرتے ہیں اس لیے اُن کے درمیان اور بالائی طبقے کے بیچ ایک واضع خلیج حائل ہوتی ہے جو طبقاتی تفریق کی دین ہوتی ہے۔

علی جواد اور اُس کے دوست احتجاج کرتے کرتے زارا فتح شیر کے گھر پہنچتے ہیں جہاں انھیں سخت بھوک نڈھال کر دیتی ہے اور وہ جانوروں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ زارا کو اُن کے یوں کھانا کھانے کے انداز سے کراہت محسوس ہوتی ہے اور وہ اُن پر طنز کے تیر چلاتی ہے کہ اُن کی زندگی کیڑے مکوڑوں کی زندگیوں سے بھی بدتر ہے۔ وہ انھیں غریب اجڈ، غیر مذہب اور سماجی رویوں سے بیگانہ ہونے کا طعنہ دیتی ہے لیکن یہ غریب خاموش اُس کھانے کو ٹھونسنے میں لگے ہوتے ہیں جنھوں نے پہلی بار زندگی میں ایک مہذب جگہ پر بیٹھ کر اتنا اچھا کھانا دیکھا تھا۔ وہ بھوک کی اس آگ کو مٹانے کے لیے زارا سے بے خبر پیٹ بھرنے میں لگے ہوتے ہیں۔ یہ سماجی بیگانگی کی وہ نوعیت ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ طبقات میں بٹی یہ دنیا انسان سے اُس کی تہذیب و اقدار بھی چھین لیتی ہے۔ بھوک کا یہ روگ انسان سے انسانیت بھی چھین لیتا ہے۔ اور اقدار بھی اُسے قائم اقدار و روایات اور تہذیب و ثقافت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔

علی نے جلے ہوئے حلق میں ایک اور کباب پھینکا۔۔۔۔ جیسے جلے پر پھاہا رکھ رہا ہو۔
باقی تینوں لڑکے تقریباً کھانا ختم کر چکے تھے۔ زارا نے یہ نظارہ اپنی حویلی میں بار بار دیکھا

تھا جب پوری روٹی کے بس دو نوالے ہی بنیں، جب کھانے کے ذائقے کی بجائے زبان تالو اور حلق کی جلن ہی محسوس ہو کھانا محض پیٹ بھرنے کے لیے ٹھونسا جائے چبا چبا کر مزے لیے لے کر نہیں۔ یکبارگی نگل کر کہ کہیں دوسرا اُچک نہ لے حلق میں انگلی ڈال کر نکال نہ لے۔ (۴۳)

جب طبقاتی سماج قائم ہوا تو پھر یہ تفریق عام طبقے کو زندگی کی حقیقتوں اور سہولتوں سے کاٹ دیتی ہے۔ اُن کا ایسی سماجی زندگی سے یوں لاتعلق ہونا مارکسی بیگانگی ہے جس کی بنیاد میں معیشت کا عنصر کارفرما ہوتا ہے اور وہ اسی سے متاثر ہو کر نفسیاتی پریشانیوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

طبقاتی سماج میں بالائی طبقہ کمتر طبقے سے ہمیشہ نفرت کرتا ہے اور انھیں ذلت میں جینے پر مجبور کرتا ہے۔ وہ اُن پر حکمرانی کر کے انھیں اپنا غلام بناتا ہے اور اُن سے محنت و عمل کرا کر عیاشی کرتا ہے۔ حالاں کہ ایک سماج میں بطور انسان سب برابر ہوتے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق سماج میں کردار ادا کرتے ہیں لیکن یہ طبقہ اُن سے اُن کی صلاحیتوں کو بھی چھین لیتا ہے اور انھیں ذلیل و رسوا کرتا رہتا ہے۔ انھیں کمزور طبقوں کو رسوا کرنے میں ایک سکون کا احساس ہوتا ہے اور شرمندگی بھی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ انسانوں کی انسانوں سے بیگانگی ہی ہے کہ طبقاتی تفریق انسانوں کو جانوروں کی زندگی جینے پر مجبور کر دیتی ہے:

تم شاید اپنے باپ اور بھائی کی زیادتیوں کا بدلہ اُس غریب جان سے لے رہی ہو۔ ذلیل کر کے، احسان جتا کر، اُس کی عزت نفس کو کچل کر، اُسے اچھا اچھا کھلا کر، احسان مند بنا کے۔۔۔ تمہیں اس سب سے وہی مزہ ملتا ہے جو تمھارے باپ کو پکڑی ہوئی لڑکیوں کو مرصع چھپر کھٹ میں بے عزت کرنے اور کھیتوں میں پسینہ گراتے کسانوں کو کھلا پلا کر ٹھڈے مارنے میں ملتا تھا۔ (۴۴)

طبقاتی سماج انسان کو اُس کی انسانی سطح سے گرا دیتا ہے۔ اس سماج میں پسا ہوا طبقہ ذلت بھری زندگی جیتا ہے۔ وہ انسانی تقاضوں سے بے خبر ہوتا ہے اور غیر اخلاقی رویے کا شکار ہو کر جرائم و نشے کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ کسی بھی لحاظ سے ایک سود مند شہری کی حیثیت سے معاشرے کا حصہ نہیں بن پاتا اور ہر ایک اُسے ذلیل و رسوا کرتا ہے۔ علی جواد اور زارا جب کچہری سے باہر نکلتے ہیں تو انھیں ان مفلس اجڈ اور بھیک منگوں کی بڑی تعداد گھیر لیتی ہے۔

وہ بھیک منگوں کو روندتا گالیوں کے چابک برستا چلا گیا۔ وہ جتنی سرعت سے انہیں پیچھے

چھوڑ رہا تھا وہ اُسی سرعت سے آگے بڑھ رہے تھے جن کے چہروں پر افلاس اور کمینگی کے قلم نے طبقاتی تفریق کی کہانی لکھ دی تھی کہ دولت و اقتدار کا حصار مفادات کا اتحاد ہے۔ اور غربت و افلاس کا انتشار طمع و لالچ کا نفاق ہے۔ (۴۵)

جاگیر داری سماج کی ایک خاص قسم کی نفسیات ہوتی ہیں جہاں ہر ایک اپنے شعور کے مطابق اپنے خیالات کا بھی اظہار کرتا اور اُسی مجموعی رویے کا شکار ہوتا جس میں وہ جی رہے ہوتا۔ عموماً دیہی سماج میں زیادہ تر غریب کسان و مزارع غیر اخلاقی سرگرمیوں کا حصہ بنتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو غیر اخلاقی ناموں سے پکارتے ہیں۔ گالیاں دیتے ہیں چھیڑ خوانی کرتے ہیں، چوری چکاری وغیرہ کرتے ہیں اور یہ رویہ انھیں کسی خاص متعین اخلاقی معیار کے نزدیک بھی بھٹکنے نہیں دیتا۔ لیکن دوسری طرف بالائی طبقہ بھی بیگانگی کا شکار ہوتا ہے وہ اپنی عزت و انا کے نام نہاد تحفظ کے لیے غیر انسانی رویے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بالخصوص جاگیر داری سماج میں ان جاگیر داروں کی بہنیں بیٹیاں نوعی زندگی سے بھی بیگانگی کی حیات پسند کرتی ہیں۔ صفورہ، بختاور اور پاکیزہ اس کی جیتی جاگتی مثال ہیں جنھیں کبھی چوکھٹ سے باہر قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں ملتی اور یوں وہ ساری زندگی اس ایک چار دیواری میں گزار کر مر جاتی ہیں بامار دی جاتی ہیں۔ ساجدہ سلطانہ "نیلی بار" کے اس پہلو کے حوالے سے لکھتی ہیں:

جاگیر داروں کے اس مردانہ سماج میں بیٹیوں کی شادی کا رواج نہیں ہے۔ اگر کوئی لڑکی اس ریت رواج سے انحراف کرنا چاہے تو اسے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔ حالات کی ستائی ہوئی یہ کمزور ہستیاں یا تو خودکشی کر لیتی ہیں یا پھر خوف اور جبر کا شکار ہو کر راہی عدم ہو جاتی ہیں۔ ان کی موت ان کے بڑوں کے سر سے منوں بوجھ اتار دیتی ہیں اور وہ شانت ہو جاتے ہیں۔ (۴۶)

ساتھ ہی ساتھ طاقت و اختیار کی لالچ انھیں اپنے ہی رشتوں سے کاٹ دیتی ہے اور وہ اس نشے میں اپنوں کے ہی دشمن بن جاتے ہیں۔ ملک عبدالرحمن کے باپ کا قتل اُس کے بیٹے کی لالچ و حوس اور بیگانگی ہی کی مثال ہے۔

طبقاتی سماج میں مذہب بھی تفریق اور استحصال کا باعث بنتا ہے۔ علی جواد کا سیاست سے ناکامی کے بعد مذہبی ہتھکنڈے کو استعمال کرنا اور اُس کے ذریعے عام عوام کے جذبات و احساسات کا قتل کرنا بلاشبہ انسانوں سے انسانوں کی بیگانگی کی واضح مثال ہے۔ جس مذہب نے انھیں تہذیب و اقدار کا درس دینا تھا وہی اُن کی

جانیں لینے کے لیے بھی استعمال ہوا۔ اس کی وجہ بھی محض غربت و افلاس تھا کہ جنہوں نے کبھی دنیا کی حقیقتوں کو دیکھا ہی نہ تھا وہ اس کا شکار ہو گئے اور غیر انسانی رویہ اپنا کر دہشت گردی و قتل و غارت گری کا ایندھن بنے:

> کیا وہ گھاک وہ افغانی و چیچن اور سوڈانی یہ جانتے تھے کہ حملہ ہونے والا ہے۔ اسی لیے نکل گئے۔ کوئی اطلاع دیے بنا کوئی حفاظتی تدابیر بتائے بنا ہی، کیا وہ اس موت کی وادی میں کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے کو چھوڑ دیئے گئے تھے۔ (۴۷)

مذہب انسانوں کے لیے نوعی اور سماجی زندگی میں کامیابی کا ہتھیار ہوتا ہے جس سے وابستہ رہ کر انسان ذہنی و قلبی سکون اور معاشرے میں انسانیت کا پرچار کرتا ہے۔ لیکن ان جاہل اجڈ لوگوں کے لیے یہ مذہب بھی استحصال کا ذریعہ بنا اور انھیں انسانی تقاضوں سے بیگانہ کر کے جنت کی دوڑ میں اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہانے کے لیے استعمال ہوا۔ یہ گنوار سماج سے بیگانے مذہب کی تعلیمات کو محض جنت کے حصول کا ایک ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ طاہرہ اقبال نے ناول کے آخری ابواب میں مذہب کے ہاتھوں اس استحصال اور سماج و انسانوں سے بیگانگی کو بیان کیا ہے، ظفر اقبال لکھتے ہیں:

> دیہاتیوں کے معصوم روحانی جذبے ۹/۱۱ کے بعد مذہبی تفسیر سے دوچار ہو کر مجاہد بننے کی استحصالی کتھا، وہ جو مذہب کو دور کوئی آسمانی شئے سمجھتے اور مسجد و ملا پر چھوڑ دیتے تھے ملا جو ان کے لیے "سپیی" تھا جیسے موچی نائی سپیی ہیں، وہ یکدم ان کی زندگیوں پر حاوی ہو گیا۔ (۴۸)

طاہرہ اقبال نے فوقی، صابر جان، گل جان، علی جواد، پیر اسرار احمد شاہ جیسے کرداروں کے ذریعے مذہب کے استعمال کی روداد بیان کی اور سخت مزاحمت کی۔ دوسرے ممالک سے پیسے کے عوض مذہبی قیادت کا سہارہ لے کر ان غریبوں کی بیگانگی کا خوب فائدہ اٹھایا، انھیں راکھ بنا کر اپنے جیب بھرے اور سامراجی طاقتوں کی خوشا آمد کی۔ یہ غریب طبقات میں بٹ کر جب بے شعور ہو جاتے ہیں تو انھیں یہ طاقت ور اپنے مقاصد کے لیے ہر طرح سے استعمال کر کے مارکس کے اس قول کو سچ ثابت کرتے ہیں کہ دولت و زر کی اس ہوس میں سماج میں موجود انسان ایک دوسرے سے بیگانے ہو کر جانوروں کی سطح سے بھی نیچے آجاتے ہیں۔ اس کا حتمی نتیجہ کسی غیر انسانی واقعے کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔

یہی سماجی بیگانگی انھیں مذہبی جذبات میں بھا کر لے گئی اور آج پاکستان اور دنیا میں دہشت گردی کا یہ ناسور انسانوں کی انسانوں سے بیگانگی کی وجہ بن کر سامنے آرہا ہے۔ آج ہر ایک کو دوسرے سے جس خوف کا

سامنا ہے، جس اجنبیت کا احساس ہے اس کی وجہ محض زیادہ سے زیادہ دولت اور طاقت کی ہوس ہے۔ جس نے سماج کی بنیادوں میں دراڑیں ڈال کر اسے منافع اور نفرت کی آگ میں جھونک دیا ہے اور طاہرہ نے اسی پہلو پر جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے خامہ فرسائی کی ہے اور اس طبقاتی تفریق کے خلاف اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے۔

۲۔ افراد کی نوعی زندگی سے بیگانگی:

نوعی زندگی سے بیگانگی کو سمجھنا ایک مشکل امر ہے اس لیے کہ اس کا اظہار ہوتا ہوا دکھائی نہیں دیتا ۔نوعی زندگی سے بیگانگی سے مراد ہے کہ جب انسان معاشی تنگی پر مجبور ہوتا ہے تو وہ اُس زندگی سے بیگانہ ہو جاتا ہے جو اُسے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے تخلیقیت اور یعنی احساسات و جذبات بھی اُس کی شخصیت سے خارج ہو جاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے "نیلی بار" میں جس زندگی کی تصویر کشی کی ہے اس میں بھی نوعی زندگی سے بیگانگی کی مثالیں مل جاتی ہیں "نیلی بار" پنجاب اور پاکستان کی تاریخ کا سیاسی، معاشی، ثقافتی، مذہبی اور سماجی بیانیہ ہے جس نے ہر ہر پہلو کو بڑے واضح اور خوب صورت انداز میں اپنے اندر سمویا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ نیلی بار کو طاہرہ اقبال کا کامیاب شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ بلال حسن بھٹی لکھتے ہیں:

> نیلی بار شناخت، سیاست، مذہب، دہشت گردی، دیہی و شہری زندگی میں فرق، امیروں کا غریبوں پر ظلم، عورتوں کے حقوق، پنجابی زبان اور پنجاب کے رنگوں کو اجاگر کرتا ایک عمدہ ناول ہے۔ ایسا ناول جو قاری کو کئی دہائیوں کی سیر کرواتے ہوئے مختلف سیاسی منظر ناموں اور نظاموں کے ساتھ ساتھ نیلی بار کی رہتل کے قدیم وجدید حقائق کا بہتر ادراک دیتا ہے۔ (۴۹)

"نیلی بار" میں نوعی زندگی سے بیگانگی کا اظہار مختلف پہلوؤں سے ہوتا ہے اور یہ سماجی زندگی سے بھی پھوٹتا ہے یعنی جب سماجی زندگی سے بیگانگی رونما ہوتی ہے تو لامحالہ نوعی زندگی سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے ۔ایک شخص جب سماج سے کٹتا ہے تو وہ نوعی زندگی سے خود بخود اس لیے کٹ جاتا ہے کہ انسانی نوعی تقاضا یہ کہتا ہے کہ انسان سماج بناتا ہے اور اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ارتقا اور ترقی کے لیے اہم کردار ادا کرتا ہے۔

سماج میں رہتے ہوئے خاندان بنانا، قبیلے بنانا اور طرز زندگی کو ایک ڈگر پر ڈالنا، رہائش و خوراک کا بندوبست کرنا، دوسروں کے لیے ہمدردی و تعاون کے جذبات رکھنا، غیر ضروری امور سے اجتناب برتنا بھی انسان کے نوعی تقاضوں میں شامل ہیں۔ لیکن "نیلی بار" کے مسلی چوہڑے، مزارع ان سب سے بے پرواہ

زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہیں۔ انھیں رہنے کے لیے چھت نہیں، پہننے کو لباس نہیں، کھانے کو خوراک نہیں اور جنسی خواہش کی تکمیل جو کہ انسان کے اندر حیوانی صفت ہے اور فطری تقاضا ہے کہ وہ اپنی نسل آگے بڑھاتا ہے جیسی اہم ضرورت پوری کرنے کی بھی سہولت میسر نہیں۔ یہ لوگ جانوروں کے ساتھ انھی کے باڑوں میں رہتے ہیں وہیں کھاتے پیتے ہیں کھیتوں میں جانوروں کی مانند اپنی جنسی ضروریات پورا کرنے پر مجبور ہیں۔ ایسی زندگی تو جانوروں کی ہوتی ہے جو یہ لوگ جینے پر مجبور ہیں اور نوعی زندگی سے بیگانے پیٹ پوجا کرتے کرتے گزر جاتے ہیں۔

انسان جس سماج کا حصہ ہوتا ہے اُس سماج میں رہتے ہوئے وہ دوسرے انسانوں کے لیے تعاون باہمی اور ہمدردی کے جذبات کے تحت مختلف امور سرانجام دیتا ہے لیکن جب انھیں معاشی جکڑ بندیوں میں قید کر دیا جاتا ہے تو وہ اس فطری جذبے سے بھی عاری ہو جاتے ہیں انھیں غلط اور صحیح میں فرق کرنے کے لیے پیٹ کے جہنم سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے "نیلی بار" کا ملک فتح شیر جب بارات کو روک کر کارروائی کرتا ہے تو گاوں کے تمام لوگ اس سب کو ہوتے دیکھ کر بھی گھروں میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں کہ اگر انھوں نے مدد کی تو انھیں اس کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا:

> بہکوں میں بیٹھے مردوں کے گروہ فوری رد عمل کے طور پر قافلے کی مدد کے لیے ڈانگ، سوٹا، برچھیاں سونت کر باہر نکلتے لیکن بندوق بردار گھڑ سواروں کو دیکھ کر واپس دھاروں میں چھپ جاتے کیونکہ انھیں معلوم تھا اُن کے بیلوں کی جوگیں اور دودھل بھینسیں کھول لی جائیں گی اور فصلیں اجاڑ دی جائیں گی۔۔۔[۵۰]

"نیلی بار" میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی طرف بھی طاہرہ اقبال نے رہنمائی کی ہے کہ کس طرح سے جاگیر داری سماج میں عورتوں کو بطور جنس کے ظلم و بربریت کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہاں جس عورت کا ذکر طاہرہ نے کیا ہے وہ صرف عورت ہے وہ کسی حاکم، جاگیر یا مزارع کی ہی عورت ہی نہیں جسے اس چکی میں پیسا جاتا ہو بلکہ بطور جنس کے۔ گاؤں میں ہونے والی شادی سے ہی عورت کے استحصال کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔ ست بھرائی کی شادی ہونے کے بعد اُس کی بارات کو روک کر لڑکیوں کو جنسی ہوس کے لیے پکڑنا اور ان بچیوں پر ہونے والے مظالم عورت کی داستان طلم بیان کرتے ہیں تو دوسری طرف صفورہ جسے نام نہاد عزت اور رتبے کی وجہ سے چار دیواری میں قید کر دیا جاتا ہے۔ وہ جس نے خاندان کی بنیاد رکھنی تھی نوع انسانی میں اپنا کردار ادا کرنا تھا اُسے دنیا سے بے خبر کر دیا جاتا ہے یہ کہانی صرف صفورہ کی کہانی نہیں بل کہ ہر جاگیر

دار کی حویلی کی کہانی ہے۔ صفورہ جو اٹھائیس سالہ زندگی گزار کر جب ایک دن مجبور ہو کر جنسی ملاپ کر لیتی ہے تو اُسے قتل کر دیا جاتا ہے۔ جب کہ خود دوسروں کی بہنوں بیٹیوں کو روز اس کمینگی سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ کرن ریاض چودھری لکھتی ہیں:

> طاہرہ اقبال نیلی بار کے ذریعے جاگیر دارانہ نظام میں موجود عورت کی محرومیوں کو بھی بیان کرتی ہیں۔ جنھیں مکمل انسانی وجود سمجھنے سے بھی انکار کر دیا گیا ہے۔ وہ کٹ پتلیوں کی طرح جاگیر داروں کے اشاروں پر اٹھتی بیٹھتی اور کھاتی پیتی ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اپنی تحریروں کے ذریعے عورت کے جذبات و احساسات اس کی داخلی کیفیت کا نہایت متاثر کن نقشہ کھینچا ہے انھوں نے نہ صرف عورت کے ساتھ ہونے والے ظلم و جبر اور ناانصافیوں کو ناول میں بیان کیا ہے بلکہ سماجی و معاشی حوالے سے عورت کے تصور کو بھی خوب اجاگر کیا ہے۔ (۵۱)

جاگیر داروں کی اپنی بیٹیاں حویلیوں میں قید تنہائی کی زندگی گزار کر مر جاتی ہیں یا انھیں مار دیا جاتا ہے ۔ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی عزت و مقام کی خاطر وہ صنفی تقسیم کو اسی معاشی حقیقت سے جوڑ دیتے ہیں۔ عام طبقے کی عورتیں کھیتوں میں کام کرتی ہیں۔ سماج میں نقل و حرکت کو دیکھتی ہیں خوشی غمی میں شریک ہوتی ہیں لیکن ان حویلیوں میں رہنے والیوں کی زندگی میں کوئی خوشی نہیں آتی۔ وہ حاکمیت کے تصور کے تحت جیتی ضرور ہیں لیکن ایسا جینا بھی نہ جینے کے برابر ہوتا ہے:

> اس حویلی کی فضاؤں نے تو کبھی کسی گڑیا کو رخصت ہی نہ کیا تھا۔ یہاں گڈے بیاہے جاتے تھے اور روز روز بیاہے جاتے تھے۔ گڑیاں تو اپنے ہی اکلاپے سے بیاہ دی جاتی تھیں۔ اپنے ہی وجود کے محبس میں اپنے ہی تصورات کی سرکشی سے نکاحی جاتی تھیں۔ (۵۲)

اس کے ساتھ ساتھ ناول کے مرکزی کرداروں میں سے پاکیزہ کی زندگی بھی دنیا سے کٹی ہوئی گزرتی ہے اور بختاور کا حال بھی صفورہ جیسا ہی ہوتا ہے۔ ست بھرائی اور اُس کے جیسی کئی اور لڑکیوں کی داستانیں سماج میں طبقاتی نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صنفی تقسیم اور ظلم کی عکاسی کرتی ہیں۔ ایک طرف غریب عورتیں اس ظلم کا شکار ہیں تو دوسری طرف کئی بالائی طبقے کی عورتیں بھی اُسی معاشی برتری کی وجہ سے اپنی نوعی زندگی جینے سے بھی قاصر ہیں۔ قتل و غارت گری، دہشت گردی انسانی نوعی تقاضے نہیں لیکن ہمارے سماج کی

عورتیں اس سے بھی دوچار ہوتی ہیں۔ انھیں سماجی معیارات پر سختی سے کاربند کرایا جاتا ہے۔ جو انھوں نے خود متعین نہین کیے اور اس میں بھول چوک پر انھیں زندہ درگور کر دیا جاتا ہے۔ جنھوں نے زندگی کی بہاریں دیکھنی ہوتی ہیں وہ سماجی رویوں اور معاشی طبقات کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ اپنی ہی نوع میں تقسیم کی نہ سمجھ میں آنے والی کہانی کی بنیاد بھی طبقات ہیں اور عورت ایک طبقے کی حیثیت سے جیتی ہے:

> ہائے ہائے ان محلوں سے بیٹیوں کے ڈولے نہیں اٹھتے، جنازے اُٹھتے ہیں۔ انھیں سورنگ مہندی چڑھتی ہے۔ انھیں زخموں کے گہنے چڑھتے ہیں۔ ان کی کھاٹ کہار اُٹھاتے ہیں۔ یہ ڈر کی سیج پر آپ ہی پھاہی لگتی ہیں۔ یہ پردے کی چادر میں ڈر کی بکل مار چپ چپیتے مر جاتی ہیں۔ (۵۳)

سماج میں رہتے ہوئے انسان جانوروں سے اپنے آپ کو شعور و عقل اور جذبات و احساسات کی بنیاد ممتاز حیثیت دیتا ہے۔ وہ ماحول قائم کرتا ہے اور اسی کے مطابق اپنی شخصیت کو بناتا اور سنوارتا ہے۔ تعلیم انسانی نوعی تقاضا ہے جس سے انسان اپنی ذمہ داریوں سے آگاہی حاصل کرتا ہے لیکن جس سماج میں تعلیم بھی محض روٹین ورک بن جائے اور اس سے کسی عملی نتیجے کا اظہار نہ ہو تو تعلیم کا مقصد ختم ہو جاتا ہے۔ علی جواد جو کہ ایک سیاسی کردار ہے یونی ورسٹی کا طالب علم ہے لیکن اس کی سیاسی جدوجہد سرمایہ داروں کے ہاتھوں کی ملکیت بن جاتی ہے تو وہ خود کو سیاست کے ساتھ ساتھ تعلیم سے بھی الگ کر لیتا ہے۔

چوں کہ ہمارے سماج میں تعلیم محض نوکری حاصل کرنے اور بدلے میں آسائشات کی فراہمی کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔ اس لیے یہ ہمارے نوعی تقاضوں کو نکھارنے کے بجائے اسے قدامت پرست اور شدت پسند بنا دیتی ہے۔ علی جواد کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ رونما ہوا ایک طرف سے سیاسی ناکامی اور دوسری طرف زارا فتح شیر کے ساتھ شادی اور پھر طلاق کا ہو جانا۔ مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے نوعی تقاضوں سے محروم ہو چکا تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی نے اُسے جب ایک پر تعیش زندگی میں دھکیلا تو وہ انسانی مقام کو بھول گیا اور استحصال کے بدلے کی آگ نے کئیوں کو اُسی آگ کا ایندھن بھی بنایا:

> وہ بے اختیار ہنس پڑا جیسے کہتا ہو اب مجھے کیسے بہلاؤں پھر سبز چوغا سنبھالنا منبر کی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔ زارا بیگم! جب لوگ از خود بیوقوف بننے کو بے قرار ہوں تو سمجھ دار لوگ موقع ضائع نہیں جانے دیتے۔ آج کل اس جنس کی خوب مانگ ہے۔ ادھر امریکہ اس کی بڑی منڈی ہے۔ کھیپ پر کھیپ وساور کو بھیجی جا رہی ہے۔ آج سب سے

منافع بخش کاروبار یہی ہے۔ دنیا بھی کماواور دین بھی بچاو ، یہ امیر المومنین کا حکم ہے۔[۵۴]

بظاہر علی جواد کا سیاست سے مایوس ہو کر مذہبی روپ اختیار کرلینا کوئی بڑا مسئلہ نہیں لیکن وہ جن حالات سے گزارا تھا اُس سے اُس کے اندر کا انسان مر جاتا ہے۔ وہ پیسے کی ہوس میں ایک روحانی سکون کا باعث بننے والے ٹول کو استعمال کرتا ہے۔ وہ مذہب جس سے لوگ دینی و دنیاوی رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ روحانی و مذہبی قلب کی خاطر کسی عقیدے سے جڑتے ہیں مگر اُن کی معاشی بدحالی انھیں اس سے دور کر دیتی ہے۔ جو مذہب یا عقیدہ انسانیت کے جذبات پیدا کرتا ہے، سماج میں آگے بڑھنے اور تعاون باہمی کے تحت زندگی بسر کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اُسی کا نہ صرف ناجائز استعمال کیا جاتا ہے بل کہ یہ اکثر افراد معاشرہ کو اس سے یکسر بیگانہ کر دیتی ہے۔ "نیلی بار" میں اس پہلو کو گہرائی سے واضح کیا گیا ہے۔ گاؤں اور دیہاتوں کے غریب غربا جن کو اپنے نام بھی پتا نہیں تھے انھیں مذہب کا لالی پاپ دے کر کئی بے گناہ لوگوں کی جانیں لی گئیں۔

نوجوانوں کو جہاد فی سبیل اللہ کے نام پر مدرسوں میں ذلت کی زندگی سے دوچار کیا جاتا رہا۔ ملائی تسلط نے ان غریبوں کے بچوں کے ساتھ نہ صرف جنسی ہوس پوری کی بل کہ اُن کے جذبات کا منفی استعمال کیا جن سے ان کو تو کوئی خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہوئی لیکن یہ مذہبی ٹھیکیدار بڑے بڑے عالم کہلائے اور امریکن ڈالر اور سعودی ریالوں سے اپنے خزانے بھی بھرے:

> ارے ان کم فہموں کو موت کی شرط پر چوروں کا وعدہ اور خود روز روز نت نئ ۔۔۔۔۔تم سے توبہ یہ ظالم جاگیر دار ہی انصاف پسند ٹھہرے کے استعمال شدگان سے جی بھر جاتا تو اپنے رسہ گیروں اور ڈکیتوں میں تقسیم کر دیتے۔ کتنی کڑی شرط رکھی ہے علامہ صاحب آپ نے خود دنیا میں ہی فردوس بریں کے مزے اور انھیں آپ کے حکم پر تجویز کردہ موت سے گزرنے کے بعد فقط وعدہ حور۔[۵۵]

یہ کمی کمین ، جاہل ان پڑھ، غربت و افلاس کے ستائے کیا جانیں کہ انھیں جس مقصد کے لیے مدرسوں میں تعلیم دی جارہی ہے وہ انسانیت کے لیے موت کے پیغام کا باعث ہے۔ وہ تو فقط مولانا حضرات کی تقاریر سے ہی متاثر ہوتے تھے۔ جنھیں تعلیم یا مذہبی شعور سے آراستہ نہیں کیا گیا تھا وہ کوئی دوسری دنیا کی مخلوق نہیں تھے بل کہ اسی سرزمین کے سپوت تھے۔ جن سے زندگی کی ہر سہولت چھین کر انھیں انسانیت سے کاٹ دیا گیا تھا جس کا ناسور آج بھی اس ملک کی جڑوں کو نگل رہا ہے۔ ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں انسانی جانوں کا ضیاع ہو رہا ہے۔

غریب غربا پیسے کی ضرورت اور لالچ میں خودکشی، قتل وغارت اور دہشت گردی کا ایندھن بن رہے ہیں۔

افغانستان میں جاکر لڑنے والے کسی امیر گھرانے کے بچے نہیں تھے بل کہ وہاں لڑنے والے وہ افراد تھے جن کے گھروں پر فاقے تھے اور جہالت تھی۔ اس جہالت اور فاقے کے نتیجے میں ان کے جذبات کا استحصال ہوا۔ غریبوں نے اپنے بچوں کو مدرسوں میں داخل کرایا جہاں سے انھیں تیار کرکے آگے بھیجا جاتا رہا۔ انھیں نہ نماز کا طریقہ آتا تھا نہ اذان و وضو کا اور نہ ہی انھیں عقیدے کے مطابق کلمے یاد تھے۔ جب افراد معاشرہ زندگی کی مادی الجھنوں میں ہی پھنس کر دہ جائیں تو ایسے میں نوعی تقاضے بے معنی ہو جاتے ہیں۔ فوقی، لیاقتی، گل جان، صابر جان جیسے کردار انھی افراد معاشرہ کے نمائندے ہیں۔ حیات جمیل لکھتے ہیں:

> علی جواد معاویہ جیسے مکروہ فعل لوگوں نے غریبوں کے بچوں کو افغانستان کی جنگ کا ایندھن بنایا۔ طاہرہ نے مولوی اور افغان غازی مجاہد کی حضرت علی سے شدید نفرت کو واضح انداز میں بیان کیا ہے جب انہیں لڑکوں کے علی کا نعرہ لگانے پر غصہ آیا۔ ہاتھ کھولنے پر افغانی مجاہد نے اٹھارہ سالہ پاکستانی لڑکے کو قتل کر دیا کہ اس کو نماز نہیں آتی۔ (۵۶)

یہ مجاہد جو افغانستان میں دین کی حفاظت کے لیے تیار کیے گئے تھے انھیں تو بنیادی عقیدے کے وجود سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ تو ایک کلمہ سیدھا کرکے پڑھنے میں مہارت حاصل نہ کر سکے تھے، قرآن سے اُن کا دور دور کا واسطہ تک نہ تھا۔ کبھی انھیں اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہوتی یا کسی سزا سے بچنا ہوتا تھا تو اس مقدس کتاب کی قسم کھانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے یا کبھی نکاح کے وقت مولوی صاحب انھیں کلمے پڑھا دیتے تھے۔ اس لیے جب وہ جہاد پر گئے تو انھیں نہ صرف دینی امور سے ناواقفیت تھی بل کہ تفرقوں میں بٹنے کی وجہ سے وہ جو تھوڑا بہت جانتے تھے وہ بھی دوسروں پر اعتراض کرتے تھے۔ جن کو بالکل بھی کچھ آتا نہیں ہوتا تھا اور کچھ ایسے بھی تھے جو محض نقل کرتے تھے۔ جب ان کے ساتھی اُن سے الگ ہو گئے تو انھیں یہ پریشانی ستانے لگی کہ اب وہ کس کو دیکھ کر اس مذہبی فریضے کی ادائیگی کریں گے:

> اب پیچھے رہ جانے والے غیر تربیت یافتہ میدانی تھے جو نہیں جانتے تھے کہ وہ انھیں کیوں چھوڑ گئے ہیں اور اب ان کا کمانڈر کون ہے۔ اب وہ کس کی امامت میں نماز پڑھیں گے۔ دوران نماز کس کی نقل کریں گے اگر نقل نہیں کریں گے تو پھر شرع کا تعین کون کرے گا۔ (۵۷)

"نیلی بار" کے کردار اور اُن سے جڑے افراد مجموعی لحاظ سے سماجی و نوعی بیگانگی کا شکار ہیں۔ وہ سماج

میں رہتے ہوئے بھی سماج کا حصہ نہیں ہیں۔ اُن کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر زندگی ہے۔ جن کی بنیادی ضروریات ہی کبھی پوری نہ ہوتی ہوں وہ سماج میں کسی اعلیٰ پائے کے کردار کو کیسے ادا کرسکتے ہیں۔ ایسے ہی جب وہ اپنی سماجی زندگی سے بیگانے ہوتے ہیں اُنھیں اپنے جیسے نوع کے دوسرے انسانوں سے بھی کوئی رشتہ لگاو نہیں ہوتا تو لامحالہ وہ نوعی بیگانگی کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے شعوری اور غیر شعوری دونوں اعتبار سے ناول کی جڑوں میں استحصال کی حکمت عملی کو بھی باخوبی بیان کیا۔ سیاست، معیشت، مذہب اور سماجی معاملات میں ہونے والے ظلم و ستم کی داستان سرائی نہایت عمدگی سے کی۔ آج اکیسویں صدی میں بھی جب مارکسی تھیوری کو پس پردہ ڈالنے کی ناکام کوششیں کی جارہی ہیں طاہرہ اقبال نے جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی اسی سوچ کے تحت ان ساڑھے پانچ سو صفحات کو تاریخی اعتبار سے نہایت دلچسپی سے پرودیا ہے۔ یقیناً طاہرہ اقبال عہد حاضر کی مارکسی سوچ کی عنائیت اور جاگیر داریت و سرمایہ داریت کی کڑ مخالف نقاد کے روپ میں کھڑی ہیں۔

طاہرہ اقبال کا ناول "نیلی بار" ہر ہر لحاظ سے مکمل فکری اہمیت کا حامل ہے اگرچہ فنی اعتبار سے کچھ نہ سمجھ میں آنے والے واقعات اور کرداروں کے رویے کو بیان کیا ہے اس کے باوجود ناول میں کہیں کوئی فکری کمی نظر نہیں آتی۔ ایک تخلیق کار ہونے کے ناتے انھوں نے سماج کا باخوبی مشاہدہ اور مطالعہ کیا ہے جس کا نتیجہ "نیلی بار" کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔

حوالہ جات

۱۔مظہر عباس،اردو ناول پر جدیدیت کے فکری و فنی اثرات،پی ایچ۔ڈی اردو،(غیر مطبوعہ)مملوکہ اسلامیہ یونیورسٹی،بہاولپور،س ن،ص۶۹-۷۰

۲۔گدی،الیاس احمد،فائر ایریا،معیار پبلی کیشنز،نئی دہلی،۱۹۹۴ء ص۲۱

۳۔ایضاً، ص۳۷

۴۔ایضاً، ص۶۶

۵۔ ایضاً، ص۱۰۸

۶۔ ایضاً،ص۲۳۹

۷۔خالد اشرف،ہندوستانی اردو ناول کی نصف صدی،(مضمون) مطبوعہ: اقدار،شمارہ ۱، ۲۰۰۱ء دہلی، ص ۲۰۷۔۲۰۸

۸۔احمد صغیر،ڈاکٹر،اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ء کے بعد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۵ء،ص۱۴۹-۱۵۰

۹۔گدی،الیاس احمد،فائر ایریا،ص۵۳

۱۰۔ایضاً،ص۱۲۴

۱۱۔ایضاً،۲۲۴

۱۲۔ایضاً،۳۰۰-۳۰۱

۱۳۔بشریٰ رحمن،(تبصرہ)زندگی کھوجتا ناول،جہنمی لوگ از شیراز زیدی،فکشن ہاوس،لاہور،۲۰۰۲ء ص۷

۱۴۔ایضاً،ص۱۵

۱۵۔ ایضاً،ص۱۶

۱۶۔ ایضاً،ص۲۲

۱۷۔ ایضاً،ص۳۰

۱۸۔ ایضاً،ص۹۴

۱۹۔ ایضاً،ص۱۰۳

۲۰۔ممتاز احمد خان،ڈاکٹر،اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار،فکشن ہاؤس،لاہور،۲۰۱۲ء۱۵۵

۲۱۔شیراز زیدی،جہنمی لوگ،ص۱۷

۲۲۔ایضاً،ص۹۷

۲۳۔ایضاً،ص۱۳۲

۲۴۔سلیم شہزاد،(تبصرہ)جنت کا جہنم،جہنمی لوگ از شیراز زیدی،ص۱۰

۲۵۔رفعت رفیق،عالمگیریت اور اردو ناول،پی ایچ۔ڈی اردو،(غیر مطبوعہ)مملوکہ،اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی،لاہور،۲۰۲۰ء،ص۲۹۷

۲۶۔تارڑ،مستنصر حسین،خس و خاشاک زمانے،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۷ء،ص۱۵۹

۲۷۔ایضاً، ص۲۶۴

۲۸۔ایضاً،ص۱۸۱

۲۹۔ایضاً،ص ۱۹۸

۳۰۔ایضاً،ص ۳۰۵

۳۱۔محمد سہیل،اردو ناول پر ۹/۱۱کے اثرات،(مضمون)مطبوعہ: انجمن ترقی اردو، شمارہ ۲،۲۰۲۰ء، کراچی،ص۱۸۸

۳۲۔تارڑ،مستنصر حسین،خس و خا شاک زمانے،ص۵۸۴

۳۳۔محمد کامران شہزاد،پاکستانی اردو ناول میں مزاحمتی رجحانات،پی ایچ۔ڈی اردو،(غیر مطبوعہ)مملوکہ گورنمنٹ یونی ورسٹی فیصل آباد،فیصل آباد،۲۰۱۹ءص۲۰۳

۳۴۔فرید حسینی،ڈاکٹر،مستنصر حسین تارڑ کے ناول"خس و خاشاک زمانے "کا تہذیبی مطالعہ،(مضمون) مطبوعہ:ادبیات،شمارہ ۱۲۳-۱۲۴جلد دوم،۲۰۲۰، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد،ص۲۴۹

۳۵۔تارڑ،مستنصر حسین،خس و خاشاک زمانے،ص۸۵

۳۶۔ایضاً،ص۳۱۵

۳۷۔ ایضاً،ص۵۰۴-۵۰۵

۳۸۔ایضاً،ص۳۷۳

۳۹۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،دوست پبلی کیشنز،اسلام آباد،۲۰۱۷،ص۱۲

۴۰۔ ایضاً،ص۲۹

۴۱۔ایضاً،ص۸۰

۴۲۔ جمیل حیات، نیلی بار از طاہرہ اقبال فکری و فنی جائزہ،(مضمون) مشمولہ:اردو ناول کی پیش رفت،مرتبہ ڈاکٹر منصور خوشتر،بک ٹاک لاہور،۲۰۱۹ء،ص۲۵۲
۴۳۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۱۱۵
۴۴۔ایضاً،ص۱۲۳
۴۵۔ایضاً،ص۱۶۳
۴۶۔ساجدہ سلطانہ،طاہرہ اقبال کے ناول"نیلی بار"کا فکری و فنی جائزہ،ایم۔فل اردو،(غیر مطبوعہ) مملوکہ،نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز،اسلام آباد،۲۰۱۹،ص۵۳
۴۷۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۴۲۵
۴۸۔ظفر اقبال،طاہرہ اقبال کا نیا
ناول،www.dunya.com.pk،۲۷اپریل۲۰۱۷ء03:22pm
۴۹۔بلال حسن بھٹی،نیلی بار:طاہرہ اقبال،www.jaeza.com،۲۸اگست ۲۰۱۹ء07:11am
۵۰۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۳۹
۵۱۔کرن ریاض چودھری،طاہرہ اقبال کا ناول"نیلی بار "تفہیم و تجزیہ،مثال پبلشرز،فیصل آباد،۲۰۱۸ءص۴۴
۵۲۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۵۱
۵۳۔ایضاً،ص۹۴
۵۴۔ایضاً،ص۱۸۲
۵۵۔ایضاً،ص۲۵۴
۵۶۔جمیل حیات،نیلی بار از طاہرہ اقبال فکری و فنی جائزہ،(مضمون) مشمولہ:اردو ناول کی پیش رفت،مرتبہ ڈاکٹر منصور خوشتر،بک ٹاک لاہور،۲۰۱۹ء،ص۲۶۱
۵۷۔طاہرہ اقبال،نیلی بار،ص۴۲۰

ماحصل

(الف) مجموعی جائزہ:

بیگانگی کا تصور یوں تو کافی قدیم ہے تاہم دور جدید میں بیگانگی سرمایہ درانہ سماج کا ایک ناسور ہے۔ صنعتی انقلاب نے زرعی دور کے اصولوں،رواجوں اور تہذیب و ثقافت کو بدل کر ایک نئی طرح ڈالی۔پیداوار کے ڈھیر نے نئی انسانی منڈیوں کی تلاش کی اور سرمایہ داریت و سامراجیت کا آغاز ہوا۔جاگیر داری سماج کا کسان و غلام سرمایہ داریت کا اجرتی مزدور ٹھہرا۔سرمایہ داریت کے چند سو برسوں نے ہی انسان سے اس کی انسانیت اور انفرادیت و شناخت کو چھین لیا۔جہاں انسان کو ترقی دی وہیں استحصال کے نئے ہتھکنڈے بھی رائج ہوئے۔اس نظام نے ترقی کو چند افراد تک محدود کر دیا۔زرعی دور کے جاگیر دار اب سرمایہ دار کہلانے لگے۔

بیسویں صدی کی جنگوں اور معاشی استحصال نے انسان کو شکست و ریخت اور داخلی انتشار کا شکار کیا۔مذہب سے بیگانگی تو پہلے ہی پیدا ہو رہی تھی اپنے ہم جنسوں کے لیے بھی احساس ماند پڑنے لگا۔سائنس کی بے پناہ ترقی کے باوجود وہ طرح طرح کے مسائل سے دو چار ہوا۔وجودیوں نے اسے داخلیت سے جوڑا اور فرد کی آزادی کی راہ میں رکاوٹ سماجی پابندیوں کو بیگانگی کی وجہ گردانا۔جب کہ کارل مارکس اسے پہلے سے معاشی بنیادیں فراہم کر کے یہ واضح کر چکا تھا کہ انسان کی اس بیگانگی کی وجہ طبقاتی نظام اور محنت کا استحصال ہے۔اس کے خیال میں خاص قسم کے معاشی جبر کے اس نظام نے اجنبیت / بیگانگی (Alienation)کی کیفیت کو جنم دیا۔اگر چہ اس سے قبل بھی بیگانگی کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی تا ہم اس کی نوعیت و شدت میں سرمایہ داری نظام نے معاشرے کو طبقات میں بانٹ کر اضافہ کیا۔

سرمایہ دارانہ نظام نے فرد سے اس کی محنت کو چھین لیا وہ محنت جس کی بنیاد پر وہ انسانیت اور ایک الگ شناخت کا حامل تھا۔وہ رفتہ رفتہ اپنی بنائی ہوئی اشیا،اپنے سماج اور پھر اپنے آپ سے بھی بیگانگی کا شکار ہو گیا۔مارکس نے سرمایہ داری نظام کے مدمقابل کیمونزم کا تصور پیش کیا اور سماج میں اس بیگانگی کی مختلف صورتوں کی وضاحت کی۔ اس کے نزدیک جب سماج میں محنت کش کو اس کی محنت کی پیداوار کا صلہ نہیں ملتا تو بیگانگی کا آغاز ہوتا ہے۔یوں وہ پیداوار، محنت،سماج اور نوعی

تقاضوں سے لاتعلق سا ہو جاتا ہے۔جس سے سماجی انتشار،بدامنی،خوف،دہشت،اجنبیت،بے چینی،لالچ،خود غرضی،جہالت اور جرائم کا آغاز ہوتا ہے اور یہ دائرہ پھیل کر پوری دنیا تک پہنچ جاتا ہے۔

برصغیر میں صدیوں سے جاگیرداری نظام رائج تھا جسے برطانوی سامراج نے صنعتی انقلاب کے بعد تجارت کے نام پہ اپنا پنجہ یہاں مضبوط کیا۔معاشی،سیاسی اور سماجی استحصال کیااور جب گرفت ڈھیلی پڑنے لگی تو صدیوں سے مختلف مذاہب کے اکٹھے رہنے والے افراد میں پھوٹ ڈال کر تقسیم کیا۔معاشی و سیاسی غلامی میں دھکیلا جس نے فرد کے داخل میں فرار اور لاتعلقی کی کیفیات کو جنم دیا۔اس کا اظہار سماج کے ساتھ ادب میں بھی ہونے لگا۔

ادب سماج سے کوئی الگ شئے نہیں بلکہ ادب سماج ہی کا آئینہ ہوتا ہے۔اردو ناول میں حقیقت پرستی اسی استحصال کا نتیجہ ہے۔منشی پریم چند نے اپنے ناولوں میں جاگیرداری سماج کے استحصال کو برتا۔"گئودان"اس تناظر میں ان کا نمائندہ ناول ہے جس میں کسان کے استحصال اور اس کی بیگانگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔کرشن چندر نے جاگیرداریت اور سرمایہ داریت کے خلاف بہترین ناول تخلیق کیے۔ "طوفان کی کلیاں"مارکسی بیگانگی کی عمدہ مثال ہے جس میں مزدوروں کے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم اور ان کی سماجی بیگانگی کے واضح عناصر ملتے ہیں۔

لندن کی ایک رات "،"ٹیڑھی لکیر "،" خدا کی بستی "،" نادار لوگ "،"آگ "،" خوشیوں کا باغ "اور"میرا گاوں "مارکسی بیگانگی کا اظہار ہیں۔اردو ناول نگاروں نے شعوری و غیر شعوری طور پر استحصال اور طبقاتیت کے اثرات کو اپنی فکر کا حصہ بنایا اور پیدا ہونے والی بیگانگی اور اس کے اثرات کو بھی ناولوں میں جگہ دی ہے۔اسی طرح ہجرت کے تناظر میں لکھے جانے والے ناول بھی سماجی بیگانگی کا اظہار ہیں۔ سماجی ناہمواری اور استحصال کے نتیجے میں آنکھوں میں سجائے خوابوں کے چکنا چور ہونے اے پیدا ہوئی۔

سماج میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ،اونچ نیچ،سیاسی و معاشی مسائل،چوری،کرپشن،منشیات کا استعمال،دہشت گردی،جنسیت سمیت دیگر مسائل نیم جاگیرداریت اور سرمایہ داری نظام کی دین ہیں۔حتی کہ مذہبی استحصال،مذاہب کی چپقلش اور قوموں کے درمیان جاری کشیدگی بھی اسی سرمایے

کے نظام کا شاخسانہ ہے۔اردو کا بیشتر افسانوی ادب بالخصوص ناول مارکسی بیگانگی اور اثرات کی مثالیں ہیں ۔

الیاس احمد گدی نے "فائر ایریا "جیسا شاہکار ناول ۱۹۹۴ء میں تخلیق کیا۔یہ ناول خالصتا مزدور طبقے کی زندگی کا نمائندہ ہے۔اس کی بنیاد ہی میں مارکسی فکر کی کارفرمائی ہے۔یا یوں کہیں کہ مارکسی نظریات کو بنیاد بنا کر تحریر کیا جانے والا مزدور ناول ہے۔یہ نہ صرف اس بیگانگی کو بیان کرتا ہے بلکہ اس کے اثرات کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔یہاں کے مزدور و محنت کش لیڈروں اور ٹھیکداروں کے ظلم سے تنگ آ کر غیر سماجی اور حیوانی رویہ اپنانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔وہ طبقاتیت کی اس چکی میں پستے پستے طرح طرح کے جرائم منشیات کا استعمال،سود خوری،قتل اور دہشت گردی،چوری چکاری،کرپشن کے ساتھ ساتھ بداخلاقی،لالچ،خود غرضی اور نفسانفسی کی کیفیت سے دوچار ہو کر حیوانیت کے درجے پہ فائز ہو جاتے ہیں۔

کولریوں میں ہونے والی لوٹ کھسوٹ ایک طرف دو طبقوں کے درمیان لکیر کھینچتی ہے تو دوسری طرف طبقاتیت کے زیر اثر صحت و تعلیم کی ناکافی سہولیات اور بےشعوری بھی سر چڑھ کر بولتی ہے۔ساتھ ہی ساتھ پس منظر میں جاگیرداری سماج کے استحصال اور عورت کے ساتھ برتے جانے والے رویے بھی ناول کا حصہ ہیں جو انسانوں سے انسانوں کی بیگانگی کی مثال ہے۔"فائر ایریا" مارکسی بیگانگی کا نہ صرف مظہر ہے بلکہ ناول کا اختتام بھی مارکسی فکر پر ہوتا ہے۔الیاس احمد گدی نے کمیونزم کی فکر کو عملی طور پر لاگو کرنےاور مستقبل کے نظام کے طور پہ اس کی کامیابی کی طرف بھی رہنمائی کی۔

شیراز زیدی کا ناول "جہنمی لوگ"۲۰۰۱ء میں مارکسی فکر کو بنیاد بنا کر تحریر کیا جانے والا اکیسویں صدی کا مختصر ناول ہے۔ٹھیکیداروں کے ذریعے ہونے والے استحصال،زیادہ کام لینے،سہولیات کے ناکافی ہونے اور مزدوروں کی ذلت بھری زندگی کو اس ناول کے موضوعات میں سمیٹا گیا ہے۔راجگیروں کے ساتھ کام کرنے والے مزدور ذلت بھری زندگی جینے پر مجبور ہیں اور ان کی بستی کی خستہ حالی کا تذکرہ شیراز زیدی نے بھرپور انداز میں کیا ہے۔یہ مختصر ناول سماجی پستی اور ذلت کی نہ صرف عکاسی کرتا ہے بلکہ دہرے سماجی رویے کا بھی نمائندہ ہے۔

محنت کش کی محنت سے، محنت کی پیداوار سے یا سماج اور نوعی زندگی سے بیگانگی انسانی زندگی کو بے معنی اور بے وقعت بنا دیتی ہے۔کہانی نواز کے گھر کے گرد گھومتی ہے جس میں نعمت، جنت اور فضلا رہتے ہیں اور دیگر کردار ناول کو آگے بڑھانے میں حصہ دار ہیں۔بسنتی اور چھیما کے کردار جاندار ہیں جن کے ذریعے سے استحصال کی تمام تر شکلیں زیادہ واضح ہوتی ہیں۔جنت کی موت پہ کہانی کا اختتام ہوتا ہے جو ٹی بی کی مریض ہے۔شیراز زیدی نے اس بستی کی غربت، افلاس اور صحت و تعلیم کی ناکافی سہولیات کے اثرات اور انتہائی ذلت بھری زندگی جینے والوں کی زندگیوں کو سماج سے لاتعلق صرف زندہ رہنے کی جدوجہد میں دکھلایا ہے جو محنت کرتے ہیں لیکن پیٹ بھر کر کھانا کھانے کی صلاحیت سے بھی محروم ہیں۔

نواز اور اور اس جیسے مزدور اپنی مجبوریوں کو کوڑیوں کے دام ٹھیکداروں و سرمایہ داروں کے ہاتھوں فروخت کرتے ہیں۔مزدوروں کی ساری بستی سماجی بیگانگی کا شکار ہے اور اسی بیگانگی نے انھیں حیوانوں کی زندگی جینے پر مجبور رکھا ہے۔جنت جس کا گھر ناول کا مرکزی کردار ہے اس قدر بے بس و مجبور ہو جاتی ہے کہ اپنے بھائی کی لاش کو دیکھنے سے بھی قاصر ہوتی ہے۔جنت کا گھر اس بستی اور یہ بستی ہمارے مجموعی سماج کی نمائندہ ہے۔غربت چوری چکاری، بھیک مانگنا، جہالت، بیماری، بداخلاقی، جنسیت اسی طبقاتی سماج کی دین ہیں۔صرف یہی نہیں ایک طرف محنت کشوں کی زندگیوں کی تصویر ہے تو دوسری طرف انھی کی محنت کا صلہ کھانے والوں کی بستیاں ہیں جن کے کتے بھی امپورٹڈ غذائیں کھاتے ہیں۔ایک طرف لوگ جھگیوں میں رہتے ہیں تو دوسری طرف کوٹھے، بنگلے اور گاڑیاں ہیں۔

مستنصر حسین تارڑ کا ناول "خس و خاشاک زمانے" اکیسویں صدی کے بہترین ناولوں میں شمار ہوتا ہے۔ناول کا آغاز سکھوں اور مسلمانوں کی دوستی اور تعلق سے ہوتا ہے۔ذات پات اور برادری میں بٹے ہوئے ان افراد کے درمیان مذہب بھی دوسرا درجہ اختیار کر لیتا ہے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہیں چل پاتا اور انگریز سامراج کی سازش ان میں مذہبی چپقلش پیدا کر دیتا ہے۔اسی کے نتیجے میں تقسیم ہوئی اور لاتعداد انسان لقمہ اجل بن گئے۔مستنصر نے نہ صرف اس مذہبیت کے روگ پہ طنز کیا ہے بل کہ اس نفرت کے خاتمے کی راہ بھی تجویز کی۔

بخت جہان سے ناول کا آغاز ہوتا ہے اسی کردار کو ایک نئے روپ میں پیش کر کے ناول کو اکیسویں صدی تک کھینچا گیا۔ان کرداروں کے ذریعے سے تقسیم سے قبل اور بعد کے حالات کا تذکرہ ہے۔تقسیم کے بعد پاکستان میں مارشل لاء،پاک بھارت جنگ،تقسیم بنگال،ضیاءالحق کی مذہبیت،افغان جہاد،نائن الیون اور گم ہوتی ہوئی انسانیت کی تصویریں اس ناول کا حصہ ہیں۔ناول میں مارکسی فکر کے تحت کرداروں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو تاریخ کے معاشی جبر ہی کا عکاس ظاہر کیاہے ۔

محنت کش کی محنت یامحنت کی پیداوارسے بیگانگی اپنی تمام تر کریہہ صورتوں کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے۔بالخصوص روزگار کی تلاش میں گھر سے نکلنا،اینٹوں کے بھٹے میں کام کرنے والے اور سانسی لوگوں کی سماجی و نوعی بیگانگی اس کی واضح مثالیں ہیں جن سے طبقاتیت اور ذات پات کی بنیادیں پڑیں۔تارڑ نے سماجی بیگانگی کو موضوع بنایا اور اس کے پس پردہ اثرات کو بھی واضح کیا۔مذہبی بنیادوں پر ہونے والی تقسیم،مختلف خطوں کی آپسی چپقلش اور تہذیبوں کے ٹکراؤ کے ساتھ ساتھ ناول کے آخری حصے میں سامراجیت کے مذموم معاشی مقاصداور ایک نیا خواب دکھایا جس سے نئی دنیا کی بنیاد ڈالی جا سکے۔ایسی دنیا جہاں باہم الفت و محبت کے جذبے اور تعاون موجود ہو۔ناول کے اس حصے میں تارڑ اورمارکس ہم خیال ہو جاتے ہیں۔

طاہرہ اقبال کا ناول"نیلی بار "پاکستان کی تقریبا چھے دہائیوں کا وہ بھیانک چہرہ ہے جس سے پردہ ہٹانے کی جرات طاہرہ اقبال جیسا کوئی لکھاری ہی کر سکتا ہے۔ناول تقسیم کے فورا بعد سے لے کر اکیسویں صدی تک پھیلا ہواہے۔ناول میں بیان کردہ خطہ پنجاب ہے مگر یہی اس کا کینوس نہیں۔اس کا کینوس تو ہمارا پورا سماج اور ہر ہر خطہ ہے جہاں ایسی گھناونی تاریخ مرتب ہوئی۔ناول کا آغاز پنجاب کے ایک گاوں میں شادی سے ہوتا ہے اور اس بارات کے لٹنے کی داستان سے پاکستان کے عوام کے استحصال کی داستان جنم لیتی ہے۔

مرکزی کردار زارا اور پاکیزہ ہیں جن کے گرد کہانی گھومتی ہے۔ناول میں معاشی،سیاسی،سماجی استحصال،بے راہروی،کرپشن،جنسیت،گھٹن،قتل اور دہشت گردی،صنفی تقسیم،بیرونی قوتوں کی

عملداری،مارشل لاء،جہاد افغانستان اور اس کے اثرات،مذہبی قدامت پرستی جیسے ہر ہر مسلے کی طرف طاہرہ نے بھرپور توجہ اور بے باکانہ انداز سے پردہ کشائی کی ہے۔

ناول کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ طاہرہ نے برس ہا برس کے تجربے،مطالعے اور مشاہدے کو "نیلی بار "کے صفحات میں پرو دیا ہے۔پنجاب میں نیم جاگیرداری سماج،علمائے سو کے ہاتھوں ظلم،اسٹیبلشمنٹ اور سرمایہ داروں و سیاست دانوں کے ہاتھوں اس عوام کے رگیدے جانے اور ان کی خستہ حالی کاذکر کیا ہے۔شاید اسی لیے تارڑ نے انھیں احتیاط کا مشورہ بھی دیا ہے۔ناول جس استحصالی سماج کا عکاس ہے اس میں مارکسی بیگانگی نہ ہو ایسا ممکن نہیں۔

محنت کش کی محنت اورپیداوار سے بیگانگی کی مثالیں جاگیرداری سماج کے مزارعوں اور سیاسی ناکامی کی صورت میں ملتی ہیں۔سماجی و نوعی بیگانگی اس ناول کا مرکزی حصہ ہیں اور ان کے بغیر اس ناول کی کہانی مکمل نہیں ہوتی۔ہر ہر کردار اس سماج کی مجموعی بیگانگی اور بے حسی کو بیان کرتا ہے۔چوں کہ کسی بھی طبقاتی سماج میں بیگانگی کا در آنا لازمی ہے اس لیے جس طبقاتی سماج کی تصویر طاہرہ اقبال نے کھینچی ہے اس سےناول تہی دامن نہیں ہے۔

مجموعی لحاظ سے منتخب ناول ہمارے سماج کی بیگانگی اور افراد معاشرہ کی اپنی نوع کے ساتھ بسر ہونے والی جس زندگی کی تصویر کھینچتے ہیں اس کا ہو بہو اظہار ہمارے سماج کے رگ و پے میں سرائیت کر چکا ہے۔آج ہمارا سماج نیم جاگیرداری،مذہبی اور سرمایہ پرست ہاتھوں میں ایک گیند کی صورت میں نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ انسانیت کی رہنمائی کے ٹولز بھی اسی کے خلاف استعمال ہو رہے ہیں۔ہم بطور فرد اور قوم کے ایک ایسی بیگانگی کا شکار ہیں جس کے اثرات نے اس قوم اور وسیع معنوں میں انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے سماج کی بنیادیں ڈالی جائیں جہاں انسانیت انسانی ترقی کے لیے اور خالصتا فطری جذبات و احساسات کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔اس ذلت و پستی اور منافرت پر مبنی تقسیم کو ختم کریں۔وہ تمام بنیادیں جن سے سماج میں رکاوٹ ہے انھیں نئی بنیادوں سے یکسر تبدیل کیا جائے۔اس کے لیے مارکسی فلسفے کے تحت سوشلسٹ نظام سے ہوتے

ہوئے کمیونزم کی طرف پیش قدمی ہی ان تمام مسائل کا حل ہے اور یہی فکر مستقبل کے روشن ہونے کی ایک امید ہے۔

(ب) نتائج:

ا۔ مارکسی بیگانگی طبقات اور دولت کی غیر منصافانہ تقسیم سے جنم لیتی ہے۔جب محنت کش کو محنت کا برابر صلہ نہیں ملتا اور وہ معاشی پریشانیوں کا شکار ہوتا ہے تو بیگانگی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔مارکسی بیگانگی خارجیت سے داخلیت کی طرف سفر کرتی ہے جب کہ وجودی بیگانگی داخلیت سے جنم لیتی ہے۔مارکسی بیگانگی میں معیشت بنیاد ہے جب کہ وجودی بیگانگی میں فرد کی آزادی کو اہمیت حاصل ہے اور معیشت کا عمل دخل تصور نہیں کیا جاتا۔مارکسیت میں انفرادیت سماج کے تابع ہے جب کہ وجودیت انفرادیت کی نمائندہ ہے۔مارکسی بیگانگی کو معروضی اور عقلی جب کہ وجودی اسے داخلیت اور موضوعیت کی پیداوار سمجھتے۔

ب۔ منتخب اردو ناولوں میں محنت کش کی محنت اور محنت کی پیداوار سے بیگانگی کی وجوہات ذرائع پیداوار پر جاگیر داروں اور سرمایہ داروں کے قبضے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔انھیں جب محنت کا پورا حق نہیں ملتا تو ان کی محنت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیداوار سے دلچسپی ختم ہو جاتی ہے اور وہ محض ضرورت پوری کرنے کے لیے محنت کے عمل کو سر انجام دیتے ہیں۔نتیجے کے طور پر محنت کش محنت اور محنت کی پیداوار سے بیگانے مشینی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ج۔ جب افراد معاشرہ معاشی ناہمواری کا شکار ہوتے ہیں تو نتیجے کے طور وہ سماجی بیگانگی سے دوچار ہوتے ہیں۔یوں فرد سماج سے اور سماج فرد سے بیگانہو جاتاہے۔محنت کش محض زندہ رہنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے ۔سماج کی ترقی میں اس کا کردار محدود ہو کر ختم ہو جاتاہے۔سماجی بیگانگی اور مذکورہ پہلوؤں کا حتمی نتیجہ نوعی بیگانگی کی صورت میں نکلتا ہے۔اس صورت میں فرد فطری تقاضے و فرائضمنصبی سے روگردانی کی صورت میں اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے۔یوں افراد معاشرہ انسانی منصب سے اتر کر جانوروں کے منصب پہ ذاتی بقاء کے لیے جیتے ہیں۔

د۔ ان ناولوں کے مطالعے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ مارکسی نکتہ نظر سے جب افراد میں اس کیفیت کا اظہار ہوتا ہے تو وہ سماج میں،جرائم،بے راہ روی،خود غرضی،لالچ،حرص،دہشت گردی،جنسیت،منشیات،چوری،کرپشن وغیرہ جیسے غیر اخلاقی و غیر انسانی امور کا حصہ بن جاتا ہے۔

(ج) سفارشات:

ا۔ مارکسی نظریہ ہر دور کا نظریہ ہےاور پوری شد و مد سے اس کا اظہار ہو رہا ہے۔لہذا اردو کی دیگر افسانوی اصناف مثلا افسانے اور ڈرامے میں بھی بیگانگی کی کیفیات کا مارکسی بیگانگی کے تناظر میں مطالعہ ایک نئی بحث اور علم میں اضافے کا سبب ہو سکتا ہے۔

ب۔ مغربی ادب میں بھی بیگانگی کی کیفات کا اظہار موجود ہے اور اردو ادب بھی اس سے تہی دامن نہیں۔اس اعتبار سے ان دونوں زبانوں کے ایسے ادب کا آپسی تقابل کر کے پرکھا جا سکتا ہے کہ بیگانگی کی جن شکلوں کا اظہار ہوا ہے ان کی وجوہات اور اثرات کس حد تک ملتے جلتے ہیں۔

ج۔ مذکورہ ناولوں میں جہاں مارکسی فکر موجود ہے وہیں سیاسی،ثقافتی پہلو بھی بکھرے پڑے ہیں جن کا مطالعہ کارگر ہو سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی ماخذ:

تارڑ،مستنصر حسین،خس و خاشاک زمانے،سنگ میل پبلی کیشنز ،لاہور،۲۰۱۷ء

شیراز زیدی، جہنمی لوگ،فکشن ہاؤس لاہور،۲۰۰۲ء

طاہرہ اقبال،نیلی بار،دوست پبلی کیشنز ،اسلام آباد،۲۰۱۷ء

گدی ،الیاس احمد،فائر ایریا،معیار پبلی کیشنز،نئی دہلی،۱۹۹۴ء

ثانوی ماخذ:

ابو فراز،(مترجم) مارکسی فلسفہ اور جدید سائنس از ایلن ووڈز/ٹیڈ گرانٹ، فکشن ہؤس، لاہور، ۲۰۱۸ء

احمد صغیر،ڈاکٹر،اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ءکے بعد،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۵ء

اختر حسین رائے پوری،ادب اور زندگی،انجمن ترقی اردو،اورنگ آباد دکن،۱۹۳۵ء

اسلم آزاد،ڈاکٹر،اردو ناول آزادی کے بعد،سیمانت پرکاش،دہلی،۱۹۹۰ء

اصغر علی،انجینئر،مارکسی جمالیات،نصرت پبلشرز،لکھنو،۱۹۸۴ء

جمیل اختر مجبی،ڈاکٹر،فلسفۂ وجودیت اور جدید اردو افسانہ،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس،دہلی،۲۰۰۲ء

سبط حسن،موسی سے مارکس تک،مکتبہ دانیال،کراچی،۲۰۱۸ء

سجاد ظہیر،لندن کی ایک رات، آزاد کتاب گھر کلاں محل،دہلی،۱۹۵۶ء

سلیم اختر،ڈاکٹر،مغرب میں نفسیاتی تنقید،سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،۲۰۰۸ء

صفدر میر،مارکسی بیگانگی،مکتبہ دانیال،کراچی،۱۹۸۵ء

ظہور الدین،پروفیسر،جدید ادبی و تنقیدی نظریات،ادارہ فکر جدید،نئی دہلی،۲۰۰۵ء

عبداللہ حسین،نادار لوگ،سنگ میل پبلیکیشنز،لاہور،۱۹۹۷ء

غفور شاہ قاسم،ڈاکٹر،مستنصر حسین تارڑ:شخصیت اور فن،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۲۰۱۸ء

قاضی جاوید،(مترجم)وجودیت اور انسان دوستی از ژاں پال سارتر، مشعل بکس،لاہور،س ن

قمر رئیس،ڈاکٹر، تلاش وتوازن،ادراہ خرام پبلی کیشنز،دہلی،۱۹۶۸ء

قمر رئیس، پروفیسر، سید عاشور کاظمی، (مرتبہ) ترقی پسند ادب کا پچاس سالہ سفر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی، ۱۹۹۴ء
کارل مارکس / فریڈرک اینگلز، کیمونسٹ مینی فیسٹو، فکشن ہاوس، لاہو، ۲۰۱۸ء
کرشن چندر، طوفان کی کلیاں، مکتبہ شاہرہ، دہلی، ۱۹۵۶ء
کرن ریاض چودھری، طاہرہ اقبال کا ناول "نیلی بار " تفہیم و تجزیہ، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۸ء
مجنوں گورکھپوری، ادب اور زندگی، ایوان اشاعت، گورکھپور، س ن
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے ہمہ گیر سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء
م۔م۔جوہر میرٹھی، (مترجم) سرمایہ، از کارل مارکس، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۶ء
مشتاق علی شان، (مترجم) بالشویک پوائنٹ آف ویو از عاصم اخوند، فکشن ہاوس، لاہور، ۲۰۱۴ء
منشی پریم چند، گئودان، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۲ء
منصور خوشتر، ڈاکٹر، (مرتبہ) اردو ناول کی پیش رفت، بک ٹاک لاہور، ۲۰۱۹ء
وہاب اشرفی، پروفیسر، مارکسی فلسفہ اشتراکیت اور اردو ادب، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۰ء

انگریزی کتابیات:

Karl Marx, Economic and Philosophic Manuscripts of 1844, Progress Publishers, Moscow,1977

رسائل و جرائد:

امتزاج، سہ ماہی جامعہ کراچی، ۲۰۱۹ء
جہان تحقیق، سہ ماہی، آن لائن، ۲۰۲۱ء
الحمد، ششماہی، الحمد اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء
ادبیات، (شمارہ خاص) اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد ۲۰۲۰ء
اقدار، سہ ماہی، دہلی، ۲۰۰۱
انجمن ترقی اردو، سہ ماہی، کراچی ۲۰۲۰ء

مقالا جات(غیر مطبوعہ)

رفعت رفیق،عالمگیریت اور اردو ناول،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، مملوکہ،اورنٹیل کالج پنجاب یونیورسٹی،لاہور،۲۰۲۰ء

ساجدہ سلطانہ،طاہرہ اقبال کے ناول"نیلی بار"کا فکری و فنی جائزہ،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے ایم۔فل اردو، مملوکہ،نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگو ئجز،اسلام آباد،۲۰۱۹ء

شاہین مفتی،جدید اردو نظم میں وجودیت،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، مملوکہ،بہاو الدین ذکریا یونی ورسٹی،ملتان،س ن

عدنان احمد،اردو ناول پر ادبی تحریکوں کے اثرات،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی،فیصل آباد،۲۰۱۶ء

محمد ثقلین،اردو ناول میں سیاسی مباحث،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، مملوکہ،جی سی یونیورسٹی،لاہور،س ن

مشتاق احمد امتیاز، پاکستانی اردو ناول میں پسماندہ طبقے کے مسائل،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے ایم۔فل اردو، نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز،اسلام آباد،۲۰۱۹ء

مظہر عباس،اردو ناول پر جدیدیت کے فکری و فنی اثرات،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، مملوکہ دی اسلامی یونیورسٹی،بہاولپور،س ن

محمد کامران شہزاد،پاکستانی اردو ناول میں مزاحمتی رجحانات،غیر مطبوعہ،مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی اردو، مملوکہ،گورنمنٹ یونی ورسٹی فیصل آباد،فیصل آباد،۲۰۱۹ء

ویب گاہیں:

- https://hisaabat.wordpress.com/2015/11/23/%D9%81%D8%B1%D8%AF-%DA%A9%DB%8C-%D8%A7%D9%86%D9%81%D8%B1%D8%A7%D8%AF%DB%8C-%D8%A7%D8%B5%D9%84%D8%A7%D8%AD/
- https://dunya.com.pk/index.php/author/zafar-iqbal/2017-04-27/19339/63301872
- https://www.marxist.pk/karl-marx-s-theory-of-alienation/

- http://www.urdulinks.com/urj/?p=231
- https://jaeza.pk/tanqeed/neeli_baar_tahira_bilal/
- http://nyazamana.com/2016/11/theory-of-alienation/